"ALIGARH TAHREEK: AMAL AUR RADD-E-AMAL URDU ADAB KE HAWALEY SE"

ABSTRACT

OF THE THESIS SUBMITTED FOR THE AWARD OF THE DEGREE OF

Doctor of Philosophy

IN

URDU

By

FATIMA AZMAT

UNDER THE SUPERVISION OF

DR. SHAHABUDDIN (SAQIB)

DEPARTMENT OF URDU
ALIGARH MUSLIM UNIVERSITY
ALIGARH - 202002 (INDIA)

2011

تلخیص مقالہ

(Abstract of the Thesis)

علی گڑھ تحریک: عمل اور ردّ عمل

اردو ادب کے حوالے سے

پیش کردہ

فاطمہ عظمت

نگراں

ڈاکٹر شہاب الدین (ثاقبؔ)

شعبۂ اردو

علی گڑھ مسلم یونیورسٹی، علی گڑھ (انڈیا)

۲۰۱۱ء

تلخیص

تلخیص

علی گڑھ تحریک ہندوستانی مسلمانوں کی نشاۃ ثانیہ کی تحریک تھی جس نے ہماری قومی زندگی کے تقریباً تمام شعبوں پر دوررَس اثرات مرتب کیے۔ اس تحریک کی بدولت مسلمانوں میں خوداعتمادی پیدا ہوئی، قومیت کا تصور عام ہوا، سیاسی شعور کو جلا حاصل ہوئی، عقلیت کے رجحان کو فروغ ملا، حاکم وقت سے مصالحت اور مفاہمت کا ہنر پیدا ہوا، زمانے کے مطالبات اور وقت کے تقاضوں کو سمجھنے کا شعور عام ہوا، معاشرتی اصلاح پر توجہ صرف ہوئی، سائنسی رجحان کو فروغ ملا اور جدید طرز کی تعلیم کی داغ بیل ڈالی گئی۔ نئے علم کلام کی ضرورت محسوس کی گئی، روشن خیالی پیدا ہوئی، مذہب کی نئی تفسیر و تعبیر پیش کی گئی اور اجتہاد فکر سے کام لیا گیا۔ شعر و ادب میں افادیت اور مقصدیت کا تصور عام ہوا اور اس سے معاشرتی اصلاح کا کام بھی لیا گیا۔ گویا مسلمانوں کی زندگی کا کوئی بھی شعبہ علی گڑھ تحریک کے اثرات سے بے نیاز نہ رہ سکا۔ سرسید احمد خاں اس تحریک کے پیشوا تھے جنھوں نے اپنی تمام زندگی قوم کی فلاح و بہبود اور اصلاح کی کوششوں میں صرف کردی۔ سرسید نے اپنے رفقا کی بھی ایک ایسی جماعت تیار کردی جس نے ان کے مشن کو آگے بڑھایا۔ علی گڑھ تحریک کو اس کے زمانۂ آغاز سے ہی مثبت اور منفی دونوں زاویوں سے دیکھا گیا۔ سرسید کے بعض رفقا نے بھی ان کے تمام نظریات سے مکمل طور پر اتفاق نہیں کیا لیکن اپنی اپنی دانست اور شعور کے لحاظ سے علی گڑھ تحریک میں وہ عملی طور پر سرسید کے معاون رہے۔ دوسری طرف سرسید اور علی گڑھ تحریک کے مخالفین میں قابلِ لحاظ تعداد ایسے اشخاص کی بھی ہے جنھوں نے اس تحریک کے ہر پہلو کو منفی زاویۂ نظر سے دیکھا اور

اس تحریک کی مخالفت میں اپنا سارا زور صرف کر دیا۔ علی بخش خاں شرر، مولوی امداد العلی، جمال الدین افغانی وغیرہ کا نام ایسے ہی اصحاب کی فہرست میں شامل ہے۔

علی گڑھ تحریک کی موافقت اور مخالفت کا سلسلہ آج بھی جاری ہے اسی لیے اردو کے مشہور فکشن نگار انتظار حسین کے بقول: ''سر سید احمد خاں کے سلسلے میں ہم ابھی تک دو انتہاؤں پر کھڑے ہیں، حالاں کہ قاعدے سے اب تک ہمیں راہِ اعتدال پر آ جانا چاہیے تھا۔''

اس لحاظ سے اب یہ ضروری تھا کہ علی گڑھ تحریک کے اثرات اور اس کے خلاف رونما ہونے والے ردِ عمل کے نتیجے میں جو مثبت یا منفی اثرات مرتب ہوئے ان کا معروضی انداز میں شرح و بسط کے ساتھ جائزہ لیا جائے تا کہ اس تحریک کی معنویت اور قدر و قیمت کا صحیح تعین ہو سکے، لیکن موضوع کی وسعت اور پھیلاؤ کو دیکھتے ہوئے ہم نے اپنا مطالعہ صرف شعر و ادب کی حد تک محدود رکھا ہے۔ ''علی گڑھ تحریک: عمل اور ردِّ عمل (اردو ادب کے حوالے سے)'' کے موضوع پر لکھا گیا یہ مقالہ چھ ابواب پر مشتمل ہے۔

باب اوّل: علی گڑھ تحریک کے سیاسی و سماجی پس منظر سے متعلق ہے جس میں یہ بتانے کی کوشش کی گئی ہے کہ علی گڑھ تحریک کے آغاز اور اس سے قبل کے زمانے میں ہندوستان کے سیاسی حالات کیسے تھے اور ہندوستانی معاشرہ کن آزمائشوں سے دوچار تھا۔

باب دوم میں علی گڑھ تحریک کی فکری اساس پر روشنی ڈالنے کی کوشش کی گئی ہے۔ اس سلسلے میں عقلیت، مادّیت، اجتماعیت اور سیاست کے ذیلی عنوانات کے تحت موضوع کا احاطہ کرنے کی سعی کی گئی ہے۔

باب سوم: علی گڑھ تحریک اور سر سید کی خدمات سے متعلق ہے۔ اسے بھی چار ذیلی عنوانات میں اس طرح تقسیم کیا گیا ہے: (الف) سائنٹفک سوسائٹی اور علی گڑھ انسٹی ٹیوٹ گزٹ (ب) رسالہ تہذیب الاخلاق (ج) ایم۔ اے۔ او کالج کا قیام اور جدید تعلیم کا تصور (د) مسلم ایجوکیشنل کانفرنس اور تعلیمی تحریک۔

باب چہارم میں اردو شعر و ادب پر علی گڑھ تحریک کے اثرات کا جائزہ لیا گیا ہے۔ کوشش یہ کی گئی ہے کہ سرسید کے نامور رفقا سے لے کر بعد کے زمانوں تک اردو شعر و ادب پر جو اثرات اس تحریک کے ذریعہ مرتب ہوئے ان سب کا ذکر کر دیا جائے۔

باب پنجم: ''علی گڑھ تحریک کا ردّعمل'' کے عنوان سے ہے جس میں اردو شعر و ادب پر مرتب ہونے والے ان اثرات کا جائزہ شامل ہے جو علی گڑھ تحریک کے افادی اور مقصدی ادب کے خلاف ردّعمل کے نتیجے میں سامنے آئے اور جن کی بدولت اردو شعر و ادب کو ایک نئے انداز سے وسعت حاصل ہوئی۔

باب ششم: ''حاصلِ کلام'' کے عنوان سے ہے جس میں علی گڑھ تحریک کے زیر اثر اردو شعر و ادب میں ہونے والی تبدیلیوں کا جائزہ شامل ہے اور اس تحریک کے خلاف ردّعمل کے نتیجے میں اردو شعر و ادب پر جو اثرات مرتب ہوئے ان کا بھی تذکرہ کرتے ہوئے ادب کے حوالے سے علی گڑھ تحریک کی مجموعی خدمات پر روشنی ڈالنے کی کوشش کی گئی ہے۔

اس موضوع کے ساتھ پوری طرح انصاف کرنے کا دعویٰ تو میں نہیں کر سکتی لیکن حتی الامکان کوشش ضرور کی ہے کہ کوئی قابلِ ذکر بات بیان ہونے سے رہ نہ جائے۔ میں اپنی اس کوشش میں کس حد تک کامیاب ہو سکی ہوں اس کا فیصلہ صاحبانِ علم و فضل ہی فرمائیں گے۔

مندرجات

- **مقدمہ** 5
- **باب اوّل:**
  علی گڑھ تحریک کا سیاسی و سماجی پس منظر 10
- **باب دوم:**
  علی گڑھ تحریک کی فکری اساس 43

○ **باب سوم:**

علی گڑھ تحریک اور سرسید کی خدمات 112

○ **باب چہارم:**

اردو شعر و ادب پر علی گڑھ تحریک کے اثرات 186

○ **باب پنجم:**

علی گڑھ تحریک کا ردّ عمل 247

○ **باب ششم**

حاصلِ مطالعہ 285

○ **مآخذ و مصادر:** 297

کتابیات

آثار الصنادید	سید احمد خاں	نامی پریس، کان پور	۱۹۰۴ء
آئین اکبری	تصحیح سید احمد خاں		۱۸۵۶ء
احکام طعام اہل کتاب	سید احمد خاں	علی گڑھ	
ادھوری جدیدیت	سلیم احمد	ایجوکیشنل پریس، کراچی	۱۹۷۷ء
اردو ادب کی تحریکیں	انور سدید	انجمن ترقی اردو پاکستان، کراچی	۲۰۰۳ء
اردو ادب کے ارتقا میں ادبی تحریکوں اور رجحانوں کا حصہ	منظر اعظمی	اتر پردیش اردو اکادمی، لکھنؤ	
اردو شاعری کا سیاسی اور تاریخی پس منظر	ابوالخیر کشفی	حسن آفسیٹ پریس، کراچی	۱۹۵۷ء
اردو کی ترقی میں سرسید اور ان کے رفقا کا حصہ	ڈاکٹر کوثر نیازی	کراچی یونیورسٹی	۱۹۸۴ء

اردو میں رومانوی تحریک	محمد حسن		
اردو نثر میں ادب لطیف	ڈاکٹر عبدالودود خاں		
ارمغان آزاد	مرتبہ: ابوسلمان شاہجہاں پوری	انجمن پریس، کراچی	۱۹۷۸ء
اسباب بغاوت ہند	سید احمد خاں	مرادآباد	۱۸۵۸ء
اسباب بغاوت ہند	سید احمد خاں/ مرتبہ: فوق کریمی	انجمن ترقی اردو ہند	۱۹۷۱ء
الخطبات الاحمدیہ	سید احمد خاں	مطبع فیض عام، علی گڑھ	۱۸۷۰ء
الدعا والاستجاب	سر سید احمد خاں	فضل الدین تاجر کتب، لاہور	۱۸۹۹ء
امداد الاحتساب	مولوی امداد العلی	مطبع بہاری لعل، بلند شہر	
امداد الآفاق	مولوی امداد العلی	نظامی پریس، کان پور	۱۲۹۰ھ
انتخاب الاخوین			
انتخاب مضامین علی گڑھ انسٹی ٹیوٹ گزٹ	مرتبہ: اصغر عباس	یوپی اردو اکادمی، لکھنؤ	۱۹۸۲ء
انجمن ترقی اردو (ہند) کی علمی اور ادبی خدمات	ڈاکٹر شہاب الدین ثاقب	لیتھو کلر پرنٹرس، علی گڑھ	۱۹۹۰ء
برعظیم پاک و ہند کی ملت اسلامیہ	اشتیاق حسین قریشی	ٹائمس پریس، کراچی	۱۹۶۷ء
برکات الدعا	غلام احمد قادیانی	ریاض ہند پریس، قادیان	
بیان القرآن	مولانا اشرف علی تھانوی		
تاریخ سرکشی بجنور		آگرہ	۱۸۵۸ء
تاریخ ضلع بجنور	سید احمد خاں		
تبیین الکلام فی التفسیر التورۃ والانجیل	سید احمد خاں	پرائیویٹ پریس، علی گڑھ	۱۹۹۵ء
تبیین الکلام فی تفسیر التوراۃ والانجیل علی ملت الاسلام			
تحریر فی اصول التفسیر	سید احمد خاں	خدا بخش لائبریری، پٹنہ	۱۹۹۵ء
تحریر فی اصول التفسیر	سید احمد خاں	مطبع مفید عام، آگرہ	۱۸۹۲ء
تحریک آزادی	صلاح الدین ناسک	علمی پرنٹنگ پریس، لاہور	۱۹۷۵ء
تحریک ریشمی رومال	مولانا حسین احمد مدنی		

تحریک علی گڑھ اور حیدر آباد	محمد حسام الدین خاں غوری	شیخ علی اینڈ سنز، کراچی	۱۹۷۹ء
تحفہ حسن			۱۸۴۴ء
تذکرہ وقار	محمد امین زبیری	مطبوعہ عزیزی پریس، آگرہ	۱۹۳۸ء
تسہیل فی جر الثقیل		آگرہ	۱۸۴۴ء
تصفیۃ العقائد	مولانا قاسم نانوتوی	پریس دہلی	
تنقیح البیان	سید نصرت علی	المطابع، دہلی	۱۸۹۷ء
تہذیب الاخلاق کا تحقیقی وتنقیدی مطالعہ	نفیس بانو	ایجوکیشنل بک ہاؤس، علی گڑھ	۱۹۹۳ء
تہذیب الاخلاق	سید احمد خاں/مرتبہ: فضل الدین	نول کشور پریس، لاہور	ب۔ت
جامِ جم	سید احمد خاں		۱۸۴۰ء
جلاء القلوب بذکر المحبوب			۱۸۴۲ء
حالات سرسید	پیارے لال شاکر	کاشانۂ ادب، لکھنؤ	۱۹۳۸ء
حالی فن اور شخصیت		ہریانہ ساہتیہ اکادمی	۱۸۸۶ء
حالی کا ذہنی ارتقا	غلام مصطفیٰ خاں ڈاکٹر	مکتبہ کارواں، لاہور	۱۹۶۶ء
حالی کا سیاسی شعور	معین احسن جذبی	اشرف پریس، کراچی	۱۹۶۳ء
حجۃ اللہ البالغہ	مترجمہ: مولانا عبدالرحیم	اتحاد پریس قومی کتب خانہ، لاہور	۱۹۵۳ء
حیات جاوید پر ایک نظر	محمد عبداللہ سید		۱۹۶۶ء
حیات جاوید	الطاف حسین حالی	انجمن ترقی اردو، دہلی	۱۹۳۹ء
حیات سرسید	نورالرحمٰن	انجمن ترقی اردو، علی گڑھ	
حیات سعدی	الطاف حسین حالی	مجلس ترقی ادب، لاہور	۱۹۶۰ء
حیات مابعد	سید ضامن حسین نقوی	اکیڈمی آف ایجوکیشنل ریسرچ آل پاکستان ایجوکیشنل کانفرنس، کراچی	۱۹۵۸ء
خطوطِ سرسید	مرتبہ: راس مسعود	نظامی پریس، بدایوں	۱۹۲۴ء
دین فطرت	محمد مظہر الدین صدیقی محمد		

راہِ سنت ورد بدعت	سید احمد خاں		۱۸۵۰ء
ردنیچریہ	ناصر الدین محمد	مطبع تائید الاسلام، دکن	۱۸۸۱ء
رسالہ حامی اسلام	محمد عبدالغفار	مطبع انوار محمدی، لکھنؤ	۱۳۰۷ھ
رسالہ خیر خواہ مسلمانان	سید احمد خان	خدا بخش لائبریری، پٹنہ	۱۹۹۸ء
سائنس اور اسلام	قاری محمد طیب مولانا		
سرسید احمد خاں اور ان کے نامور رفقا کی نثر کا فکری وفنی جائزہ	سید عبداللہ	چمن بک ڈپو، دہلی	ب۔ت
سرسید احمد خاں	خلیق احمد نظامی/مترجمہ: اصغر عباس	پبلی کیشنز ڈویژن، دہلی	۱۹۷۱ء
سرسید احمد خاں	راجہ طارق محمود	اسلم پریس، لاہور	۱۹۸۸ء
سرسید احمد خاں	زاہد چودھری	ادارہ مطالعۂ تاریخ، لاہور	۱۹۹۹ء
سرسید اور اردو زبان وادب	قمر الہدیٰ فریدی	لیتھو آفسیٹ پرنٹرز، علی گڑھ	۱۹۸۹ء
سرسید اور اصلاح معاشرہ	شاہد حسین رزاقی	دین محمدی پریس، لاہور	۱۹۶۳ء
سرسید اور حالی کا نظریۂ فطرت	ڈاکٹر ظفر حسن	مکتبہ جدید پریس، لاہور	۲۰۰۳ء
سرسید اور سائنٹفک سوسائٹی ایک بازیافت	افتخار عالم خاں	مکتبہ جامعہ، نئی دہلی	۲۰۰۰ء
سرسید اور ہندوستانی مسلمان	نور الحسن نقوی	ایجوکیشنل بک ہاؤس، علی گڑھ	۱۹۷۹ء
سرسید تحریک کا ردّعمل	صدیقہ ارمان	سرسید یونیورسٹی پریس، کراچی	۱۹۹۹ء
سرسید سے اقبال تک	قاضی جاوید	نگارشات، لاہور	۱۹۸۶ء
سرسید سے اقبال تک	قاضی جاوید	لاہور نگارشات	۱۹۸۶ء
سرسید کا اسلام	از مولوی مشتاق حسین	نامی پریس، دہلی	
سرسید کا اسلام	مولوی مشتاق حسین	نامی پریس، دہلی	
سرسید کا اصلاحی مشن	ڈاکٹر توقیر عالم فلاحی	اردو پرنٹنگ پریس، دہلی	۱۹۹۸ء
سرسید کا آئینہ خانۂ افکار	سید ابوالخیر کشفی	فضلی سنز، کراچی	۱۹۸۹ء
سرسید کا دینی شعور	توقیر عالم فلاحی	علی گڑھ، مصنف	۲۰۰۵ء

سرسید کا علمی کارنامہ	قاضی احمد میاں اختر جوناگڑھی	ایجوکیشنل پریس، کراچی	۱۹۶۴ء
سرسید کا مغربی تعلیم کا تصور اور اس کا نفاذ علی گڑھ میں	رشید احمد صدیقی	مکتبہ دانیال، کراچی	۱۹۹۳ء
سرسید کی ادبی خدمات اور ہندوستانی نشاۃ ثانیہ	قدسیہ خاتون	کتابستان، الٰہ آباد	۱۹۸۱ء
سرسید کی اسلامی بصیرت	جمال خواجہ	نیو علی گڑھ مومنٹ، علی گڑھ	۱۹۸۷ء
سرسید کی تعلیمی تحریک	اختر الواسع	مکتبہ جامعہ، نئی دہلی	۱۹۸۵ء
سرسید کی دینی برکتیں	عبدالحلیم شرر/ حافظ حسین رضوی	سرسید یونیورسٹی، کراچی	۱۹۹۹ء
سرسید کی صحافت	اصغر عباس	انجمن ترقی اردو، دہلی	۱۹۷۵ء
سرسید کے خطوط	مرتبہ: سلیم الدین	حالی پریس، پانی پت	۱۸۶۹ء
سرسید احمد خاں حالات وافکار	مولوی عبدالحق	اردو مرکز، دہلی	۱۹۶۰ء
سرسید احمد خاں: فکر اسلامی کی تعبیر نو	ڈاکٹر سی۔ ڈبلیو، ٹرول/ مترجمہ: قاضی افضال حسین	اے۔این۔اے پرنٹرز، لاہور	۱۹۹۸ء
سرسید تاریخی وسیاسی آئینے میں	شان محمد	انوار بک ڈپو، علی گڑھ	۱۹۶۷ء
سرسید، معاشی افکار اور ترقیاتی منصوبے	شاہ محمد وسیم	علی گڑھ	۲۰۰۱ء
سرکشی ضلع بجنور	سرسید احمد خاں	ندوۃ المصنفین، دہلی	۱۹۹۴ء
سلسلۃ الملوک	سید احمد خاں	دہلی	۱۸۵۲ء
سلسلۃ الملوک	سید احمد خاں	مطبع خادم التعلیم پنجاب، لاہور	۱۸۹۹ء
سید احمد خاں اور ان کی معنویت موجودہ دور میں	عبداللطیف اعظمی	علمی ادارہ، نئی دہلی	۱۹۷۲ء
سید احمد خاں کا سفرنامہ پنجاب	اسماعیل پانی پتی	ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس، دہلی	۱۹۷۹ء
سیرت فریدیہ	سید احمد خاں/ محمود برکاتی	سندھ ساگر اکاڈمی، لاہور	۱۹۶۴ء
سیرت فریدیہ	سید احمد خاں	آگرہ مفید عام پریس	۱۸۹۲ء
سیرۃ فریدیہ	سید احمد خاں	مطبع مفید عام، آگرہ	۱۸۹۶ء

شبلی ادیبوں کی نظر میں	واصل عثمانی	باب الاسلام پریس، کراچی	۱۹۶۸ء
شبلی کا ذہنی ارتقا	ڈاکٹر سید سخی حسن ہاشمی	المخزن پرنٹرز، کراچی	
شہاب ثاقب	علی بخش شرر	نول کشور پریس، لکھنؤ	۱۲۸۹ھ
علی گڑھ تحریک سماجی اور سیاسی مطالعہ	مظہر حسین	ثمر آفسیٹ پرنٹرز، نئی دہلی	۲۰۰۲ء
علی گڑھ کی علمی خدمات	پروفیسر خلیق احمد نظامی	ثمر آفسیٹ پرنٹرز، نئی دہلی	۱۹۹۴ء
فوائد الافکار فی اعمال الفرجاء (ترجمہ)		دہلی	۱۸۴۶ء
قصہ اصحاب الکہف والرقیم	سر سید احمد خاں	مطبع ریاض ہند، علی گڑھ	۱۹۱۰ء
قواعد صرف ونحو زبان اردو سر سید احمد خاں	مرتبہ: ابوسلمان شاہجہاں پوری	ادارۂ تصنیف وتحقیق، کراچی	۱۹۹۰ء
قول متین در ابطال حرکت زمین	سید احمد خاں		۱۸۴۹ء
کلمۃ الحق در بیان حقیقت پیری ومریدی			۱۸۴۹ء
کلیات نثر حالی مرتبہ شیخ	محمد اسماعیل پانی پتی	مجلس ترقی ادب، لاہور	۱۹۶۸ء
جلد اوّل (مذہبی، اصلاحی، تاریخی، سوانحی اور متفرق مضامین)			
جلد دوم (تقریریں اور تقریظیں)			
کیمیائے سعادت (ترجمہ)			
گزارش در باب تعلیم اہل ہند			
محمڈن اینگلو اورینٹل ایجوکیشنل کانفرنس۔			
مجموعہ رزولیوشن ہائے وہ سال من			
ابتدائے ۱۸۸۶ء لغایت ۱۸۹۵ء	سید احمد خاں	مطبع مفید عام، آگرہ	۱۸۹۶ء
مسدس حالی	الطاف حسین حالی	باب الاسلام پریس، کراچی	۱۹۵۷ء
مسلمانوں کا روشن مستقبل	طفیل احمد منگلوری		
مضامین تہذیب الاخلاق	سید احمد خان	فضل الدین تاجر کتب، لاہور	ب۔ت
مقالات حالی	الطاف حسین حالی	انجمن ترقی اردو، کراچی	۱۹۵۷ء
مقالات سر سید	مرتبہ: شیخ محمد اسماعیل پانی پتی	مجلس ترقی ادب، لاہور	۱۹۶۲ء

حصہ اوّل (مذہبی اور اسلامی مضامین)/ حصہ دوم (تفسیری مضامین)/ حصہ سوم (فلسفیانہ مضامین)/ حصہ چہارم (علمی وتحقیقی مضامین)/ حصہ پنجم (اخلاقی واصلاحی مضامین)/ حصہ ششم (تاریخی مضامین) حصہ ہفتم (سوانح وسیر، ادبی وتنقیدی مضامین)/ حصہ ہشتم (تعلیمی، تربیتی اور معاشرتی مضامین)/ حصہ نہم (ملکی وسیاسی مضامین)/ حصہ دہم (اخبارات پر تنقیدی مضامین متعلق تہذیب الاخلاق، مدرسۃ العلوم مسلمان)/ حصہ یازدہم (آں حضرت ﷺ کی سیرت طیبہ کے متعلق اور تحقیقی اور تنقیدی مقالات: الخطبات احمدیہ)/ حصہ دوازدہم (تقریری مقالات)/ حصہ سیزدہم (سرسید کے ذاتی عقائد، متعلق بہ استفسارات، ترکوں کے متعلق اور مضامین متعلق واقعات حاضرہ)/ حصہ چہاردہم (مشتمل بہ قرآنی قصص)/ حصہ پانزدہم (متفرق مضامین)/ حصہ شانزدہم (نایاب رسال ومضامین)

مقدمہ شعروشاعری	الطاف حسین حالی	ایجوکیشنل بک ہاؤس، علی گڑھ	۱۹۷۳ء
مکاتیب سرسید احمد خاں	مرتبہ مشتاق حسین	علی گڑھ	۱۹۶۰ء
مکتوبات سرسید	مرتبہ: شیخ محمد اسماعیل پانی پتی	مجلس ترقی ادب، لاہور	۱۹۵۹ء
مکمل مجموعہ لکچرز واسپیچیز از ابتدائے ۱۸۶۳ء لغایت ۱۹۸۹ء	سید احمد خاں/محمد امام الدین	مصطفائی پریس، لاہور	۱۹۰۰ء
منتخب مضامین سرسید	عتیق احمد صدیقی	سرسید اکادمی، علی گڑھ	۱۹۸۸ء
مولانا آزاد سرسید اور علی گڑھ	محمد ضیاء الدین انصاری	انجمن ترقی اردو ہند، دہلی	۱۹۹۲ء
نمیقہ فی بیان مسئلہ تصور الشیخ (فارسی)			۱۸۵۲ء
یادگار شبلی	شیخ محمد اکرام	دین محمدی پریس، لاہور	۱۹۷۱ء

○○○

رسائل وجرائد:

اردو نامہ	کراچی	اکتوبر و دسمبر ۱۹۶۲ء
ثقافت	لاہور	اگست ۱۹۵۹ء
علی گڑھ میگزین	علی گڑھ نمبر	۱۹۵۳
نگار	کراچی	سرسید نمبر، جنوری فروری ۱۹۷۱ء

●●●

"ALIGARH TAHREEK: AMAL AUR RADD-E-AMAL URDU ADAB KE HAWALEY SE"

THESIS

SUBMITTED FOR THE AWARD OF THE DEGREE OF

Doctor of Philosophy

IN

URDU

By

FATIMA AZMAT

UNDER THE SUPERVISION OF

DR. SHAHABUDDIN (SAQIB)

DEPARTMENT OF URDU
ALIGARH MUSLIM UNIVERSITY
ALIGARH - 202002 (INDIA)

2011

علی گڑھ تحریک: عمل اور ردّ عمل

اردو ادب کے حوالے سے

مقالہ برائے

پی ایچ۔ڈی (اردو)

پیش کردہ

فاطمہ عظمت

نگراں

ڈاکٹر شہاب الدین (ثاقبؔ)

شعبۂ اردو

علی گڑھ مسلم یونیورسٹی، علی گڑھ (انڈیا)

۲۰۱۱ء

T-8552

T8552

بسم الله الرحمن الرحيم

Centre of Advanced Study
Department of Urdu
Aligarh Muslim University
Aligarh - 202002
E-mail: deptt.urdu@gmail.com

سینٹر آف ایڈوانسڈ اسٹڈی
شعبہ اردو

Dated : 04.11.2011

Certificate

This is to certify that the thesis entitled : **"Aligarh Tahreek: Amal Aur Radd-e-Amal- Urdu Adab Ke Hawaley Se"**, submitted to Aligarh Muslim University, Aligarh in partial fulfillment of the requirements for the award of the degree of Doctor of Philosophy in Urdu is a record of original research work done by **(Mrs.) Fatima Azmat**, under my supervision and guidance and the thesis has not formed the basis for the award of any Degree/Diploma/Associate ship/Fellowship or other similar title to any candidate of any University.

04.11.2011
(Dr. Shahabuddin)
Supervisor

Countersigned by:

4/11/11

(Prof. Mohammad Zahid)
Chairman
Deptt. Of Urdu,
A.M.U. Aligarh.

مندرجات

- **مقدمہ** 5
- **باب اوّل:**
  علی گڑھ تحریک کا سیاسی وسماجی پس منظر 9
- **باب دوم:**
  علی گڑھ تحریک کی فکری اساس 42
- **باب سوم:**
  علی گڑھ تحریک اور سرسید کی خدمات 111
- **باب چہارم:**
  اردو شعر وادب پر علی گڑھ تحریک کے اثرات 185
- **باب پنجم:**
  علی گڑھ تحریک کا ردّ عمل 246
- **باب ششم**
  حاصلِ مطالعہ 284
- **مآخذ ومصادر:** 296

●●●

مقدمہ

علی گڑھ تحریک ہندوستانی مسلمانوں کی نشاۃ ثانیہ کی تحریک تھی جس نے ہماری قومی زندگی کے تقریباً تمام شعبوں پر دوررَس اثرات مرتب کیے۔ اس تحریک کی بدولت مسلمانوں میں خوداعتمادی پیدا ہوئی، قومیت کا تصور عام ہوا، سیاسی شعور کو جلا حاصل ہوئی، عقلیت کے رجحان کو فروغ ملا، حاکم وقت سے مصالحت اور مفاہمت کا ہنر پیدا ہوا، زمانے کے مطالبات اور وقت کے تقاضوں کو سمجھنے کا شعور عام ہوا، معاشرتی اصلاح پر توجہ صرف ہوئی، سائنسی رجحان کو فروغ ملا اور جدید طرز کی تعلیم کی داغ بیل ڈالی گئی۔ نئے علم کلام کی ضرورت محسوس کی گئی، روشن خیالی پیدا ہوئی، مذہب کی نئی تفسیر و تعبیر پیش کی گئی اور اجتہاد فکر سے کام لیا گیا۔ شعر و ادب میں افادیت اور مقصدیت کا تصور عام ہوا اور اس سے معاشرتی اصلاح کا کام بھی لیا گیا۔ گویا مسلمانوں کی زندگی کا کوئی بھی شعبہ علی گڑھ تحریک کے اثرات سے بے نیاز نہ رہ سکا۔ سرسید احمد خاں اس تحریک کے پیشوا تھے جنھوں نے اپنی تمام زندگی قوم کی فلاح و بہبود اور اصلاح کی کوششوں میں صرف کردی۔ سرسید نے اپنے رفقا کی بھی ایک ایسی جماعت تیار کردی جس نے ان کے مشن کو آگے بڑھایا۔ علی گڑھ تحریک کو اس کے زمانۂ آغاز سے ہی مثبت اور منفی دونوں زاویوں سے دیکھا گیا۔ سرسید کے بعض رفقا نے بھی ان کے تمام نظریات سے مکمل طور پر اتفاق نہیں کیا لیکن اپنی اپنی دانست اور شعور کے لحاظ سے علی گڑھ تحریک میں وہ عملی طور پر سرسید کے معاون رہے۔ دوسری طرف سرسید اور علی گڑھ تحریک کے مخالفین میں قابلِ لحاظ تعداد ایسے اشخاص کی بھی ہے جنھوں نے اس تحریک کے

ہر پہلو کو منفی زاویۂ نظر سے دیکھا اور اس تحریک کی مخالفت میں اپنا سارا زور صرف کر دیا۔ علی بخش خاں شرر، مولوی امداد العلی، جمال الدین افغانی وغیرہ کا نام ایسے ہی اصحاب کی فہرست میں شامل ہے۔

علی گڑھ تحریک کی موافقت اور مخالفت کا سلسلہ آج بھی جاری ہے اسی لیے اردو کے مشہور فکشن نگار انتظار حسین کے بقول: ''سر سید احمد خاں کے سلسلے میں ہم ابھی تک دو انتہاؤں پر کھڑے ہیں، حالاں کہ قاعدے سے اب تک ہمیں راہِ اعتدال پر آ جانا چاہیے تھا۔''

اس لحاظ سے اب یہ ضروری تھا کہ علی گڑھ تحریک کے اثرات اور اس کے خلاف رونما ہونے والے ردِ عمل کے نتیجے میں جو مثبت یا منفی اثرات مرتب ہوئے ان کا معروضی انداز میں شرح و بسط کے ساتھ جائزہ لیا جائے تا کہ اس تحریک کی معنویت اور قدر و قیمت کا صحیح تعین ہو سکے، لیکن موضوع کی وسعت اور پھیلاؤ کو دیکھتے ہوئے ہم نے اپنا مطالعہ صرف شعر و ادب کی حد تک محدود رکھا ہے۔ ''علی گڑھ تحریک: عمل اور ردِّ عمل (اردو ادب کے حوالے سے)'' کے موضوع پر لکھا گیا یہ مقالہ چھ ابواب پر مشتمل ہے۔

باب اوّل: علی گڑھ تحریک کے سیاسی و سماجی پس منظر سے متعلق ہے جس میں یہ بتانے کی کوشش کی گئی ہے کہ علی گڑھ تحریک کے آغاز اور اس سے قبل کے زمانے میں ہندوستان کے سیاسی حالات کیسے تھے اور ہندوستانی معاشرہ کن آزمائشوں سے دوچار تھا۔

باب دوم میں علی گڑھ تحریک کی فکری اساس پر روشنی ڈالنے کی کوشش کی گئی ہے۔ اس سلسلے میں عقلیت، مادّیت، اجتماعیت اور سیاست کے ذیلی عنوانات کے تحت موضوع کا احاطہ کرنے کی سعی کی گئی ہے۔

باب سوم: علی گڑھ تحریک اور سر سید کی خدمت سے متعلق ہے۔ اسے بھی چار ذیلی عنوانات میں اس طرح تقسیم کیا گیا ہے: (الف) سائنٹفک سوسائٹی اور علی گڑھ انسٹی ٹیوٹ گزٹ (ب) رسالہ تہذیب الاخلاق (ج) ایم۔اے۔او کالج کا قیام اور جدید تعلیم کا تصور (د) مسلم ایجوکیشنل کانفرنس اور تعلیمی تحریک۔

باب چہارم میں اردو شعر و ادب پر علی گڑھ تحریک کے اثرات کا جائزہ لیا گیا ہے۔ کوشش یہ کی گئی ہے کہ سرسید کے نامور رفقا سے لے کر بعد کے زمانوں تک اردو شعر و ادب پر جو اثرات اس تحریک کے ذریعہ مرتب ہوئے ان سب کا ذکر کر دیا جائے۔

باب پنجم: ''علی گڑھ تحریک کا ردّ عمل'' کے عنوان سے ہے جس میں اردو شعر و ادب پر مرتب ہونے والے ان اثرات کا جائزہ شامل ہے جو علی گڑھ تحریک کے افادی اور مقصدی ادب کے خلاف ردّ عمل کے نتیجے میں سامنے آئے اور جن کی بدولت اردو شعر و ادب کو ایک نئے انداز سے وسعت حاصل ہوئی۔

باب ششم: ''حاصلِ کلام'' کے عنوان سے ہے جس میں علی گڑھ تحریک کے زیر اثر اردو شعر و ادب میں ہونے والی تبدیلیوں کا جائزہ شامل ہے اور اس تحریک کے خلاف ردّ عمل کے نتیجے میں اردو شعر و ادب پر جو اثرات مرتب ہوئے ان کا بھی تذکرہ کرتے ہوئے ادب کے حوالے سے علی گڑھ تحریک کی مجموعی خدمات پر روشنی ڈالنے کی کوشش کی گئی ہے۔

اس موضوع کے ساتھ پوری طرح انصاف کرنے کا دعویٰ تو میں نہیں کر سکتی لیکن حتی الامکان کوشش ضرور کی ہے کہ کوئی قابلِ ذکر بات بیان ہونے سے رہ نہ جائے۔ میں اپنی اس کوشش میں کس حد تک کامیاب ہو سکی ہوں اس کا فیصلہ صاحبانِ علم و فضل ہی فرمائیں گے۔

سب سے پہلے اس مالک حقیقی کا شکر ادا کرتی ہوں کہ اس کے فضل و کرم سے تعلیمی زندگی سے سارے مرحلے آسانی سے طے ہوئے۔

مقالے کی تیاری کے سلسلے میں میرے نگراں ڈاکٹر شہاب الدین ثاقبؔ نے ہر مرحلے میں میری رہ نمائی کی اور اپنے مفید مشوروں سے نوازا۔ اس کے لیے میں تہہ دل سے ان کا شکریہ ادا کرتی ہوں۔

شعبۂ اردو کے تمام اساتذہ نے ریسرچ کے دوران میری حوصلہ افزائی کی، بالخصوص پروفیسر ابوالکلام قاسمی، ڈاکٹر محمد علی جوہر اور ڈاکٹر راشد انور راشد نے مایوس کن حالات میں بھی میری ہمت بندھائی اور مفید مشوروں سے نوازا۔ پروفیسر محمد زاہد (صدر شعبۂ اردو) اور پروفیسر قاضی افضال حسین

(ڈین فیکلٹی آف آرٹس) کی عنایات بھی میرے شامل حال رہیں۔ میں ان سب کا تہہ دل سے شکریہ ادا کرتی ہوں۔

مولانا آزاد لائبریری کے ذمہ داروں میں ڈاکٹر شائستہ خان، باقر صاحب، محسن بھائی اور سمینار لائبریری کے نگراں سہیل صاب نے مطلوبہ کتب کی فراہمی میں معاونت فرمائی۔ دوستوں میں شیبہ قمر، حنا کوثر، افسانہ، یاسمین، نسرین، شبانہ، شازیہ، خدیجہ، قمر، زینت، ریحانہ، منورہ سلطانہ، فوزیہ، شائستہ، گوہر، نیلوفر، ضوبہ، عبدالخالق اور سینیئرز میں محمد طارق، ملکہ سحر افروز، نفیس، مامون رشید، آفتاب عالم، یشودا اور اسما وغیرہ نے میرے ساتھ تعاون کیا۔

آخر میں اس خوشی کے موقع پر میں اپنے محترم والدین، بھائیوں، بھابھیوں، بہنوں، بھتیجے، بھتیجوں، بھانجے، بھانجیوں اور اپنے مخلص شوہر، خوشدامن صاحب، خسر محترم، جیٹھ جیٹھانی، دیوروں اور دیورانیوں کو فراموش نہیں کرسکتی جن کی شفقتوں، دعاؤں اور حوصلہ افزائیوں نے مجھے اس مقام تک پہنچایا۔ میں ان کا تہہ دل سے شکریہ ادا کرتی ہوں اور ان کے لیے بھی دونوں جہاں کی خوشی اور کامیابی کی دعائیں کرتی ہوں۔ خصوصاً اپنے والد مرحوم کے لیے دعائے مغفرت کرتی ہوں۔

جناب محمد شاہد عالم نے محنت اور توجہ کے ساتھ بہت قلیل وقت میں اس مقالے کی کمپوزنگ مکمل کردی لہٰذا ان کا بھی دل سے شکریہ ادا کرتی ہوں۔

(فاطمہ عظمت)
ریسرچ اسکالر
شعبۂ اردو، علی گڑھ مسلم یونیورسٹی
علی گڑھ

علی گڑھ تحریک کا سیاسی وسماجی پس منظر

ہندوستان ایک ایسا ملک ہے جو ہمیشہ سے بیرونی ممالک کی توجہ کا مرکز رہا ہے اور جس کو 'سونے کی چڑیا' کہا جاتا رہا ہے۔ جس طرح سب سے زیادہ پھل دار درخت پر پتھر برسائے جاتے ہیں اسی طرح یہ ملک بھی طرح طرح کے حملوں کا شکار رہا ہے۔

عروج وزوال یہ دو ایسے لفظ ہیں جن کا آپس میں چولی دامن کا ساتھ ہے، کیوں کہ اگر قوموں کو عروج حاصل ہوا ہے تو ساتھ ہی ساتھ انھیں زوال سے بھی دوچار ہونا پڑا ہے۔ اس عروج وزوال کی کہانی، داستان، ناول یا افسانہ کی طرح چند منٹ، گھنٹہ، دن، ہفتہ، مہینہ یا سال کی نہیں ہوتی بلکہ یہ ایسی طویل کہانی ہوتی ہے جس کے نقوش صدیوں تک آنے والی نسلوں کے لیے سبق آموز ہوتے ہیں۔

اس عروج وزوال کے دردناک سابقہ کی مثال مغلیہ حکومت ہے جس نے ہندوستان پر تقریباً تین سو تیس سال تک حکومت کی، لیکن آخر میں وہ بھی اس زوال کا شکار ہوگئی۔ دراصل مغل حکومت کا آغاز بابر سے ہوا اور اختتام صحیح معنوں میں اورنگ زیب پر۔ محمد بن قاسم نے سندھ میں آٹھویں صدی عیسوی میں اسلامی حکومت کی بنیاد ڈالی جس کے بعد مسلمانوں کی حکومت کا سلسلہ ہندوستان میں تقریباً آٹھ سو سال تک برابر جاری رہا۔

اسلامی حکمرانوں کی اہم خوبی یہ تھی کہ یہ لوگ بھی باہر سے آئے تھے لیکن انھوں نے کبھی بھی ہندوستان کو غیر ملک نہیں سمجھا تھا بلکہ وہ لوگ خود یہاں کے ماحول میں رچ بس کر اس کو ترقی کی اعلیٰ منزل

تک پہنچانے میں گامزن ہو گئے تھے۔ انھوں نے یہاں کے مقامی ہندوؤں کے ساتھ بھی اچھے سلوک سے کام لیتے ہوئے انھیں اونچے اونچے عہدوں پر فائز کیا۔

طفیل احمد منگلوری لکھتے ہیں:

''اکبر، جہاں گیر، شاہ جہاں اور اورنگ زیب کے تمام جانشینوں کے زمانے میں ہندو مسلم یکساں حیثیت رکھتے تھے۔ مذہب کی مساویانہ توقیر ہوتی تھی اور مذہب کے لیے کسی قسم کی جانب داری نہیں برتی جاتی تھی۔ ہر بادشاہ کی طرف سے بے شمار ہندو مندروں کو جاگیریں اور معافیاں دی گئی تھیں۔ آج تک ہند میں متعدد مندروں کے پجاریوں کے پاس اورنگ زیب کے دستخطی فرمان موجود ہیں جن میں خیرات اور جاگیروں کے عطا کیے جانے کا تذکرہ ہے۔''[1]

اسی طرح منگلوری آگے بھی لکھتے ہیں:

''اورنگ زیب کے عہد میں بھی بنگال کے ہندوؤں کو منصب داری اور بڑی بڑی جاگیریں دی گئیں۔ اس نے ہندوؤں کو گورنر بنایا، گورنر جنرل یا وائسرائے بنایا۔ یہاں تک کہ خالص اسلامی صوبہ افغانستان پر بھی نائب دارالسلطنت مقرر کیا تھا وہ ایک راجپوت تھا۔ اسی طرح سراج الدولہ کا وزیر اعظم موہن لال تھا۔ پٹنہ کا حاکم رام نرائن، ٹیپو سلطان کا معتبر سردار پورینا برہمن تھا۔''[2]

اسلامی حکومت کے اتنے طویل عرصے کو دیکھ کر ہی انگریز ہمیشہ خائف رہتے تھے کہ انھوں نے ملک مسلمانوں کے ہاتھوں سے چھینا ہے اس لیے ملک کو آزاد کرانے اور ہمیں باہر نکالنے کی تحریک بھی انھیں کی طرف سے شروع ہوگی۔ اس خیال کے مدّنظر وہ مسلمانوں کو اپنا سب سے بڑا دشمن تصور کرتے تھے۔

۱۷۰۷ء کا سال ہندوستان کے لیے مکمل بربادی کی علامت تھا۔ اورنگ زیب کہ جس نے اپنے والد شاہ جہاں کے عہد میں ہی تخت وتاج حاصل کرلیا تھا اور اپنی حکمت عملی سے ہندوستان کو کافی وسیع کردیا تھا، لیکن اس کے انتقال کے بعد ملک میں ایسا انتشار ہوا کہ ملک چھوٹی چھوٹی ریاستوں اور صوبوں تک ہی محدود ہوکر رہ گیا۔ ان حالات سے سب سے زیادہ فائدہ انگریزوں نے اٹھایا جو کہ ہمایوں کے زمانے میں تجارت کے بہانے ہندوستان میں داخل ہوئے اور جلد ہی ہندوستان کے حکمراں بننے میں کامیاب ہوگئے۔

انگریزوں کو یہ کامیابی مغل حکومت کے اُن اٹھارہ بادشاہوں کے ذریعہ حاصل ہوئی جو کہ اورنگ زیب کے بعد وقتاً فوقتاً تخت نشیں ہوئے، ان میں عیش پرستی، توہم پرستی اور آرام طلبی نے جگہ پالی تھی۔ غرض یہ کہ اورنگ زیب کے بعد مغل حکومت اہل نااہل، لائق نالائق اور اچھائی برائی جیسے تضادات کی شکار رہی جس کی وجہ سے اس میں مدبر، سمجھدار اور عقل وفہم کے شناساؤں کی کمی رہی۔ حالاں کہ یہ رائے بھی قائم نہیں کی جاسکتی کہ تمام حکمراں نااہل تھے، بلکہ ان میں بعض ایسی قابل ہستیاں بھی تھیں جو ملک کے حالات کو سدھارنے میں لگی رہیں لیکن زیادہ تر وہ آپسی سازشوں کی وجہ سے ناکام رہیں۔

ہندوستان میں انگریزوں نے ہی مغلوں کی حالت سے فائدہ نہیں اٹھایا بلکہ دوسرے ملک کے حکمراں مثلاً نادرشاہ درّانی اور احمد شاہ ابدالی (اس نے نو بار حملہ کیا) نے بھی ہندوستان کو برباد کرنے میں کوئی کسر باقی نہ رکھی۔ ہندوستان کی اس تباہ کن حالت نے انگریزوں کو اور بھی زیادہ مضبوط بنادیا اور وہ دن بہ دن ہندوستان پر قبضہ کرنے میں کامیاب ہوتے گئے اور آخر کار ایک دن انھوں نے مغل تاج داروں کی حیثیت بھکاریوں سے بدتر کردی، ان کی شناخت وظیفہ خوار سے زیادہ نہ رہی۔

سرسید نے لکھا ہے کہ:

''عیدگاہ میں بڑا ازدحام خلائق کا قابل رکھنے کو جگہ نہ تھی۔ دھوپ میں ذرا تیزی آگئی تھی، عیدگاہ میں پورا فرش تو ہے نہیں اور لوگوں کو اتنا مقدور نہیں کہ

مصلّے خریدیں۔ ہزاروں آدمی دھوپ میں بیٹھے ہوئے تھے، وہاں ہزاروں مسلمان تھے مگر ایک سے ایک بدتر حالت میں مسلمانوں میں عید کا دن بڑا خوشی کا دن ہے۔ ہر ایک مسلمان اپنے مقدور بھر اچھے اچھے کپڑے پہنتا ہے، پنساری بھی دو دو کوڑی جمع کر کے عید کے لیے اپنے بچے کو نیا جوڑا بنا دیتی ہے۔ عیدگاہ میں، میں نے ہزاروں پر نظر ڈالی، کسی کے گلے میں بجز گزی اور ادھوتر کے اور کچھ نہ دیکھا۔ کپڑے تو سب کے دھوئے ہوئے اور اُجلے تھے مگر ہزاروں آدمیوں کے انگرکھوں میں پیوند لگے ہوئے تھے۔ اگر کسی کے گلے میں گزی کا نیا انگا تھا، تو یقین جانئے پرانا پاجامہ تھا جس میں چھلنی کے سے چھید تھے۔ جوتے تو کسی کے پاؤں میں ثابت نہ تھے۔ بہتوں نے رسّی یا چیتھڑے سے باندھ لیے تھے کیوں کہ پاؤں سے نکل جاتے تھے۔ بڑے بوڑھوں کا کچھ ذکر نہیں، بچوں کو عید کے دن اچھے اچھے کپڑے پہننے کا اور کھلونے لینے کا بڑا شوق ہوتا ہے لیکن کسی بچے کا یکساں لباس نہ تھا۔ اگر سر پر چھوئے گوئے کی لودی تھی تو پاؤں میں جوتا نہیں، پاجامہ نیا ہے تو انگا پرانا ہے۔ ہر ایک آدمی پر ایسے مبارک اور خوشی کے دن میں بھی نہایت افلاس اور مصیبت برستی تھی کسی کا دل اندر سے خوش نہ تھا۔ ہر ایک غمگین رونی صورت، بسورتی شکل، تیوری چڑھی ہوئی۔ داڑھی پر گرد پڑی ہوتی، پیادہ پا چلنے سے پسینے میں شرابور سب نہایت پریشان اور متفکر نظر آتے تھے۔ عیدگاہ کے باہر ایک غول بھیک منگوں کا تھا جو دو، دو کوڑی مانگتے تھے اور پیچھا نہیں چھوڑتے تھے۔ بیسیوں مسلمان سڑک پر کپڑا بچھائے بیٹھے تھے اور پکار رہے تھے: ''کچھ خیرات

دیتے جاؤ تیسوں روزے قبول'' ایک طرف سیکڑوں عورتوں کا ایک غول تھا اور ان میں بیسوں برقعہ اوڑھے چلاّ رہی تھیں کہ ''اے بیٹا ہم سیدانی میں، فاطمہ بی بی کا دانہ کھانے والی ہیں، اشراف گھرانے کی ہیں ہم پر بڑی مصیبت ہے، اپنے بال بچوں کا صدقہ خاتون جنت کا صدقہ دیتے جاؤ۔''[۳]

کسی بھی ملک کی کامیابی دو خاص طبقات پر منحصر ہوتی ہے: (۱) حکمراں (۲) عوام۔ لیکن جب ان میں سے ایک بھی کمزور ہوتا ہے تو وہ ملک تباہ و برباد ہو جاتا ہے۔ ہندوستان کی بدقسمتی کا بھی یہی عالم تھا کہ حکمراں طبقہ اپنی نااہلی اور عیش پرستی کی وجہ سے ترقی کے میدان میں پیچھے تھا۔ دوسری طرف عوام اپنے فرسودہ رسم و رواج ماضی کے سنہرے جھروکے اور توہم پرستی کے سبب پستی کا شکار تھے۔

سرسید لکھتے ہیں کہ:

''اس ملک میں ہماری قوم کا حال نہایت ابتر ہے، اگر ہماری قوم میں صرف جہالت ہی ہوتی تو چنداں مشکل نہ تھی، مشکل تو یہ ہے کہ قوم کی قوم جہل مرکب میں مبتلا ہے۔ علوم جن کا رواج ہماری قوم میں تھا یا ہے اور جس کے تکبر و غرور سے ہر ایک پھولا ہوا ہے۔ دین و دنیا میں بکار آمد نہیں، علم ادب انشا کی خوبی صرف لفظوں کے جمع کرنے اور ہم وزن کلموں تک ملانے اور دور از کار خیالات بیان کرنے اور مبالغہ آمیز باتوں کے لکھنے پر منحصر ہے۔ فن شاعری جیسا ہمارے زمانے میں خراب اور ناقص ہے اس سے زیادہ کوئی چیز بری نہ ہوگی۔ علم دین تو وہ خراب ہوا ہے کہ جس کی کوئی حد نہیں۔ اس معصوم، سیدھے سادے سچے اور نیک طبیعت والے پیغمبر نے جو خدا کے احکام بہت سادگی، صفائی اور بے تکلفی سے جاہل، اَن پڑھ اور بادیہ نشین عرب کی قوم کو پہنچاتے

تھے، اس میں وہ نکتہ چینیاں اور باریکیاں پیدا کیں اور وہ مسائل فلسفہ اور دلائل منطقہ ملائی گئیں کہ اس میں اس سچائی، صفائی اور سادگی کا مطلق اثر نہیں رہا۔ یہ مجبوری لوگوں کو اصلی احکام کو جو قرآن اور متعدد حدیثوں میں تھے چھوڑنا پڑا اور زید و عمرو کے بنائے ہوئے اصولوں کی پیروی کرنی پڑی۔ علم مجلس اور اخلاق اور برتاؤ دوستی کا ایک ایسے طریقہ پر پڑ گیا ہے جو نفاق سے بھی بدتر ہے۔

امیروں کا حال دیکھو تو ان کو دن رات بٹیر لڑانے، مرغ لڑانے، کبوتر اڑانے اور اس طرح تمام لغویات میں زندگی بسر کرنے کے سوا اور کچھ کام نہیں تھا اور مذہبی طبقہ کا یہ حال کہ کینہ و نخوت اور اپنے تقدس و بزرگی اور خدا پرست ہونے کا گھمنڈ مقدس لوگوں میں کوٹ کوٹ کر بھرا پاؤ گے۔ اور اگر دنیا میں شیطان کو ڈھونڈتے پھرو تو بجز مقدین کے جبہ و دستارِ مبارک کے اور کہیں پتا نہ ملے گا۔''[۴]

''ہمارے ملک کے شرفا کی حالت موجب ذلت و رُسوائی ہے جب ہم اپنے ملک کے ان نامی گرامی خاندانوں پر نظر ڈالتے ہیں جو ایک زمانے میں معدنِ علم و ہنر اور مخزنِ فضل و کمال تھے تو اب وہی خاندان سب سے زیادہ ننگ و عار معلوم ہوتے ہیں اور جن لوگوں کے آبا و اجداد نے صرف علم و عقل کے سبب سے کبھی شرف حاصل کیا تھا وہی لوگ اب علم و عقل سے ایسے بے بہرہ ہیں۔ زیادہ افسوس اس بات کا ہے کہ جس قدر ان کے فضل و کمال اور خاندانی اعزاز کی کمی ہوتی جاتی ہے اسی قدر ان کے دماغ نخوت و تکبر کے بدبودار دھوئیں سے سیاہ ہوتے چلے جاتے ہیں۔''[۵]

''جو علوم مسلمانوں میں مروّج ہیں وہ بلاشبہ غیر مفید ہیں اور حسب احتیاج وقت نہیں ہیں، اور یہی باعث ان کی مفلسی اور محتاجی کا ہے کیوں کہ مفلسی کا اصل سبب جہل ہے اور غیر مفید علوم کا عالم اور جاہل دونوں برابر ہیں اس لیے ان سے نہ لوگوں کو کچھ فائدہ پہنچا ہے اور نہ وہ خود کچھ اپنا بھلا کر سکتے ہیں۔ جو تعلیم کہ حسب احتیاج وقت نہ ہو وہ غیر مفید ہوتی ہے اور جیسا کہ ایک عقل مند آدمی کا قول ہے: 'اگر حسب احتیاج وقت لوگوں کی تعلیم و تربیت نہ ہو تو اس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ لوگ اوّل مفلس محتاج اور پھر نالائق اور کاہل اور پھر ذلیل و خوار اور پھر چور و بدمعاش ہو جاتے ہیں۔''[٦]

علی گڑھ تحریک کہ، جس کو انیسویں صدی کی پہلی اہم تحریک کی حیثیت سے جانا جاتا ہے۔ دراصل یہ تحریک ملک کو ان حالات سے نجات دلانے کی پہلی کوشش تھی کہ جس کی وجہ سے ہندوستانی ذہنی و قلبی انتشار اور بے چینی و بے قراری کا شکار ہوتے جا رہے تھے۔ البتہ علی گڑھ تحریک سے بہت پہلے ہندوستانیوں کو ان مصیبتوں سے نجات دلانے کے لیے کئی اہم تحریکیں وجود میں آ چکی تھیں مثلاً: (۱) تحریک شاہ ولی اللہ (۲) تحریک سید احمد شہید بریلوی (۳) تحریک شاہ عبدالعزیز (۴) تحریک سید صاحب وغیرہ۔

شاہ صاحب کا اصل مقصد عوام میں حرکت و حس پیدا کرنا تھا اس لیے انھوں نے امیر، غریب، درویش اور صوفیوں سے الگ الگ خطاب کر کے اپنے پیغام کو عوام تک پہنچانا چاہا۔ لہٰذا امیروں سے خطاب کرتے ہوئے کہتے ہیں کہ:

''اے امیرو! دیکھو کیا تم خدا سے نہیں ڈرتے دنیا کی فانی لذتوں میں تم ڈوبے جا رہے ہو اور جن لوگوں کی نگرانی تمہارے سپرد ہوتی ہے تم نے ان کو چھوڑ دیا ہے۔ تا کہ ان میں بعض بعض کو کھاتے اور نگلتے رہیں، تمہاری ساری ذہنی

قوتیں اس پر صرف ہو رہی ہیں کہ لذیذ کھانوں کی قسمیں پکواتے رہو اور نرم و گداز جسم والی عورتوں سے لطف اُٹھاتے رہو۔ اچھے کپڑے اور اونچے مکانات کے سوا تمہاری توجہ کسی اور طرف منعطف نہیں ہوتی۔''[۷]

مشائخ کو للکارتے ہوئے کہتے ہیں کہ:

''ہم ایسے لوگوں کو قطعاً پسند نہیں کرتے جو محض لوگوں کو اس لیے مرید کرتے ہیں تا کہ ان سے ٹکے وصول کریں۔''[۸]

عوام کو مخاطب کر کے کہتے ہیں کہ:

''اے آدم کے بچو! جسے خدا نے ایک جائے سکونت دے رکھی ہو جس میں وہ آرام کرے، اتنا پانی جس سے وہ سیراب ہو، اتنا کھانا جس سے زندگی بسر ہو جائے، اتنا کپڑا جس سے تن ڈھک جائے، ایسی بیوی جو اس کے رہن سہن کی جدوجہد میں مدد دے سکتی ہو تو یاد رکھو کہ دنیا کامل طور سے اس شخص کو مل چکی ہے، چاہیے کہ اس پر خدا کا شکر ادا کرے۔ بہر حال کوئی نہ کوئی راہ کمائی کی آدمی ضرور اختیار کرے۔''[۹]

شاہ صاحب بھی تقلید کو برا بتاتے تھے۔ کہتے تھے کہ:

''جب ان فقہائے مقلدین کے کانوں میں ایسی کوئی بات پہنچتی ہے جو ان کے تقلیدی مسلمات کے خلاف ہے تو وہ غصے سے بھر جاتے ہیں۔ ان کی گردن کی رگیں پھول جاتی ہیں، چہرہ سرخ ہو جاتا ہے گویا وہ دہکتا ہوا انگارہ ہے اور ایسا معلوم ہوتا ہے کہ جس کے منہ سے وہ گستاخانہ کلمہ نکلا ہے، ابھی وہ اس پر چڑھ دوڑیں گے۔''[۱۰]

انھوں نے لوگوں کو سمجھاتے ہوئے یہ بھی کہا کہ:

''کلام اللہ اس لیے نہیں آیا کہ اسے ریشمی جزدانوں میں لپیٹ کر طاق پر تبرکاً رکھا جائے جس طرح دوسری قومیں منتر پڑھتی ہیں۔ ہم اسے طوطے کی طرح بغیر سمجھے پڑھ دیں۔''[11]

غرض کہ ان تمام تحریکوں نے بھی اس زوال پذیر سماج کی کافی حد تک رہنمائی کی جو سماجی، اقتصادی، علمی اور عملی میدان میں مغرب سے قدم قدم پر شکست وریخت کا سامنا کر رہا تھا، لیکن خالص مذہبی ہونے کی وجہ سے یہ تمام تحریکیں سماج کو مغرب کے بالمقابل کھڑا کرنے میں ناکام رہیں۔

ان تحریکوں کا خاص مقصد بیرونی طاقت کے خلاف ہندوستانی مرکز کو مضبوط کرنا، وطن کو انگریزوں سے آزاد کرانا، ہندوستانیوں کو پستی سے نکالنے اور بے بسی سے نجات دلانے کا تھا۔ یہ ابتدائی تحریکات تھیں جنھوں نے تقریباً دو صدیوں تک اپنے گہرے اثرات سے متاثر کر کے مستقبل کی تحریکات کے لیے راستہ ہموار کیا۔ لہٰذا یہ تمام تحریکیں سنگِ میل کی حیثیت رکھتی ہیں۔

علی گڑھ تحریک پر بھی ان کے کافی اثرات دکھائی دیتے ہیں۔ سرسید احمد خاں جو کہ مغل حکومت کی بے بسی کا کافی غور سے مطالعہ کر چکے تھے۔ انھیں یقین کامل تھا کہ اب اس حکومت کو استحکام ہونے والا نہیں ہے۔ لہٰذا انھوں نے اپنی انگریز ملازمت کے دوران ہی ہندوستان کی کمزوریوں اور نااہلی کا اندازہ بہ خوبی لگا لیا تھا۔ وہ اس نتیجے پر پہنچے کہ فاتح قوم سے نفرت کرنے کے بجائے ان کی ترقی کے ان اسباب پر غور وخوض کیا جائے جس کی وجہ سے وہ آج دنیا میں فاتح قوم کی حیثیت رکھتی ہے۔

تہذیب الاخلاق کے مضمون تعصب میں سرسید لکھتے ہیں کہ:

''دنیا میں کوئی قوم ایسی نہیں جس نے خود ہی تمام کمالات اور تمام خوبیاں اور خوشیاں حاصل کی ہوں اور بلکہ ہمیشہ ایک قوم نے دوسری قوم سے فائدہ

اٹھایا ہے۔ مگر متعصب شخص ان نعمتوں سے بدنصیب رہتا ہے۔ علم میں اس کو ترقی نہیں ہوتی، ہنر وفن میں اس کو دستگاہ نہیں ہوتی، دنیا کے حالات سے وہ ناواقف رہتا ہے۔ عجائبات قدرت کے دیکھنے سے وہ محروم ہوتا ہے، حصول معاش اور زیادہ عزت اور تمول مثل تجارت وغیرہ کے وسیلے جاتے رہتے ہیں اور رفتہ رفتہ تمام دنیا کے انسانوں میں روز بہ روز ذلیل وخوار اور حقیر وناچیز ہوتا جاتا ہے۔"[۱۲]

علی گڑھ تحریک کو خالص مسلمانوں کی فلاح و بہبود کے لیے گردانا غلط ہوگا کیوں کہ یہ تحریک تمام ہندوستانیوں کو مدّنظر رکھ کر ہی وجود میں آئی تھی۔ اس تحریک نے ہندوستانیوں کو اس کش مکش سے نجات دلائی تھی جس کی وجہ سے وہ اپنی شناخت کھو چکے تھے۔ ان میں قدامت پرستی، مفلسی، کاہلی اور طرح طرح کی برائیاں جڑ پکڑ گئی تھیں۔ البتہ یہ برائیاں مسلمانوں میں کچھ زیادہ تھیں کیوں کہ وہ اپنے آباواجداد کے کارناموں کے ہی راگ الاپتے رہتے تھے۔ جب کہ راجہ رام موہن رائے نے بنگال میں اپنی اصلاحی تحریک سے ہندوؤں کے فرسودہ رسم ورواج اور روایت پرستی وغیرہ کو کافی حد تک کم کر دیا تھا۔ کیوں کہ راجہ رام موہن رائے پر اب یہ حقیقت واضح ہو چکی تھی کہ انگریزوں کی مخالفت کرنا بیکار ہے کیوں کہ اب انگریزوں کا ہندوستان سے جانا مشکل ہے۔ ان تمام حالات کو مدنظر رکھتے ہوئے راجہ رام موہن رائے اس نتیجے پر پہنچے کہ اب ہندوستانی انگریز کی حکومت کو قبول کر کے، ان کی جدید تعلیم سے بہرہ مند ہو کر نئے دور میں قدم رکھیں اور تمام فرسودہ رسم ورواج اور توہمات سے آزادی حاصل کریں۔

لہٰذا راجہ رام موہن رائے نے ہندو مذہب کی ان برائیوں کو دور کرنے کے لیے ایک جماعت برہموسماج اور برہموسبھا کے نام سے قائم کی، جس نے ہندو عورتوں کو ستی ہونے کی رسم سے بھی نجات دلائی۔

راجہ رام موہن رائے کے خیالات ان کے اس نجی خط سے اچھی طرح واضح ہو جاتے ہیں۔ لکھتے ہیں کہ:

''میں افسوس کے ساتھ کہہ سکتا ہوں کہ آج کل ہندو مذہب کی جس شکل میں پیروی کی جارہی ہے، وہ ہندوؤں کے سیاسی مفاد کے لیے غیر مفید ہے۔ ذات پات کی تفریق نے ان کے اندر اَن گنت گروہ پیدا کر دیے ہیں اور اس چیز نے ان کو قوم پرورانہ جذبات سے عاری بنا دیا ہے۔ میں سمجھتا ہوں کہ کم از کم ان کی (ہندوؤں کی) سیاسی فلاح اور سماجی آسودگی کے لیے ان کے مذہب میں کسی قسم کی تبدیلی پیدا کرنا ضروری ہے۔''[۱۳]

اٹھارویں اور انیسویں صدی کا زمانہ ہندوؤں کے لیے نئی ترقیوں اور نئے دور کی اہمیت کو سمجھنے اور آگے بڑھتے رہنے کا زمانہ تھا۔ بقول لارڈ میکالے کے اس خط سے جو اس نے اپنے باپ کو لکھا تھا:

''انگریزی تعلیم کا ہندوؤں پر بہت زیادہ اثر ہے کوئی ہندو جو انگریزی داں ہے، کبھی سچائی کے ساتھ اپنے مذہب پر قائم نہیں رہتا۔ کچھ لوگ مصلحتاً ہندو رہتے ہیں مگر اکثر یا تو موحد ہو جاتے ہیں یا عیسائی مذہب قبول کر لیتے ہیں۔ میرا تو پختہ عقیدہ ہے کہ ہماری اسکیم پر اگر پوری طرح عمل درآمد ہوا تو بنگال میں ایک بھی ہندو نظر نہیں آئے گا۔''[۱۴]

جب کہ مسلمان اس نئے دور کی دوڑ میں بہت پیچھے تھے، لیکن اس کے باوجود یہ لوگ انگریزوں کی لائی ہوئی ہر چیز سے نفرت و گریز کرتے تھے۔ ان کے اصلاحی کاموں کو بھی شک و شبہ کی نگاہ سے دیکھتے تھے۔ مثلاً: ۱۸۳۵ء میں جب ایسٹ انڈیا کمپنی نے تمام اسکولوں میں انگریزی تعلیم کو ضروری قرار دیا تو اس کی سب سے زیادہ مخالفت مسلمانوں نے ہی کی، اس کی جگہ انھوں نے عربی مدرسوں کے

قیام کی اپیل کی۔ اپنی انھیں دقیانوسی باتوں کی وجہ سے یہ لوگ اپنے ہم وطنوں سے بھی جدید تعلیم کے میدان میں پیچھے ہوتے جا رہے تھے۔ انگریزوں سے ان کی نفرت اس حد تک تھی کہ ایک مسلمان بزرگ کا ارشاد ہے کہ:

''کتا اگر چہ میرے مذہب میں نجس ہے مگر وہ انگریزوں کی طرف منھ کر کے بھونکے تو میں اس کا منھ چوم لوں۔''[۱۵]

عطا اللہ شاہ بخاری کا ارشاد ہے کہ:

''اگر میرا بس چلے تو میں انگریزوں کو مارنے کے لیے سوروں سے اتحاد کرنے میں بھی گریز نہ کروں۔''[۱۶]

مسلمانوں کی ان حرکات وسکنات سے بیرونی قوم فائدہ اٹھا کر ہندوستان کو ہر اعتبار سے کھوکھلا کر رہی تھی۔ مثلاً جاگیرداری کی جگہ سرمایہ دارانہ نظام نے لے لی۔ مادّیت پرستی کا دور دورہ ہوا، ہندوستانیوں کے ساتھ غلامانہ سلوک اختیار کیا جانے لگا، عیسائیت کا فروغ ہوا۔ اس طرح انگریزوں نے ہندوستان پر دھیرے دھیرے اپنی گرفت مضبوط کر لی، لیکن مسلمان انگریزوں کی اس سیاسی ترقی کو قبول نہیں کر رہے تھے۔ کیوں کہ دہلی اور مرکزی علاقوں میں قدیم نظام اب بھی اپنے گہرے اثرات چھوڑے ہوئے تھے۔

مسلمانوں کی سماجی حالت یہ تھی کہ یہ مکمل طور پر تقلید اور ماضی پرستی کا شکار تھے۔ ان کے اندر جدید علوم کی تلاش وجستجو سرے سے ہی معدوم تھی جب کہ اس زمانے میں مغربی علوم اور سائنسی ایجاد نے تہلکہ مچا دیا تھا۔ انگریزی ادب وکلچر کی ابتدا بڑی تیزی سے ہو رہی تھی۔ لہٰذا مشرق ومغرب کی یہ ٹکر سیاست، مذہب، عقائد، تہذیب، معاشرت اور تعلیم وادب کے وسیع میدانوں میں پھیلی ہوئی نظر آتی ہے۔

جب انگریز ہندوستان کی تمام چھوٹی بڑی ریاستوں پر قبضہ کرنے اور راجہ رام موہن رائے کی تحریک کے زیر اثر عیسائیت پھیلانے میں کامیاب ہو گئے تو پھر انھوں نے اپنا اگلا قدم ہندوستانیوں کے نجی معاملات میں دخل دینے کے لیے اٹھایا۔ مثلاً سب سے پہلے تو انھوں نے ہندوستانیوں کے ساتھ غلامانہ سلوک اختیار کیا۔ دوسرے ہندوستانیوں کے مذہب میں دخل دیا اور انھیں نے عیسائی پادریوں کا وعظ سننے کے لیے مجبور کیا جانے لگا۔ یہ پادری اپنی تقریروں میں صرف اپنے مذہب کی خوبیوں کے بارے میں ہی نہیں بتاتے تھے بلکہ دوسرے مذہب کی مقدس کتابوں پر بھی اعتراض کرتے تھے۔ ہندو اور مسلمانوں کے بزرگوں اور لیڈروں کو ذلیل وخوار کرتے تھے؛ بچوں کو اسکولوں میں انگریزی تعلیم دی جاتی تھی لیکن ہندوستانی اپنے بچوں کو ان اسکولوں میں بھیجنے کے لیے مجبور تھے کیوں کہ اس تعلیم کے تعبیر انھیں کوئی بھی سرکاری نوکری نہیں مل سکتی تھی۔ ۱۸۵۵ء میں انگریزی حکومت نے ہندوستانی ملازمین کے لیے کلکتہ کے پادری اسے زید منڈ کے ذریعہ جب یہ اعلان کروادیا کہ جب تار برقی اور ریل کی ایجاد نے فاصلوں کو کم کر ہی دیا ہے تو یہ بھی ضروری معلوم ہوتا ہے کہ لوگوں کا مذہب بھی ایک یعنی عیسائی مذہب ہو جائے۔ اس کے علاوہ بعض ایسے قوانین منظور ہو گئے جن کی وجہ سے ہندو و مسلم کے مذہب وعقائد میں انگریزوں کی مداخلت اور زیادہ بڑھ گئی۔ مثلاً (۱) انھوں نے ہندوؤں کی قدیم رسم ''ستی'' پر پابندی عائد کردی، اگر چہ یہ رسم انسانی نقطۂ نظر کے خلاف تھی لیکن ہندو اس کو اپنے مذہب میں سیاسی مداخلت سمجھتے تھے۔ (۲) انھوں نے گود لینے اور بیواؤں کے متعلق قانون نافذ کیے جس کی وجہ سے ہندوؤں میں افراتفری مچ گئی، کیوں کہ ان میں گود لینے کا رواج عام تھ۔ اس کی عمدہ مثال رانی لکشمی بائی ہے، کیوں کہ اس کے پتی گنگا دھر راؤ عرف بابا صاحب کے انتقال کے بعد ان کا گود لیا ہوا بیٹا 'دامودر راؤ' ہندو قانون کے مطابق اس ریاست کا وارث تھا، لیکن انگریزوں نے اپنے اس نافذ کردہ قانون کے تحت جھانسی کو ایسٹ انڈیا کمپنی کے علاقے میں شامل کرلیا۔ اسی طرح انگریزوں سے مرہٹوں کے آخری نمائندے باجی

راؤ سے یہ وعدہ کیا تھا، اگر وہ اپنی ریاست ہمیں دے دے تو آٹھ لاکھ روپیہ سالانہ ان کو بطور پنشن ملا کرے گی۔ لیکن ان کے انتقال کے بعد انگریز اس وعدے پر قائم نہیں رہے اور اس کے گود لیے ہوئے بیٹے دھوندو پنت عرف نانا صاحب کو پنشن دینے سے انکار کر دیا۔ یہی نہیں انھوں نے بہادر شاہ ظفر سے بھی یہ کہہ دیا کہ جب تک آپ زندہ ہیں پنشن ملتی رہے گی۔ آپ کے بعد یہ سلسلہ ختم ہو جائے گا اور آپ کے متعلقین و متوسلین کو قلعہ معلیٰ سے باہر نکال دیا جائے گا۔ اسی طرح انگریزوں نے کچھ قوانین ہندوستانی سپاہیوں کے لیے بھی نافذ کیے، جو کہ سپاہیوں کو پسند نہیں آئے۔ (۱) مثلاً فوجی لباس میں کوئی بھی سپاہی ماتھے پر تلک اور کانوں میں بالیاں نہیں پہنے گا۔ (۲) انھیں اپنی داڑھیاں منڈوانی ہوں گی۔ پگڑی کی جگہ ٹوپی کا استعمال کرنا ہوگا۔ چنانچہ ان کا یہ قانون ہندوستانیوں کی دل آزاری کی وجہ ثابت ہوا، کیوں کہ داڑھی منڈوانا یا مونچھیں منڈوانا ہندو و مسلم دونوں کے لیے ہی انتہائی ذلت کی بات تھی۔ اسی طرح پگڑی، صافہ اور عمامہ تمام ہندوستانیوں کے لیے ہی عزت و افتخار کی نشانی سمجھی جاتی تھی۔ لہٰذا انگریزوں کی اس طرح بدعہدی، ہندوستانی رسم و رواج اور مذہبی عقائد میں کھلم کھلا مداخلت سے پورے ملک میں بدامنی و بے چینی کی فضا قائم ہوگئی کیوں کہ انگریزوں نے ملک کی سیاسی، سماجی، مذہبی، تہذیبی اور اقتصادی بنیادوں کو اپنی سیاسی سازشوں کے ذریعہ درہم برہم کر ڈالا تھا۔ آخر کار ان حالات نے ایک ایسے طوفان کی شکل اختیار کر لی جو کہ اپنے ساتھ ہندوستانیوں کے لیے بربادی و تباہی اور انگریزوں کے لیے مکمل اختیار اقتدار کی خوش خبری لایا تھا، لیکن ۱۸۵۷ء کی یہ بغاوت ایک اتفاق تھی کیوں کہ یہ غصہ و نفرت کے تحت اُبھری تھی۔ اس کا پہلے سے کوئی مستحکم پلان و منصوبہ نہ تھا اور نہ ہی ہندوستانیوں کے پاس انگریزوں سے مقابلہ کرنے کے لیے مضبوط و مستحکم ہتھیار تھے۔ بس ان کے پاس جوش و ہمت تھی جو کہ وقتی طور پر کام آ گئی تھی، لیکن اس کو دائمی شکل میسر نہ آسکی۔ بلکہ یہ ہنگامہ ہندوستانیوں کے لیے بڑا بھاری ثابت ہوا کیوں کہ اس ہنگامے کے بعد ہندوستانیوں پر انگریزوں کے ظلم و ستم کی کوئی انتہا نہ رہی۔ ان کا یہ ظلم و ستم ایسا تھا کہ جس سے اس زمانے

کے چرند و پرند، حیوان و جانور وغیرہ نے بھی پناہ مانگی۔

دلّی میں آج بھیک بھی ملتی نہیں انھیں
تھا کل تلک دماغ جنھیں تخت و تاج کا

بقول مصحفیؔ:

احوالِ سلاطین لکھوں کیا کہ اب آہ
یعنی کہ مدعیہ اب ان کو لب ناں ہے
فاقوں کی زبس مار ہے بیچاروں کے اوپر
جو ماہ کہ آتا ہے وہ ماہِ رمضاں ہے

غالبؔ نے بھی اپنے ایک خط میں دلّی کی ویرانی کا نقشہ کھینچا ہے:

''دلّی واللہ اب شہر نہیں ہے کیمپ ہے، چھاؤنی ہے۔ نہ قلعہ، نہ شہر، نہ بازار، نہ نہر۔''[۱۷]

غدر کے بعد کے ان مظالم کا حال خود کئی دیانت دار انگریز مورخوں نے ذکر کیا ہے۔ ایک اور انگریز مورّخ نے لکھا ہے کہ:

''ایک مقام پر چھ ہزار ہندوستانیوں کا قتل عام کیا گیا۔ تنہا الٰہ آباد کے علاقے میں نیل نے اتنے ہندوستانیوں کو مروا ڈالا جتنے انگریز مرد، عورت اور بچے اور بوڑھے ہندوستان بھر میں ۱۸۵۷ء کے سارے ہنگامے میں انقلابیوں کے ہاتھوں سے نہیں مرے تھے۔''[۱۸]

ایک انگریز افسر نے لکھا ہے کہ:

''انبالہ سے دہلی تک ہزارہا بے قصور دیہاتیوں کو انگریزوں نے مار ڈالا اور ان

کے جسموں کو سنگینوں سے چھیدا گیا اور ہندوؤں کو منھ میں گائے کا گوشت ٹھونسا جاتا تھا۔''[۱۹]

ٹامس نے لکھا ہے کہ:

''دہلی کے مسلمانوں کو ننگا کر کے پیروں سے باندھ کر سر سے پاؤں تک جلتے ہوئے تانبے کے ٹکڑوں سے اچھی طرح داغ دیا گیا اور مسلمانوں کو سور کی کھالوں میں دبا دیا جاتا تھا۔''[۲۰]

بقول خواجہ حسن نظامی:

''ہزار ہا عورتیں فوج کے خوف کی وجہ سے کنویں میں گر پڑیں یہاں تک کہ پانی سے اوپر ہو گئیں۔ جب زندہ عورتوں کو کنویں سے نکالنا چاہا تو انھوں نے کہا کہ ہمیں گولی مار دو نکالو نہیں۔ ہم شریفوں کی بہو بیٹیاں ہیں ہماری عزت خراب نہ کرو۔ لیکن خوددار مردوں نے اپنی عورتوں کو قتل کر کے خودکشی کر لی۔''[۲۱]

غدر کے بعد انگریزوں کے اس طرح کے ظلم و ستم نے ہر طرف خوف و ہراس کا ماحول پیدا کر دیا تھا، کیوں کہ انھوں نے لوگوں کو صرف موت ہی نہیں دی تھی بلکہ ایسی موت دی تھی جس سے موت بھی تھرا گئی تھی اور اب جو مسلمان باقی بچ بھی گئے تھے تو وہ اب اس لائق نہ رہے تھے کہ زندہ رہ سکیں۔ کیوں کہ اس حادثے کے بعد معاشرہ اور روایتی نظام سب درہم برہم ہو گیا تھا۔ معاشرت کے طور طریقے بدل گئے تھے، صنعت و حرفت میں انقلاب آ چکا تھا۔

ہندوستانیوں کی بغاوت کو کچل دینے کے بعد انگریزوں نے ان سے دل کھول کر انتقام لیا۔ ہر طرف قتل و غارت گری کا بازار گرم کیا۔ لاکھوں بے گناہ مرد، عورت، بوڑھے اور بچوں کو قتل کر کے درختوں پر لٹکا دیا گیا جن کو چیل کوّے نوچ نوچ کر کھا گئے۔ علم و ہنر کے تمام مراکز برباد ہو گئے۔ دلّی جو شان و شوکت

میں اپنی مثال نہیں رکھتی تھی، آج ظلم و بربریت کا شکار ہو کر ویران ہو چکی تھی۔ جامع مسجد سے راج گھاٹ کے دروازہ تک ایسا معلوم ہوتا تھا کہ جیسے بیابان جنگل ہو۔ یہاں پر بربادی اور اینٹوں کے ڈھیر کے علاوہ کچھ نظر نہ آتا تھا۔ کنویں تک لاشوں سے پٹے پڑے تھے۔ بقول ظہیر دہلوی:

گھروں سے کھینچ کے کشتوں پہ کشتے ڈالے ہیں

نہ گور ہے نہ کفن ہے نہ رونے والے ہیں

چنانچہ ۱۸۵۷ء کے غدر نے ہندوستانیوں خاص کر مسلمانوں کو اور بھی زیادہ پست کر دیا تھا۔ انھیں تباہی کے اس اندھیرے غار میں ڈھکیل دیا جہاں مایوسی اور اندھیرے کے سوا کچھ نہ تھا۔ مسلمانوں کی سیاسی، سماجی زندگی بالکل تباہ و برباد ہو چکی تھی اور انگریزوں کا ہندوستانیوں پر مستقل قبضہ ہو چکا تھا۔ انگریزوں نے غدر کے بعد مسلمانوں کو اپنے ظلم و ستم کا نشانہ اس لیے بنایا تھا کیوں کہ انھوں نے ہندوستان کو مسلمانوں کے ہاتھوں سے ہی چھینا تھا۔ لیکن ان سب باتوں کے باوجود علی گڑھ تحریک نے مسلمانوں کی فلاح و بہبود کے لیے بہت بڑا کام کیا۔

سرسید احمد خاں نے مسلمانوں کی قومی ضرورت کو محسوس کرتے ہوئے ان کی سماجی، مذہبی، اخلاقی اور تعلیمی اصلاح کا جو بیڑہ اٹھایا علی گڑھ تحریک اس کی عملی صورت ہے۔ سرسید نے اعلیٰ اور جدید تعلیم ہی کو قوم کے مرض کا اصلی علاج قرار دیا۔ کیوں کہ سرسید غدر سے پہلے کے ہندوستانی سماج سے بھی واقف تھے اور مغربی اثرات کے ساتھ جدید دور کے گہرے نقوش بھی دیکھ رہے تھے۔ ان کی نظر غدر کے بعد کی تباہیوں پر بھی تھی اور وہ مغرب کی ترقیوں اور اس کی لائی ہوئی برکتوں سے بھی آگاہ تھے۔ وہ انگریزی سامراج کی مصلحت اندیشیوں سے بھی واقف تھے۔ سرسید کے آباواجداد ایران کے شہر دامغان سے شاہجہاں کے زمانے میں ہندوستان آئے تھے اور اکبر شاہ ثانی کے زمانے تک مغل خاندان سے منسلک رہے۔ سرسید کے والد میر متقی کا بھی دربار سے خاص واسطہ رہا۔ لہٰذا سرسید بھی اپنے والد کے ساتھ دربار

میں جایا کرتے تھے اور انھیں خلعت بھی ملتا تھا لیکن ۱۸۳۸ء میں اپنے والد کے انتقال کے بعد ہی انھوں نے دربار سے اپنا رشتہ منقطع کر دیا تھا کیوں کہ وہ حکومت کی جھوٹی شان وشوکت کو اچھی طرح بھانپ چکے تھے، اسی لیے انھوں نے دربار کے مقابلے میں انگریزی ملازمت اختیار کرنا بہتر سمجھا۔ اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ سرسید بہت پہلے ہی مسلمانوں کے مستقبل سے آگاہ ہو چکے تھے۔

۱۸۵۷ء کے ہنگامے نے مسلمانوں کی حالت اور بھی بدتر کر دی۔ حالاں کہ اس ہنگامے میں ہندو بھی برابر کے شریک تھے، لیکن انگریزوں نے بغاوت کا محرک کار سب سے زیادہ مسلمانوں کو ہی ٹھہرایا۔ اس طرح ان کی حالت سدھرنے کے بجائے اور بھی زیادہ بگڑ گئی۔ ہر گلی کوچہ اور بازار میں مسلمانوں کا قتل ہوا۔ بے گناہوں کو بھی نہیں بخشا گیا۔ غدر کے ان دردناک مظالم کا بیان خود کئی انگریز مورخوں نے کیا ہے:

> ''بوڑھے آدمیوں نے ہمیں کوئی نقصان نہیں پہنچایا تھا۔ ان سے اور بے کس عورتوں سے جن کی گود میں دودھ پیتے بچّے تھے، ان سے ہم نے اس طرح بدلا لیا جس طرح بڑے بڑے باغیوں سے لیا جاتا ہے۔'' [۲۲]

اس غدر نے مسلمانوں کو مکمل طور پر برباد کر دیا تھا۔ ان کی حالت ہر اعتبار سے مایوس کن تصویر بنی ہوئی تھی۔ مسلمانوں کی حالت اس قدر خراب تھی کہ بقول سرسید احمد خاں:

> ''جس حساب سے یہ تنزل شروع ہوا ہے اگر اس اوسط سے اس کا اندازہ کیا جائے تو معلوم ہوتا ہے کہ چند ہی برس اس بات کو باقی ہیں کہ مسلمان سائیس، خانسامانی، خدمت گزاری، گھس کھودنے کے سوا اور کسی درجہ میں نہ رہیں گے اور کوئی ایسا گروہ جس کو دنیا میں کچھ بھی عزت حاصل ہو، مسلمانوں کے نام سے نہ پکارا جائے گا۔'' [۲۳]

ان حالات سے سرسید کو یہ اندازہ ہوگیا تھا کہ اب مسلمانوں کی حالت کو بہتر بنانے کے لیے کسی تلوار یا ہتھیار کی ضرورت نہیں ہے بلکہ مغربی علوم وفنون سے واقفیت ہی ان کی حالت کو بہتر بنانے میں معاون ہوسکتی ہے۔ جب سرسید ضلع بجنور میں تھے انھیں یہاں پر دو سال چار مہینے ہو چکے تھے تب ہی ۱۰رمئی ۱۸۵۷ء کو دلّی میں بغاوت ہوئی اور ۱۲رمئی کو یہ خبر بجنور پہنچی۔ اس وقت وہاں پر ۲۰ یوروپین مرد، عورت اور بچے موجود تھے۔ سرسید نے ان کی جان بچانا اپنا پہلا فرض سمجھا اور انھیں خیریت کے ساتھ رڑکی پہنچادیا۔

سرسید کو کامل یقین تھا کہ اب انگریزوں کی حکومت ہی ہندوستان کا مستقبل ہے۔ اس لیے جب بجنور میں نواب محمود خاں حاکم تھا تب ہی سرسید دیوانی کا کام اسی طرح انجام دیتے تھے جس طرح انگریزوں کے سامنے کرتے تھے۔ اس کا مطلب یہ تھا کہ وہ عوام کو یہ باور کراتے کہ انگریزی سرکار کا تسلط اور عمل داری بدستور قائم ہے، لیکن یہ بات محمود خاں کو ناگوار گزرتی تھی۔ اس لیے جب اس نے سرسید کو اپنے موافق کرنا چاہا تو سرسید نے کہا کہ:

> ''میں اس بات پر بلاشبہ حلف کرسکتا ہوں کہ میں ہر حال میں تمہارا خیرخواہ رہوں گا اور کسی وقت تمہاری بدخواہی نہ کروں گا۔ لیکن اگر تمہارا ارادہ ملک گیری کا اور انگریزوں سے لڑنے کا ہے تو میں تمہارے ساتھ شریک نہیں ہوں۔''

اس کے بعد سرسید نے قوم کو یاد کر کے کہا کہ:

> ''میں صرف تمہاری خیرخواہی کے لیے کہتا ہوں، آپ اس ارادہ کو دل سے نکال ڈالیں۔ انگریزوں کی عمل داری ہرگز نہیں جائے گی۔ اگر فرض کرلیا جائے کہ تمام ہندوستان سے انگریز چلے جائیں گے تو بھی انگریزوں کے سوا ہندوستان میں کوئی عمل داری نہ کرسکے گا۔ آپ سرکار کی اطاعت کو ہاتھ سے نہ

جانے دیں۔ اگر بالفرض انگریز جاتے رہے تو آپ نواب بنے بنائے ہیں آپ کی نوابی کوئی نہیں چھینتا اور اگر میرا خیال صحیح ہے تو آپ خیر خواہ سرکار بنے رہیں گے، اور سرکار آپ کی نہایت قدر کرے گی۔ اگر آپ مجھ کو انتظام میں شریک کرنا چاہتے ہیں اور صاحب کلکٹر سے اجازت منگا لیجیے اور یہ اقرار کر لیجیے کہ کوئی کام جب تک کہ اس کی منظوری صاحب کلکٹر سے نہ منگا لیں ہرگز نہ کریں گے۔''[۲۴]

اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ محمود خاں نے ناراض ہو کر سرسید سے گھر اور ان کا سارا ساز و سامان چھین کر اپنے افسروں کو دے دیا۔ ہنگامہ تھم جانے کے بعد سرسید نے انگریزی سرکار سے بے گناہ مسلمانوں کی طرف داری کی اور کہا کہ:

''سرکار کے نزدیک باغی صرف وہی لوگ قرار پانے چاہئیں جو اب سرکار سے مقابلہ کے ساتھ پیش آئیں۔ باقی جو لڑائیاں اور فسادات رعایا نے ایک دوسرے سے کیے قانون کی رو سے ان کی نسبت جو کچھ ہو سو ہو مگر ان کی وجہ سے کسی کو سرکار کے مقابلے میں باغی قرار نہیں دیا جا سکتا۔ میرے نزدیک بروقت داخل ہونے سرکاری فوج کے، اگر کوئی مقابلہ نہ کرے اور سب لوگ مع نواب محمود خاں کے حاضر ہو جائیں تو ضلع بجنور کے کسی شخص کو باغی قرار دینا نہیں چاہیے۔''[۲۵]

مظفر نگر میں ۷ر فروری ۱۸۸۴ء میں ایک تقریر کے دوران سرسید نے کہا کہ:

''غدر کے بعد مجھ کو نہ اپنا گھر لٹنے کا رنج تھا، نہ مال و اسباب کے تلف ہونے کا، جو کچھ رنج تھا اپنی قوم کی بربادی کا اور ہندوستانیوں کے ہاتھ سے جو کچھ انگریزوں پر گزرا اس کا رنج تھا۔''[۲۶]

سرسید احمد خاں جیسے حساس دل کے لیے خاموش بیٹھنا باعث ذلت تھا۔ اس لیے انھوں نے غدر کے بعد اپنی زندگی کا تمام حصہ قوم کے نام کر دیا اور اب وہ قوم کی بھلائی کے لیے منصوبے بنانے لگے۔ اس زمانے کے حالات اور قوم کی تباہی کا ذکر دسمبر ۱۸۸۹ء میں علی گڑھ میں منعقد ہونے والے ایجوکیشنل کانفرنس کے چوتھے سالانہ اجلاس میں سرسید نے اس طرح کیا ہے:

''کم بخت زمانہ غدر ۱۸۵۷ء کا ابھی لوگوں کی یاد سے بھولا نہیں ہے.... نامی نامی خاندان تباہ و برباد ہو گئے۔... غدر کے بعد مجھ کو نہ اپنا گھر لٹنے کا رنج تھا نہ مال و اسباب کے تلف ہونے کا۔ جو کچھ رنج تھا اپنی قوم کی بربادی کا اور ہندوستانیوں کے ہاتھ سے جو کچھ انگریزوں پر گزرا اس کا رنج تھا۔ جب ہمارے دوست مرحوم شیکسپیئر نے جن کی مصیبتوں میں ہم اور ہماری مصیبتوں میں وہ شریک تھے، بہ عوض اس وفاداری کے تعلقہ جہاں آباد جو سادات کے ایک نہایت نامی خاندان کی ملکیت تھا اور لاکھ روپیہ سے زیادہ کی ملکیت تھا، مجھ کو دینا چاہا تو میرے دل کو نہایت صدمہ پہنچا... میں نے اس کے لینے سے انکار کیا اور کہا کہ میرا ارادہ ہندوستان میں رہنے کا نہیں ہے۔... جو حال اس وقت قوم کا تھا وہ مجھ سے دیکھا نہیں جاتا تھا۔

..... آپ یقین کیجیے کہ اس غم نے مجھے بڈھا کر دیا اور میرے بال سفید کر دیے، جب میں مرادآباد میں آیا جو ایک بڑا غم کدہ بربادی ہماری قوم کے رئیسوں کا تھا تو اس غم کو کسی قدر ترقی ہوئی۔ مگر اس وقت یہ خیال پیدا ہوا کہ نہایت نامردی اور بے مروّتی کی بات ہے کہ اپنی قوم کو اس تباہی کی حالت میں چھوڑ کر خود کسی گوشۂ عافیت میں جا بیٹھوں۔... میں نے ارادۂ ہجرت موقوف کیا اور قومی ہمدردی کو پسند کیا۔''[۲۷]

ان حالات کے نتیجہ میں انھوں نے ایک ایسی تحریک کی بنیاد ڈالی جس نے انیسویں صدی میں ہندوستانی مسلمانوں کو مستقبل کی طرف نئی روشنی دکھائی۔ ان کی سماجی اور تاریخی حیثیت متعین کی۔ یہ ایک ایسی ہمہ گیر تحریک تھی کہ جس نے دورِ بیداری میں آگے بڑھنا اور وقت کے تقاضوں کو پورا کرنا سکھایا۔ اس تحریک نے مسلمانوں کے واسطے آئینِ نو کی روشنی کے لیے ان کی ذہنی اور سماجی زندگی کے تمام دریچے کھول دیے۔ اس نے تہذیب و تعلیم کے ہر گوشے میں مغرب اور جدید علوم سے مستفید ہونا، جدید کی خوبیوں کو قدیم کے حس میں سمونا سکھایا۔ کیوں کہ انگریزوں کے اقتدار کے بعد مسلمانوں میں آگے بڑھنے کی ہمت اور صلاحیت باقی نہیں رہی تھی بلکہ یہ لوگ آگے بڑھنے سے بدکتے تھے اور اور پیچھے پلٹنا ان کے لیے ممکن نہ تھا۔ لیکن پھر بھی ان کے دلوں میں ماضی کی قدیم عظمت ان کی زندگی کا ایک قدیم سرمایہ بنی ہوئی تھی۔ اس لیے یہ لوگ اپنے ماضی پر ہی ناز کرتے رہتے تھے لیکن اس تحریک نے قدیم بندھنوں کو توڑ کر مغربی اثرات کو قبول کرنے کی دعوت دی۔ نئی تعلیم اور اس کے فوائد کو حاصل کرنے کی ترغیب دی، مادی ترقی سے بہرہ اندوز ہونے، نیز عقلیت کی بنا پر مذہب کو سمجھنے کی کوشش کرنے کی طرف توجہ مبذول کرائی۔ یہ وہ تحریک تھی جس نے پہلی بار شمالی مغربی ہندوستان میں نئے مغربی علوم و سائنس کا چرچا عام کیا۔ انگریزی تعلیم کی ضرورت و اہمیت سے لوگوں کو خاص کر مسلمانوں کو آگاہ کیا۔ اس تحریک نے مسلمانوں پر خصوصی توجہ اس لیے دی تھی کہ مسلمان اس وقت سب سے زیادہ پس ماندگی کی حالت میں مبتلا تھے۔ ہندوؤں کی سیاسی، سماجی، مذہبی اور معاشرتی اصلاح راجہ رام موہن رائے کی تحریک بنگال سے ہو چکی تھی۔ لہٰذا انیسویں صدی کی یہی وہ تحریک تھی جس کو جدید اثرات سے متاثر ہونے والی دوسری اہم کڑی بھی کہا جاتا ہے۔ یہ تحریک پورے ہندوستان کی تاریخی و سماجی ترقی کے لیے ایک اہم سنگ میل کی حیثیت رکھتی ہے۔ اس تحریک نے ہندوستان کی تاریخی کش مکش کے اس پُر آشوب دور میں ہندوستانی قوم کے ایک بڑے حصے کو زندہ رہنا اور ملکی مفاد کے لائق بننا سکھایا۔ سرسید کا خاص اور اہم مقصد مسلمانوں کو سائنس اور ٹکنالوجی سے روشناس کرانا تھا۔ سرسید کی یہ تحریک خالص مسلمانوں کے لیے ہی نہیں تھی بلکہ

ہندوؤں کی اصلاح کے لیے بھی تھی۔ بس فرق اتنا تھا کہ ہم وطنوں کی اصلاح راجہ رام موہن رائے بہت پہلے کر چکے تھے، اس لیے وقت اور حالات نے اس کا رُخ مسلمانوں کی طرف موڑ دیا تھا۔

سرسید احمد خاں نے ہندوؤں اور مسلمانوں میں کبھی تفریق نہیں کی تھی۔ ایک موقع پر انھوں نے اس طرح کہا تھا کہ:

> ''میں ہندوؤں اور مسلمانوں کو مثل اپنی دونوں آنکھوں کے سمجھتا ہوں۔ لفظ قوم سے میری مراد ہندو اور مسلمان دونوں سے ہے۔ یہی وہ معنی ہیں جس میں، میں لفظ نیشن کی تعبیر کرتا ہوں۔''[۲۸]

۱۸۵۷ء کی ناکامی نے سرسید کو اس نتیجہ پر پہنچایا کہ ہندوستانیوں کے لیے ایک ایسی درس گاہ قائم کرنی چاہیے جہاں تمام مغربی علوم اور انگریزی کی اعلیٰ تعلیم کے ساتھ ساتھ مذہبی تعلیم بھی دی جائے اور مفید مشرقی علوم بھی سکھائے جاسکیں۔ جہاں تعلیم ہی نہیں ذہنی و اخلاقی تربیت اور محبت و اخوت کا سبق بھی دیا جاسکے۔ لہٰذا یہی خاکہ ذہن میں لے کر انھوں نے مدرسۃ العلوم کے قیام کے لیے ہر ممکن کوشش کی۔ سرسید کی بلند شخصیت کا اندازہ اس تحریر سے لگایا جاسکتا ہے۔ لکھتے ہیں:

> ''ہم کو خدا نے دنیا میں اس لیے پیدا کیا ہے کہ سب کی بھلائی چاہیں، برائی کرنے والوں کی برائی سے ہم کو کیا کام ہے۔ ہم کو اپنا دل اپنا کام اپنی زبان بھلی رکھنی چاہیے۔ برائی کرنے والوں پر افسوس کرنا چاہیے۔ میرے نزدیک منشی کی کسی بات کے درپے ہونا نہیں چاہیے۔ خدا کی دنیا میں بہت مختلف قسم کی خلقت ہے، ہر ایک اپنا کام کرتا ہے۔ تم اپنا کام کرو مگر جان لو کہ تمہارا کام کای ہے۔ نیکی، بھلائی اور اپنے کام۔ سے مطلب دوسرے کے کام سے کچھ غرض نہیں، جس سے دل روکا ہے اس سے مت ملو کیوں کہ اس سے مل کر خوشی نہ ہوگی یا منافقانہ طریقہ پر ظاہرداری کرنی پڑے گی۔''[۲۹]

سرسید کے ذہن میں تعلیم وعلم کا بہت وسیع مفہوم تھا اسی لیے انھوں نے انفرادی تعلیم پر تنقید کرتے ہوئے قومی تعلیم کا تصور پیش کیا۔ انھوں نے انفرادی تعلیم پر اعتراض کرتے ہوئے کہا کہ:

''جس وقت اولاد کی تربیت کا ذکر آتا ہے تو رئیسوں اور دولت مندوں کے دل میں یہ خیال پیدا ہوتا ہے کہ ہم اپنی اولاد کی تعلیم خاص اپنے اہتمام سے اور ہر ایک علم کے عالم نوکر رکھ کر بخوبی کر سکتے ہیں۔ بعضوں کے دل میں یہ خیال پیدا ہوتا ہے کہ ہم کو اپنی ہی اولاد کی تعلیم وتربیت کی فکر کرنی کافی ہے۔ مگر یہ ایک بڑی غلطی ہے اور خود اولاد کے ساتھ دشمنی کرنی ہے، جہالت اور ناتربیتی وبا کی مانند ہوتی ہے۔ جب تک تمام شہر اس بدہوا سے پاک نہ ہو، کوئی ایک گھر اپنے تئیں اس سے بچا نہیں سکتا۔''[۳۰]

اس کے علاوہ سرسید نے تمام قدیم رسم ورواج اور ان علوم پر بھی کھل کر تنقید کی جنھوں نے مسلمانوں کو بے حس، بے عمل بنا دیا تھا۔ انھوں نے طرح طرح سے لوگوں کو سمجھانے کی کوشش کی کہ اپنے اندر نئے زمانے کے تقاضوں کو قبول کرنے کی صلاحیت پیدا کرو، لکیر کے فقیر بن کر مت بیٹھو۔ اسی سلسلے میں ایک مرتبہ پٹنہ میں تقریر کرتے ہوئے کہا کہ:

''تم اپنے بزرگوں کے حال سے مقابلہ کرو۔ آپ کے بزرگ جس زمانے میں تھے انھوں نے اپنے تئیں اس زمانے کے لائق بنا لیا تھا، اس لیے وہ دولت اور حشمت اور عزت سے نہال تھے اور جس زمانے میں کہ ہم میں ہم نے اپنے تئیں اس زمانے کے لائق نہیں بنایا۔ اس لیے نکبت اور ذلت میں ہیں۔''[۳۱]

اس طرح سرسید نے علم کے پرانے تصور کو رد کیا، ان کے ذہن میں علم قومی ترقی کا راستہ اور معاشی بہبود کا ایک ذریعہ تھا۔ وہ چاہتے تھے کہ علم ایک ذہنی عیاشی نہ ہو، بلکہ سماج کی بہتری اس کا نصب العین

اور مطمح نظر ہو۔ ایک جگہ سرسید نے کہا تھا کہ:

''ہمارے بزرگوں کو نہایت آسانی تھی کہ مسجدوں اور خانقاہوں کے حجروں میں بیٹھے بیٹھے قیاسی مسائل کو قیاسی دلائل سے اور عقلی کو عقلی براہین سے توڑتے پھوڑتے رہیں اور ان کو تسلیم نہ کریں۔ مگر اس زمانے میں نئی صورت پیدا ہوئی ہے جو اس زمانے کے فلسفہ اور تحقیقات سے بالکل علیحدہ ہے اور مسائل طبعی تجزیہ سے ثابت کیے جاتے ہیں۔ یہ مسائل ایسے نہیں جو قیاسی دلائل سے اٹھائے جائیں۔''[۳۲]

قدیم طریقۂ تعلیم کے متعلق سرسید نے اپنی ایک اور تقریر میں کہا کہ:

''مسلمانوں میں کچھ تعلیمی تحریک ہوتی ہے تو ان کی سعی ہمیشہ اسی بات پر مرکوز ہوتی ہے کہ وہی پرانا موروثی طریقۂ تعلیم کا اور وہی ناقص سلسلہ نظامیہ درس کتب کا اختیار کیا جاتا ہے۔ چنانچہ اس زمانے میں اسی پرانے طریقہ پر مسلمانوں کے کئی مدرسے تعلیم کے لیے جون پور، علی گڑھ، سہارن پور، کان پور، دیوبند، دہلی و لاہور میں جاری کیے ہیں۔ میں نہایت سچے دل سے کہتا ہوں کہ وہ محض بے فائدہ اور محض لغو ہیں ان سے کچھ بھی قومی فائدہ ہونے کی توقع نہیں۔''[۳۳]

سرسید نے قوم کی بھلائی جدید تعلیم کو حاصل کرنے میں ہی دیکھی تھی لیکن قوم اس وقت اپنے فرسودہ رسم و رواج اور فرسودہ تعلیم کو کسی بھی طرح چھوڑنے پر راضی نہ تھی۔ سرسید نے قوم کی اس حالت پر افسوس کرتے ہوئے ایک جگہ لکھا تھا کہ:

''ایسے ایسے مدرسوں سے کوئی فائدہ نہیں ہے۔ افسوس ہے کہ مسلمان ہندوستان کے ڈوبے جاتے ہیں اور کوئی ان کو نکالنے والا نہیں۔ ہائے افسوس!

امرت تھوکتے ہیں اور زہر نگلتے ہیں۔ افسوس! ہاتھ پکڑنے والے کا ہاتھ جھٹک دیتے ہیں اور مگرمچھ کے منھ میں ہاتھ دیتے ہیں۔ مرجھائے ہوئے درخت کی جڑ میں پانی دینے کے بجائے اس کے پتوں پر پانی چھڑکتے ہیں اور سوکھے ہوئے چشموں سے نہریں کھود کر پانی لانے کی توقع کرتے ہیں۔ پچھلا طریقۂ تعلیم واقعی بہت اچھا تھا لیکن وہ تیلیاں جس ڈور سے بندھی تھیں ٹوٹ گیا اور اب دوسرا ڈوران کے باندھنے کو ہونا چاہیے۔''[۳۴]

غرض یہ کہ سرسید قدیم تعلیم کے بجائے جدید تعلیم کی حمایت میں جی جان سے لگ گئے۔ وہ اچھی طرح جانتے تھے کہ جدید تعلیم ہی قوم کو اس تاریک گڑھے سے نکال سکتی ہے جس میں وہ دن بہ دن گرتی چلی جارہی ہے۔ سرسید نے انگریزی ملازمت کے دوران ہی قوم کی کمزوری اور اس کی بدحالی پر غور وفکر کرنا شروع کردیا تھا، لیکن ابھی انھیں سہی راستہ نہیں مل پارہا تھا، کہ اسی کش مکش کے دوران انھیں انگلستان جانے کا موقع ملا۔ وہ اس موقع کو چھوڑنا نہیں چاہتے تھے اسی لیے انھوں نے اپنا سارا اثاثہ بیچ ڈالا یہاں تک کہ اپنا مکان بھی فروخت کرڈالا۔ سرسید وہاں گھومنے پھرنے نہیں گئے تھے بلکہ وہاں کی ہر چیز کو دیکھ کر وہ اپنی قوم کے بارے میں سوچتے۔ غرض یہ کہ انھوں نے وہاں کے سفر سے سبق اور نصیحت حاصل کی۔ سرسید وہاں ایک سال تک مقیم رہے۔ وہیں پر ان کے دل میں یہ خیال پیدا ہوگیا تھا کہ ہندوستان میں ایک تعلیمی درس گاہ بنائی جائے، کیوں کہ کیمبرج یونیورسٹی کے طرزِ تعلیم پر غور کرتے ہوئے اسی طرز پر اعلیٰ تعلیم کے لیے درس گاہ کا خاکہ ذہن میں بنایا تھا، تاکہ ہندوستان لوٹنے پر اسی طرز کی درس گاہ یہاں قائم کرسکیں جس میں اعلیٰ مغربی تعلیم کے ساتھ ساتھ مسلمانوں کی دینی تعلیم اور ان کی خصوصی ضروریات تعلیم پر بھی نظر رکھی جائے تاکہ عام مسلمانوں کو مغربی تعلیم کی طرف توجہ اور رغبت پیدا ہو اور وہ پوری طرح اس سے مستفید ہوسکیں۔

سرسید بڑے ہی غور وخوض کے بعد اس نتیجہ پر پہنچے کہ اعلیٰ تعلیم ہی وہ بنیادی چیز ہے جس کے ساتھ سماج میں ہر طرح کی خوبیاں پیدا ہونے لگتی ہیں اور جس کے نتیجے میں قومیں ترقی کی منزلیں طے کرتی ہیں۔ لہٰذا انھوں نے اپنے اصلاحی خاکہ میں عملی طور پر اسی کو مرکز بنایا اور انگلینڈ سے واپسی کے بعد ہی اپنی پوری توجہ اس طرف مرکوز کردی۔ واپس آنے کے بعد سب سے پہلے انھوں نے ۱۸۷۰ء میں تہذیب الاخلاق کا پہلا شمارہ جاری کیا۔ اس رسالہ کے شائع کرنے کا مقصد سوئی ہوئی قوم کو جگانا تھا۔ قوم سے مراد ہندو اور مسلم دونوں ہی تھے۔ ایک مرتبہ سرسید نے قومیت کی وضاحت ان پر جوش الفاظ میں کہی کہ:

> ''یوروپین مختلف خیالات اور مختلف مذاہب کے ہیں مگر سب ایک قوم میں شمار ہوتے ہیں۔ گو ان میں دوسرے ملک کے بھی لوگ آکر بس جاتے ہیں مگر وہ آپس میں مل جل کر ایک ہی قوم کہلاتے ہیں۔ غرض کہ قدیم سے قوم کا لفظ ملک کے باشندوں پر بولا جاتا ہے، گو ان میں بعض بعض خصوصیتیں بھی ہوتی ہیں۔ اے ہندو اور مسلمانو! کیا تم ہندوستان کے سوا اور ملک کے رہنے والے ہو؟ کیا اس زمین پر تم دونوں نہیں بستے؟ کیا اس زمین میں تم دفن نہیں ہوتے ہو یا اسی زمین کے گھاٹ پر جلائے نہیں جاتے؟ اسی پر مرتے ہو اسی پر جیتے ہو، یاد رکھو کہ ہندو مسلمان اور عیسائی جو اسی ملک میں رہتے ہیں اس اعتبار سے سب ایک ہی قوم ہیں۔ جب یہ سب گروہ ایک ہی قوم کہے جاتے ہیں تو ان سب کو ملکی فائدے میں جو ان سب کا ملک کہلاتا ہے ایک ہونا چاہیے۔''[۳۵]

لہٰذا علی گڑھ تحریک کے وجود میں آنے کا سب سے اہم سبب قوم کی پست حالت تھی۔ اُنیسویں صدی کی اس تحریک نے مری ہوئی قوم میں جان ڈالی۔ اس سے پہلے کی تمام تحریکیں خالص مذہبی

تھیں لیکن علی گڑھ تحریک نے مذہب کے ساتھ ساتھ جدید تقاضوں کو بھی اپنایا۔ اس سے پہلے قوم مغربی علوم سے کوسوں دور بھاگتی تھی، کیوں کہ اس کے ذہن و دل پر قدیم تعلیم چھائی ہوئی تھی۔ لیکن سرسید نے اپنی تحریروں اور تقریروں کے ذریعہ اس کو اس روایتی بندھن سے آزادی دلائی۔ ایک جگہ کہتے ہیں کہ:

''کیا تم خیال کرتے ہو کہ ایسی کتابوں سے جن میں صرف یہ بات لکھی ہو کہ فلاں سنہ میں فلاں بادشاہ ہوا اور فلاں سنہ میں مر گیا۔ انسان کے اخلاق کی درستی اور قومی تربیت ہو سکتی ہے؟ نہیں، صاحبو! ہرگز نہیں ہو سکتی جب تک کہ ایک قوم کے اخلاق اور اس کی بھلائیاں اور برائیاں تفصیل سے بتائی جاویں اور طرح طرح کی تقریروں اور مباحثوں سے ان کی بھلائی برائی ظاہر نہ کی جاوے دل میں اثر نہیں ہوتا۔''[۳۶]

سرسید نے مغربی تعلیم کے فوائد کو بخوبی سمجھ لیا تھا۔ امرت سر کے ٹاؤن ہال میں ''اتحاد باہمی'' پر تقریر کرتے ہوئے کہا کہ:

''اگر گورنمنٹ نے ہمارے حقوق اب تک ہمیں نہیں دیے ہیں تو ہائی ایجوکیشن وہ چیز ہے کہ خواہ نہ خواہ طوعاً کرہاً ہم کو دلا دے گی۔''[۳۷]

جدید تعلیم کی تعریف کرتے ہوئے سرسید نے کہا کہ:

''دوستو! یہ نہ کہنا کہ مجھ کو اس انگریز کے مانند جس کو صرف اموہ رنگ ہی آتا ہے۔ اموہ رنگ ہی آتا ہے، مگر میں سچ کہتا ہوں کہ جو چیز تم کو اعلیٰ درجہ پر پہنچانے والی ہے وہ صرف ہائی ایجوکیشن ہے۔ جب تک ہماری قوم میں ایسے لوگ پیدا نہ ہوں گے ہم ذلیل رہیں گے اور ان سے پست رہیں گے اور عزت کو نہیں پہنچیں گے جس پر پہنچنے کو ہمارا دل چاہتا ہے۔''[۳۸]

تعلیم کے معاشی اور سیاسی فائدے بھی ان کے پیش نظر تھے۔ کہا کرتے تھے کہ:

''وہ ملک دولت مند نہیں ہوتا جس میں دوسرے ملک کی چیزوں کی تجارت ہوتی ہے بلکہ وہ ملک دولت مند ہوتا ہے جس کی چیزوں کی تجارت دوسرے ملکوں میں ہوتی ہے۔ ہم کو چاہیے کہ دوسرے ملکوں میں آڑھ اور کمپنیاں قائم کریں اور ملک کی پیداوار اور قدرتی چیزوں سے جو زمین میں گری پڑی ہیں ان سے فائدہ اٹھاویں۔''[۳۹]

سرسید نے غدر کے حالات سے یہ نتیجہ نکالا کہ مسلمانوں کو سیاست سے دور ہی رہنا چاہیے کیوں کہ انگریز ان کو اپنا سب سے بڑا دشمن سمجھتے تھے۔ اس بات کا اندازہ اس تحریر سے ہوتا ہے جو کہ گورنر جنرل لارڈ النبرا نے ڈیوک آف ولنگٹن کو ایک خط میں لکھا تھا کہ:

''مجھے اچھی طرح ثابت ہوگیا ہے کہ خاص وہ لوگ جن کی گزر ہمارے ہی ٹکڑوں پر ہے، وہ دل سے ہمارے بدخواہ تھے۔ بہ خلاف اس کے ہندو ہماری فتح پر اظہار مسرت کررہے ہیں۔ جب ہمیں ان مسلمانوں کی دشمنی کا یقین کامل ہے جن کی تعداد ۱/۱۰ ہے تو پھر کیوں نہ ہم اس قوم کا ساتھ دیں جن کی تعداد ۹/۱۰ ہے اور جو ہماری وفادار ہے۔''[۴۰]

انھیں حالات کے پیش نظر سرسید نے مسمانوں کو سیاست سے ہمیشہ دور رہنے کی تلقین کی۔ ان کے اس خیال میں جواہر لال نہرو بھی ہم خیال رہے:

''پنڈت جواہر لال نہرو کا خیال تھا کہ سیاست سے علاحدہ رہ کر تعلیم پر توجہ مرکوز کرنا سرسید کی فکر کی ''صحیح انقلابی سمت'' کو ظاہر کرتا ہے۔ اگر سرسید کچھ عرصہ اور زندہ رہتے اور ان کی حیات میں مسلمان تعلیمی میدان میں کچھ ترقی

کر گئے ہوتے تو وہ خود مسلمانوں کو سیاسی جدوجہد میں شریک ہونے کا مشورہ دیتے۔"[۴۱]

غرض یہ کہ علی گڑھ تحریک نے اپنی اہم خدمات کے سبب مسلم قوم میں ایک نیا جوش وجذبہ پیدا کیا اور ہمت واستقلال کو بیدار کیا اور اسے اس قابل بنایا کہ وہ ہر چیلنج کا بہ خوبی مقابلہ کر سکے۔

OOO

حواشی:

۱۔ مسلمانوں کا روشن مستقبل۔ طفیل احمد منگلوری، ص:۳۲، بحوالہ: قدسیہ خاتون، سرسید کی ادبی خدمات اور ہندوستانی نشاۃ ثانیہ، ص:۸۸

۲۔ ایضاً۔

۳۔ ملک فضل الدین، سرسید کے مضامین تہذیب الاخلاق (لاہور ۱۳۲۳ھ)، ص:۵۳۷ بحوالہ: اختر الواسع۔ سرسید کی تعلیمی تحریک، ص ص:۱۴۔۱۵

۴۔ ایضاً۔ ص ص:۱۳۔۱۴

۵۔ ایضاً۔

۶۔ خطوطِ سرسید، مرتبہ: سر راس مسعود، بدایوں، ۱۹۲۲ء، ص:۳۹

۷۔ سرسید کے سیاسی افکار۔ فوق کریمی، ص:۴۱

۸۔ ایضاً۔

۹۔ ایضاً۔ ص:۴۲

۱۰۔ سرسید احمد خاں اور علی گڑھ تحریک کے ناقدین کا تحقیقی جائزہ۔ سید محبوب شاہ، ص:۳۰

۱۱۔ ایضاً۔ ص:۳۱

۱۲۔ سرسید اور مغرب کے تہذیبی اور ادبی اثرات آل احمد سرور، ص:۵۹

۱۳۔ سرسید کے سیاسی افکار۔فوق کریمی،ص:۶۲

۱۴۔ ایضاً۔

۱۵۔ سرسیداور ہندوستانی مسلمان۔نورالحسن نقوی،ص:۵۱

۱۶۔ ایضاً۔

۱۷۔ سرسید کے سیاسی افکار۔فوق کریمی،ص:۷۶

۱۸۔ ایضاً۔

۱۹۔ ایضاً۔

۲۰۔ ایضاً۔

۲۱۔ ایضاً۔

۲۲۔ ایضاً۔

۲۳۔ ایضاً۔

۲۴۔ بحوالہ:لکچروں کا مجموعہ وتقریر۔بہ مقام عظیم آباد،پٹنہ،۲۶رمئی ۱۸۷۳ء،ص:۴۰

۲۵۔ حیات جاوید۔الطاف حسین حالی،دہلی،۱۹۷۹ء،ص:۸۰

۲۶۔ ایضاً۔

۲۷۔ آثارالصنادید،پہلا ایڈیشن۔ص:۴۳تا۴۷

۲۸۔ مدرسۃ العلوم علی گڑھ کے تاریخی حالات،۱۸۴۔۲۴۵ مقالات سرسید۱۱۲تقریری مقالات لاہور مجلس ترقی ادب، ۱۹۶۳ء،ص ص:۱۸۴۔۱۸۵

۲۹۔ ''سرسید کی ادبی خدمات اور ہندوستانی نشاۃ ثانیہ''۔قدسیہ خاتون،ص:۷۷

۳۰۔ سرسید کی ادبی خدمات اور ہندوستانی نشاۃ ثانیہ۔قدسیہ خاتون،ص:۱۹۳

۳۱۔ سرسید کے سیاسی افکار۔نظامی خلیق احمد،ص:۴۴

۳۲۔ ایضاً۔ص:۶۴

۳۳۔ ایضاً۔ص:۶۷

۳۴۔ سرسید کی ادبی خدمات اور ہندوستانی نشاۃ ثانیہ۔قدسیہ خاتون،ص:۸۱

۳۵۔ سرسید کا اصلاحی مشن۔توقیر احمد فلاحی،ص:۹۸

۳۶۔ سرسید اور علی گڑھ تحریک۔نظامی خلیق احمد،ص:۱۷۶

۳۷۔ ایضاً۔ص:۱۴۹

۳۸۔ ایضاً۔ص:۱۸۹

۳۹۔ سرسید اور ہندوستانی مسلمان۔نورالحسن نقوی،ص:۱۰۹

۴۰۔ سرسید اور علی گڑھ تحریک۔نظامی خلیق احمد،ص:۱۸۷

۴۱۔ سرسید اور ہندوستانی مسلمان۔نورالحسن نقوی،ص:۸۲

علی گڑھ تحریک کی فکری اساس

ہندوستان کی تاریخ میں ۱۸۵۷ء ایسا سال ہے جس نے تخریب کے ساتھ ساتھ تعمیر کو دعوت دی۔ یہ تاریخ دراصل ایک محرک شے کی صورت میں سامنے آئی کیوں کہ اس نے جلد ہی اس کش مکش کا فیصلہ کر دیا جس کی وجہ سے ہندوستانی اپنی شناخت کھو چکے تھے، لیکن جلد ہی اس تاریخ نے انگریزوں اور ہندوستانیوں کو اپنی اپنی جگہ قائم کر دیا۔ اس تاریخ نے آئینے کا کام کیا۔ ۱۸۵۷ء کے ہنگامے کے بعد انگریزوں کی حکومت نے مستقل شکل اختیار کر لی اور ہندوستانیوں کو بھی ان کی اصلی شکل یعنی کہ ان کی پوشیدہ برائیوں اور کمزوریوں سے آگاہ کر دیا۔

ہندوستانیوں کی بدقسمتی یہ تھی کہ وہ برطانوی استحکام اور اپنے زوال کے باوجود اپنی آٹھ سو سال کی حکومت کو فراموش نہیں کر پا رہے تھے۔ وہ اب بھی اپنے فرسودہ نظام تعلیم اور بے ہودہ رسم و رواج کے اسیر تھے۔ سرسید کو انگلستان جا کر مسلمانوں کی زبوں حالی پر اور بھی زیادہ افسوس ہوا۔ وہیں سے محسن الملک کو خط میں اس طرح لکھا کہ:

> ''افسوس کہ مسلمان ہندوستان کے ڈوبے جاتے ہیں اور کوئی ان کا نکالنے والا نہیں۔.... ہائے افسوس! ہاتھ پکڑنے والے کا ہاتھ جھٹک دیتے ہیں اور مگرمچھ کے منھ میں ہاتھ دیتے ہیں..... مسلمانوں کے ہونٹوں تک پانی آ گیا ہے، اب ڈوبنے میں بہت ہی کم فاصلہ باقی ہے۔''[1]

خاص طور سے ۱۸۵۷ء مسلمانوں کے لیے ایک ناگہانی مصیبت ثابت ہوئی۔ اس وقت ان کی حالت نیم بسمل مرغ کی طرح تھی۔ حالاں کہ انگریزوں کے خلاف بغاوت میں ہندو بھی مسلمانوں کے ساتھ ساتھ برابر کے شریک تھے، لیکن انگریزوں نے بغاوت کا اصل ذمہ دار مسلمانوں کو ٹھہرایا۔ انگریز انھیں اپنا سب سے بڑا دشمن تصور کرتے تھے۔ انھیں اچھی طرح معلوم تھا کہ ملک مسلمانوں کے ہاتھوں سے چھینا گیا ہے اس لیے کبھی بغاوت ہوئی تو انھیں کی طرف سے ہوگی۔ اس کے علاوہ انھوں نے ہندوستانیوں میں ''پھوٹ ڈالو اور حکومت کرو'' والی پالیسی پر عمل کیا تھا اور ہندوؤں نے بھی اپنی دوراندیشی کی بدولت انگریزوں کی طاقت کو محسوس کرتے ہوئے بے بس مغل حکومت سے کنارہ کشی اختیار کر کے انگریزوں سے ہاتھ ملانے میں ہی اپنی بھلائی سمجھی، لیکن مسلمان کسی بھی طرح انگریزوں کے اس تسلط کو قبول نہیں کر رہے تھے۔ انھیں اب بھی اپنی کمزور اور لاچار مغل حکومت پر پورا بھروسا تھا۔ یہی وجہ ہے کہ سب کچھ ختم ہونے کے بعد بھی وہ اپنے فرسودہ طریقۂ تعلیم اور بے جا رسم و رواج کو خیرباد نہیں کر پا رہے تھے۔ سرسید لکھتے ہیں کہ:

> ''اس وقت ہندوستان کے مسلمانوں کا یہ حال ہے کہ امور معاش و تمدن و حسن معاشرت اور علم کی ابتری و خرابی کے سبب روز بروز خراب و ذلیل و حقیر و برباد ہوتے جاتے ہیں اور یہ واعظ و مولوی اور پیر جی خدا اور رسول کے دشمن ان کو روز بروز برباد و تباہ کرتے جاتے ہیں۔''[۲]

اس زمانے میں مسلمانوں کی مثال ایک ایسی جوان بیوہ کی سی تھی کہ جو اپنی کم عمری میں ہی زندگی کی تمام آسائشوں اور آرائشوں سے محروم ہو چکی تھی، لیکن ساتھ ہی ساتھ اس نے زندہ رہنے کی تمام خواہشات کو ایک محدود دائرے میں جکڑ کر رکھ دیا تھا۔ حالاں کہ وہ بھی نئے دور کے چوڑی، کنگن، مہندی، سرمہ وغیرہ سے اپنے آپ کو آراستہ کرنا چاہتی تھی لیکن مذہب کی رو سے اس طرح سجنے سنورنے کو گناہ

خیال کرتی تھی۔لیکن اس کے برعکس دوسری قومیں زندگی کے ہر اسٹیج پر اپنا کردار ادا کر رہی تھیں یعنی انھیں وقت اور حالات کا سامنا کرنا بہ خوبی آتا تھا۔مسلمانوں کے فرسودہ رسم ورواج کے خلاف سرسید لکھتے ہیں:

''اسلام میں وہ سب سچی باتیں ہیں جو کہ دنیا کی ترقی کو حاصل کرنے والی اور انسانیت اور تہذیب اور رحم دلی کو کمال پر پہنچانے والی ہیں مگر ہم کو اپنی بہت سی رسوم و عادات کو جو اگلے زمانے میں مفید تھیں مگر حال کے زمانے میں نہایت مضر ہوگئی ہیں، چھوڑنا چاہیے۔''[۳]

اسی طرح:

''سرسید نے کہا کہ اس کلیے کا اطلاق دنیا کی تمام ان قوتوں پر ہوتا ہے جو ایک زمانے میں عروج پر تھیں اور بعد میں زوال آمادہ ہوگئیں۔انھوں نے کہا کہ دینی احکام اور دنیاوی مسائل کی نوعیت الگ ہے۔ان کا خیال تھا کہ دینی امور کا تعلق روحانی اخلاق اور روحانی تہذیب سے ہے جس میں کسی طرح کی تبدیلی رونما نہیں ہوتی ہے۔اس کی وجہ یہ بیان کرتے ہیں کہ خدا نے انسان کی روح کو جس نیچر پر پیدا کیا ہے، جب تک انسان دنیا میں ہے اس کو تغیر وتبدل نہیں۔لیکن اس کے برعکس دنیاوی مسائل اور تہذیب، وتمدن ہر وقت تغیر پذیر ہیں۔اس لیے دنیوی مسائل کو دینی احکام میں شامل کرنا تنزل کا موجب ہوسکتا ہے۔سرسید نے کہا کہ: دنیا آگے بڑھتی چلی جاتی ہے اور ہم اسی پرانی لکیر کے فقیر بنے رہتے ہیں اور ذلت وادبار کو پہنچتے ہیں۔''[۴]

سرسید لکھتے ہیں کہ:

''طریق تمدن ومعاشرت روز بہ روز انسانوں میں ترقی پاتا جاتا ہے اور اس

لیے ضرور ہے کہ ہماری رسمیں اور عادتیں جو بہ ضرورت تمدن و معاشرت مروّج ہوتی تھیں ان میں بھی روز بروز ترقی ہوتی جاوے اور اگر ہم اپنی ان پہلی ہی رسموں اور عادتوں کے پابند رہیں اور کچھ ترقی نہ کریں تو بلاشبہ بہ مقابل ان قوموں کے جنھوں نے ترقی کی ہے ہم ذلیل اور خوار ہوں گے اور مثل جانوروں کے خیال کیے جاویں گے۔''[۵]

مسلمانوں کے زوال کی وجہ بتاتے ہوئے لکھتے ہیں کہ:

''ان کا اپنی فطری صلاحیتوں اور قوتوں کا استعمال نہ کرنا اور رسوم کی پابندی میں جکڑے رہنا تھا۔ انھوں نے کہا کہ جس معاشرے کی تہذیب پرانے اور روایتی رسم و رواج پر مبنی ہوگی وہاں انسان اپنی فطری صلاحیتوں کو جو خدا تعالیٰ نے ہر آدمی کو جدا جدا عنایت کی ہیں بروئے کار نہیں لاسکتا اور ان کی ترقی ممکن نہیں۔ ان کا خیال تھا کہ یہی وہ فطری صلاحیتیں اور قوتیں ہیں جن کے ذریعہ اخلاقی اور تہذیبی حسن و قبح میں امتیاز کیا جاتا ہے اور انسان کی عقلی اور علمی استعداد میں ترقی ہوتی ہے۔''[۶]

ہندو قوم میں یہ ہمت راجہ رام موہن رائے کی تحریک سے آئی تھی۔ حالاں کہ اس قوم میں بھی قدیم تعلیم کا رواج تھا لیکن جب راجہ رام موہن رائے نے تحریک کا آغاز کیا تو اس قوم نے ان کا پورا پورا ساتھ دیا اور جلد ہی قوم جدید تعلیم کی طرف مائل ہوگئی۔

مسلمان اس تعلیم سے کوسوں دور بھاگتے تھے، اس سے نفرت کرتے تھے۔ وہ سمجھتے تھے کہ یہ تعلیم ہمیں مذہب سے دور کردے گی۔ اس لیے اب ضرورت اس بات کی تھی کہ کوئی ایسا علاج تلاش کیا جائے جس سے مسلمانوں کی اس بیماری کو نیست و نابود کیا جاسکے۔ لہٰذا اس بیماری کے علاج کے لیے ایک

ایسے ڈاکٹر کی ضرورت تھی جو اپنی جان سے زیادہ مریض کی فکر کرے، جو ایمان دار اور مخلص، وفادار اور ہمدرد ہو اور اپنے مریض کو موت کے منھ سے باہر لانے میں اپنے دن رات ایک کر دے۔ غرض کہ اس بیماری کے معالج سر سید احمد خاں اور دو اعلیٰ گڑھ تحریک کی شکل میں وجود میں آئی۔

سر سید احمد خاں شروع سے ہی مسلمانوں کی اس ابتر حالت کا بڑے غور و فکر سے مطالعہ کر رہے تھے۔ انھیں مسلمانوں کی حالت کو دیکھ کر بڑا دکھ ہوتا تھا، وہ دن رات ان کے بارے میں سوچتے رہتے تھے کہ کس طرح مسلمان قوم کو اس دلدل سے باہر نکالا جائے۔

سر سید کو پورا یقین تھا کہ انگریز اس ملک سے جانے والے نہیں ہیں۔ ۱۸۵۷ء کی ناکامی نے ان کے اس یقین کو اور بھی پختہ کر دیا۔ سر سید نے بارہا مسلمانوں سے مخاطب ہو کر کہا کہ:

> ''برطانوی تسلط کا سیلاب رکنے والا نہیں لہٰذا حکومت وقت کی خیر خواہی اور مصلحت سے ہی کوئی اور امید افزا صورت پیدا ہو سکتی ہے۔''[۷]

اب وقت کا تقاضا یہ تھا کہ ہندوستانیوں کو یا تو انگریزوں کے ہاتھوں فنا قبول کرنی تھی یا پھر ان کے آگے گھٹنے ٹیک کر ذلت و خواری کی زندگی بسر کرنے پر آمادہ ہونا تھا، لیکن سر سید کو ہندوستانیوں کی یہ ذلت کسی بھی طرح گوارا نہ تھی۔ لہٰذا انھوں نے ایک ایسی تحریک کی بنیاد ڈالی جو ہندوستانیوں کو اپنی خودی پہچاننے میں مددگار و معاون ثابت ہو سکے۔

تحریک کے آغاز میں سر سید ہندو اور مسلم دونوں قوموں کو ساتھ لے کر چلے لیکن جب وہ اس راز سے اچھی طرح واقف ہو گئے کہ ہندوؤں میں مسلمانوں کے خلاف نفرت کا بیج اب خوب پھل پھول گیا ہے تو انھوں نے اسی میں بہتری سمجھی کہ مسلمانوں کی اس موجودہ حالت کو بہتر بنایا جائے۔ جس کی وجہ سے وہ اپنے ہی بھائیوں کی نظر میں حقیر بن گئے ہیں۔

غرض کہ اب سر سید کا اہم مقصد صرف ہندوستانی مسلمانوں کی فلاح و بہبود تھا جو کہ بُری طرح سے انگریزوں کی ناراضگی کا شکار بنے ہوئے تھے۔

اس زمانے میں مسلمانوں میں چند بڑی بڑی خامیاں موجود تھیں جن کی اصلاح کیے بغیر مسلمانوں کا ہندوستان میں رہنا محال تھا۔ مثلاً:

(۱) یہ لوگ اپنے تعصب کی وجہ سے ترقی کے میدان میں پیچھے تھے۔

(۲) تعلیم کی کمی تھی اور تعلیم کے نام پر فرسودہ طریقۂ تعلیم کو اپنائے ہوئے تھے۔

(۳) انگریزوں کی لائی ہوئی ہر ایجاد سے نفرت کرتے تھے۔

(۴) فوجی اور انگریزی ملازمت کو قبول کرنا معیوب سمجھتے تھے۔

(۵) تقلید کی روش اختیار کیے ہوئے تھے۔

(۶) اپنے آباواجداد کے کارناموں پر فخر کرتے تھے لیکن خود قوتِ عمل سے محروم تھے۔

(۷) تصوف کے رجحان اور اس دور کے حالات نے انھیں مایوسی کے ساتھ ساتھ کاہلی میں بھی مبتلا کر دیا تھا۔ انھوں نے دنیا سے بیزاری اور کنارہ کشی کا انداز اختیار کر لیا تھا۔

(۸) انھوں نے ماضی سے لگاؤ کے ساتھ ساتھ حال سے بے رُخی اور مستقبل سے کنارہ کشی اختیار کر لی تھی۔ اس زمانے کے مسلمانوں میں ایک بڑی برائی ''تعصب'' کی پیدا ہوگئی تھی۔ اس بارے میں سرسید لکھتے ہیں کہ:

''ہندوستان کے مسلمان تعصب کی بدخصلت میں گرفتار ہیں اور اس سبب سے ہزاروں قسم کی بھلائیوں کے حاصل کرنے سے اور دنیا میں اپنے تئیں ایک معزز قوم کو دکھانے سے محروم اور ذلت اور خواری اور بے علمی اور بے ہنری کی مصیبت میں گرفتار ہیں..... دنیا میں کوئی قوم ایسی نہیں ہے جس نے خود ہی تمام کمالات اور تمام خوبیاں اور خوشیاں حاصل کی ہوں، بلکہ ہمیشہ ایک قوم نے دوسری قوم سے فائدہ اُٹھایا ہے۔ مگر متعصب شخص ان نعمتوں سے بدنصیب

رہتا ہے، علم میں اس (متعصب شخص) کو ترقی نہیں ہوتی۔ دنیا کے حالات سے وہ ناواقف رہتا ہے، عجائبات قدرت کے دیکھنے سے وہ محروم ہوتا ہے، حصول معاش اور دنیاوی عزت وتمول مثال تجارت وغیرہ کے وسیلے جاتے رہتے ہیں اور رفتہ رفتہ تمام دنیا کے انسانوں میں روز بروز ذلیل وخوار اور حقیر و ناچیز ہوتا جاتا ہے۔ اس کی مثال ایک ایسے جانور کی ہوتی ہے جو اپنے ریوڑ میں ملا رہتا ہے اور نہیں جانتا ہے اس کے اور ہم جنس کیا کر رہے ہیں۔ بلبل کیا چہچہاتی ہے اور قمری کیا غل مچاتی ہے۔

وہ بجز کوڑے پر کی گھاس چرنے کے اور کچھ نہیں چاہتا کہ باغ کیوں بنا ہے اور پھول کیوں کھلا ہے، نرگس کیا دیکھتی ہے اور انگور کی تاک کیا تاکتی ہے۔

تعصب میں سب سے بڑا نقصان یہ ہے کہ جب تک وہ نہیں جاتا کوئی ہنر وکمال اس میں نہیں آتا، تربیت وشائستگی، تہذیب وانسانیت کا مطلق نشان نہیں پایا جاتا اور جب کہ وہ مذہبی غلط نما نیکی کے پردے میں ظہور کرتا ہے تو اور بھی سُم قاتل ہوتا ہے، کیوں کہ مذہب سے اور تعصب سے کچھ تعلق نہیں ہے۔''[۷]

اپنے ایک مضمون تکمیل میں لکھتے ہیں:

''ارسطو کچھ ہمارا مذہبی پیشوا نہ تھا، جو ہم اس کے علوم اور فلسفہ اور اس کے الٰہیات کو ناقابل غلطی کے سمجھیں۔ بوعلی کچھ صاحب وحی نہ تھا کہ اس کی طب کے سوا اور کسی کو نہ مانیں۔ جو علوم دینی مدت دراز سے ہم پڑھتے آتے تھے اور جو اپنے زمانے میں ایسے تھے کہ اپنا نظیر نہیں رکھتے تھے، انھیں پر پابند رہنے

کے لیے ہم پر کوئی خدا کا حکم نہیں آیا تھا۔ پھر کیوں ہم اپنی آنکھیں نہ کھولیں اور
نئے علوم اور نئی نئی چیزیں جو خدا تعالیٰ کی عجائب قدرت کے نمونے ہیں اور جو
روز بروز انسان پر ظاہر ہوتے جا رہے ہیں ان کو کیوں نہ دیکھیں۔''[۸]

یہ تمام کمزوریاں تو اپنی جگہ تھیں لیکن ۱۸۵۷ء کے ہنگامے نے انھیں مایوسی و محرومی کے اس اندھے غار میں ڈال دیا تھا جس سے باہر نکل پانا ان کے لیے ناممکن تھا۔ چنانچہ سرسید نے ان کی حالت کو بہ غور دیکھا اور اس نتیجے پر پہنچے کہ مسلمانوں کی ان خرابیوں کو دور کرنے کے لیے ایک ایسی تحریک چلائی جائے جس سے کہ انھیں ماضی سے سبق حاصل ہو، حال سے آگاہی ہو اور مستقبل کے لیے لائحہ عمل تیار کر سکیں۔ حالات کے تحت زندگی کا رُخ موڑ دیا جائے۔

علی گڑھ تحریک ۱۸۵۷ء کی جنگ کے نتیجے میں مسلمانوں کا جو زوال ہوا تھا اسے ہی دور کرنے کے لیے شروع کی گئی تھی۔ گویا اس تحریک کا مقصد ہندوستانی مسلمانوں کو زندگی کے تمام میدانوں میں ترقی کی اعلا منزل پر پہنچانا تھا، لیکن یہ اسی وقت ممکن تھا جب حاکم و محکوم میں نفرت، حسد اور جذبۂ انتقام کے بجائے اتحاد اور یگانگت پیدا ہو۔ اس لیے سرسید نے انگریزوں سے اتحاد کو ہی سب سے پہلے انجام دیا اور اب وہ انگریزوں سے دوستی اور ان کی مصیبتوں میں ساتھ دینے کے لیے آمادہ ہو گئے:

''نہایت دلیری اور جواں مردی سے تمام مصیبت کے زمانے میں یوروپین
حاکموں کا.....ساتھ دیا، ہر ایک نازک وقت میں (وہ) ان کے ساتھ شریک اور
گورنمنٹ کی وفاداری اور خیر خواہی میں شب و روز مستعد اور سرگرم رہے۔''[۹]

سرسید شروع سے ہی انگریزی حکومت کے اقتدار کو قبول کرنے میں پیش پیش رہے اور ہمیشہ عوام کو بھی یہی مشورہ دیا کہ وہ انگریز حکومت سے نفرت کے بجائے محبت و اُنسیت سے پیش آئے۔ اس حکومت کی تعریف کرتے ہوئے لکھتے ہیں کہ:

''یہ انصاف اور یہ آسائش اور یہ آزادی اور یہ عدم مزاحمت پر کسی کے حال اور قال اور مذہب اور ملت سے جیسا کہ ہماری سرکار انگلشیہ کے عہد میں ہے کسی کے عہد میں نہیں ہوا۔..... اگلی ہندوستانی عمل داریوں میں رعایا کو آزادی حاصل نہیں تھی.....اب بھی تم کو چاہیے کہ حق گورنمنٹ ادا کرو اور جورو سیاہی تم کو گورنمنٹ سے حاصل ہوئی ہے اس کو آب زلال اطاعت اور فرماں برداری اور دلی طرف داری گورنمنٹ سے دھوؤ، تا کہ نتیجہ نیک پاؤ۔''[۱۰]

سرسید، تبیین الکلام لکھنے کا اصل مقصد بتاتے ہوئے کہتے ہیں کہ:

''میری یہ خواہش رہی ہے کہ مسلمان اور عیسائیوں میں محبت پیدا ہو، کیوں کہ قرآن مجید کے موافق اگر کوئی فرقہ ہمارا دوست ہوسکتا ہے تو وہ عیسائی ہیں۔''[۱۱]

سرسید نے کہا کہ:

''اسلام نہایت وسیع مذہب ہے جس کا یقین ادب، تحمل اور رواداری پر ہے جس کی بنا پر وہ تمام پیغمبران کو (خواہ وہ یہودی یا عیسائی کے پیغمبر ہی کیوں نہ ہوں) تسلیم کرتا ہے اور ان کی عزت اور احترام کرتا ہے۔''[۱۲]

''میں نہیں دیکھتا کہ مسلمانوں کے سوا ایسا اور کوئی ہو جس نے خالص سرکار کی خیر خواہی میں اپنی جان، مال، عزت، آبرو کھوئی ہو.....مسلمانوں کے سوا وہ کون شخص ہے جس نے صرف سرکار کی خیر خواہی میں اپنی اور اپنے کنبے کی جان دی اور ہر وقت ہاتھ، پاؤں، دل و جان سے جاں نثاری کو حاضر رہا ہو۔''[۱۳]

''مسلمانوں کو صرف دو حالتوں میں تلوار پکڑنے کی اجازت دی گئی ہے:
(۱) اس حالت میں جب کہ کافر اسلام کی عداوت سے اور اسلام کے معدوم کرنے کی غرض سے نہ کسی ملکی اغراض سے مسلمانوں پر حملہ آور ہوں، اور (۲) اس وجہ سے کہ وہ مسلمان ہیں، ان کے جان و مال کو امن نہ ملے اور فرائض مذہبی کے ادا کرنے کی اجازت نہ ہو۔''[۱۴]

سرسید نے مزید کہا کہ:

''پھر بھی اسلام عیسائیت کو ہی اپنے سب سے زیادہ قریب پاتا ہے سوائے مذہب اسلام کے دنیا میں اور کون سا مذہب ہے جس نے حضرت عیسیٰ علیہ السلام کا اور ان کی ہدایات کا ایسا ادب کیا ہو اور ایسی عزت کی ہو جیسی کہ مسلمان کیے ہیں اور کرتے ہیں اور ان کو نبی حق اور رسول خدا کا مانتا ہو اور یہ سمجھتا ہو کہ ہم میں اور عیسائی مذہب میں جو کلمۃ الحق ہے وہ ایک ہی ہے اور اس میں کچھ فرق نہیں ہے کہ خود خدا نے قرآن مجید میں فرمایا ہے: ''اے عیسائیو ایک بات پر آ جاؤ جو ہم میں اور تم میں یکساں ہے کہ خدا کے سوا کسی کی عبادت نہیں کرنے کے۔''[۱۵]

سرسید نے اس مقصد کی خاطر درج ذیل اقدامات کیے:

۱۔ اسبابِ بغاوت ہند لکھ کر ہندوستانیوں کی وکالت کی۔

۲۔ سائنٹفک سوسائٹی قائم کی۔

۳۔ انگلستان جا کر ولیم میور کی کتاب The Life of Mohammad کا جواب دیا اور وہاں کے طریقۂ تعلیم اور آکسفورڈ یونیورسٹی کا بہ غور مطالعہ کیا۔

۴۔ یورپ کی معاشرتی، تہذیبی اور اخلاقی زندگی کو دیکھ کر ہندوستانیوں کی زندگی پر غور کیا۔

۵۔ ہندوستان آ کر تہذیب الاخلاق جاری کیا۔

۶۔ ایم۔اے۔او کالج قائم کیا۔

۷۔ مسلم ایجوکیشنل کانفرنس کی بنیاد رکھی تا کہ تعلیمی تحریک کو مسلمانوں میں عام کیا جائے۔

رسالہ اسباب بغاوت ہندوستان (۱۸۵۹ء):

یہ رسالہ سرسید نے مراد آباد میں تصنیف کیا۔ اس سے ان کا مقصد گورنمنٹ کی، ملک کی اور قوم کی خدمت انجام دینا تھا۔ یہ خدمت انھوں نے اس زمانے میں کی جب حکومت نے صاف طور پر یہ باور کر لیا تھا کہ مسلمان ہی باغی ہے، یہ وقت بہت ہی نازک تھا۔ خیالات ظاہر کرنے کی بالکل بھی آزادی نہ تھی۔ مارشل لا کا دور دورہ تھا۔ اس کی سرسید نے ۵۰۰ جلدیں چھپوائیں تھیں جس میں سے ایک گورنمنٹ انڈیا میں بھیجی، کچھ اپنے پاس رکھیں اور باقی تمام ولایت بھیج دیں۔ وہاں پر کونسل کے ممبر جب یہ انڈیا گورنمنٹ کونسل میں یہ کتاب پہنچی تو لارڈ کیننگ گورنر جنرل اور سر بارٹر فریر نے جو اس کو صرف خیر خواہی پر محمول کیا، لیکن مسٹر سسل بیڈن نے جو اس وقت فارن سکریٹری تھے اس کے خلاف ایک بڑی اسپیچ دے کر یہ رائے قائم کی کہ:

> ''اس شخص نے نہایت باغیانہ مضمون لکھا ہے اس سے حسب ضابطہ باز پرس ہونی چاہیے اور جواب لینا چاہیے اور اگر کوئی معقول جواب نہ دے سکے تو سخت سزا دینی چاہیے۔''[۱۶]

جب کہ بات دراصل اتنی تھی کہ سرسید کا مقصد صرف ہندوستانی مسلمانوں کو انگریزوں اور حکومت کی نظر میں وفادار، بے تعصب اور قابلِ اعتماد بنا کر پیش کرنا اور بغاوت کے الزام سے بری کرانا تھا۔ حالاں کہ اس رسالہ کو گورنمنٹ کے سامنے پیش کرنے سے ان کے دوستوں میں رائے شنکر داس نے جو اس

وقت مراد آباد میں منصف تھے، منع کیا کہ ایسا کر کے تم اپنی جان سے ہاتھ دھو بیٹھو گے یہ بڑا خطرناک کام ہے۔ لیکن سرسید نے کہا کہ:

''میں ان باتوں کو گورنمنٹ پر ظاہر کرنا ملک اور قوم اور خود گورنمنٹ کی خیر خواہی سمجھتا ہوں۔ پس اگر ایک ایسے کام پر جب سلطنت اور رعایا دونوں کے لیے مفید ہو مجھ کو کچھ گزند بھی پہنچ جائے تو گوارہ ہے۔''[۱۷]

اس اسپیچ میں اس کے ساتھ کوئی اور ممبر شریک نہ تھا اس لیے اس سے کوئی نتیجہ پیدا نہ ہوا، لیکن جب فرخ آباد میں ان کی سرسید سے ملاقات ہوئی تو انھوں نے کہا کہ:

''اگر تم گورنمنٹ کی خیر خواہی کے لیے یہ مضمون لکھتے تو ہرگز اس کو چھپوا کر ملک میں شائع نہ کرتے بلکہ صرف گورنمنٹ پر اپنے یا رعایا کے خیالات ظاہر کرتے۔''[۱۸]

اس بات پر سرسید نے کہا کہ:

''میں نے اس کتاب کی کل پانسو جلدیں چھپوائی تھیں جن میں سے چند جلدیں میرے پاس موجود ہیں اور ایک گورنمنٹ میں بھیجی ہے اور کچھ کم پانسو جلدیں ولایت روانہ کیں ہیں جن کی رسید میرے پاس موجود ہے۔ میں جانتا تھا کہ آج کل بہ سبب غیظ و غضب کے حاکموں کی رائے صائب نہیں رہی اور اسی لیے وہ سیدھی باتوں کو بھی الٹی سمجھتے ہیں اس لیے جس طرح سے میں نے اس کو ہندوستان میں شائع نہیں کیا اسی طرح انگریزوں کو بھی نہیں دکھایا۔ صرف ایک کتاب گورنمنٹ میں بھیجی ہے، اگر اس کے سوا ایک جلد بھی کہیں ہندوستان میں مل جائے تو میں فی جلد ایک ہزار روپیہ دوں گا۔''[۱۹]

اوراس کے بعد انھوں نے اس سلسلے میں تحقیق کی تو سرسید سچے ثابت ہوئے اوراس طرح سے وہ سرسید کے حامی و مددگار بن گئے۔

مرادآباد میں ہی سرسید نے لائل محمڈنز آف انڈیا شائع کیا۔ یہ کام بھی مسلمانوں کی بھلائی کے لیے تھا کیوں کہ اسباب بغاوت ہند تو سرسید نے گورنمنٹ ہند اور پارلیمنٹ کی اطلاع کے لیے لکھا تھا۔ اس سے ہندوستان کے عوام خواہ ہندو یا مسلمان یا حکام واقف نہ تھے اور انگریزوں کی طرف سے جتنے رسالے وغیرہ جاری ہوئے اس میں سب سے زیادہ مجرم مسلمان ہی ٹھہرائے جاتے۔ اس لیے انھوں نے اس رسالہ کو لکھ کر مسلمانوں کی وفاداری گنانے کی کوشش کی۔ یہ ۱۸۶۰ء میں جاری ہوا اور ۱۸۶۱ء میں بند ہو گیا، کیوں کہ اس کے صرف تین نمبر ہی نکل پائے جو کہ ۲۷۳ صفحے کے تھے۔ اس کے پہلے نمبر کو انھوں نے اس طرح شروع کیا:

> ''سچ ہے انقلاب زمانہ ایک ایسا بڑا حادثہ ہے کہ آدمی کو نہایت زبوں و درماندہ کر دیتا ہے۔ ایسے وقت میں انسان کا فضل و کمال، عقل و ہنر، علم و عمل کچھ کام نہیں آتا۔ یہی وہ حادثہ ہے جس سے انسان کا یا پلٹ ہو جاتا ہے، کوئی کام اس کا اعتبار کے قابل نہیں رہتا۔ کسی شخص کو اس قدر و منزلت کا خیال نہیں رہتا، جو کام انسان سے برا سرزد ہوتا ہے وہ تو برائی ہے، مگر اس کم بخت وقت کا متقاضی ہوتا ہے کہ اس کا اچھا کام بھی برائی اور ظاہرداری پر محمول ہوتا ہے۔ ہر ایک قوم میں اچھے برے سب قسم کے آدمی ہوتے ہیں۔ یہ جو ایک مثل مشہور ہے کہ 'ایک مچھلی سارے جل کو گندا کرے' یہ خاص ایسے ہی برے وقت کے لیے کہی گئی ہے۔ اس کم بخت وقت کا یہ خاصا ہے کہ اگر ایک آدمی بھی برا کام کرے تو ساری قوم کی قوم رُسوا اور بدنام ہو جاتی ہے۔ گو اسی قوم میں صدہا آدمیوں نے اچھے کام کیے ہوں مگر ان خوبیوں پر کسی کو خیال نہیں ہوتا۔''[۲۰]

''برخلاف اس کے جن لوگوں پر بدبختی کے دن نہیں ہوتے ان کا برا کام بھی آنکھوں میں نہیں کھٹکتا۔ان میں سے ہزاروں نے کیسے ہی برے کام کیے ہوں، مگران کی برائی پر کسی کو دھیان نہیں ہوتا۔ یہ بدبختی کا زمانہ وہ ہے جو ۱۸۵۷ء و ۱۸۵۸ء میں ہندوستان کے مسلمانوں پر گزرا۔کوئی آفت ایسی نہیں ہے جو اس زمانہ میں نہ ہوئی ہو اور یہ نہ کہا گیا ہو کہ مسلمانوں نے کی۔ گو کہ وہ رام دین اور ماتا دین ہی نے کی ہو۔کوئی بلا آسمان پر سے نہیں چلی جس نے زمین پر پہنچنے سے پہلے مسلمانوں کا گھر نہ ڈھونڈا ہو۔''[۲۱]

''اس گزشتہ زمانے کے حالات پر میں نے بھی بہت غور کیا اور جو اصلی حالات مجھ کو معلوم ہوئے ہیں ان پر یقین رکھتا ہوں اور اسی سبب سے میرا دل خوش ہے کہ بالفعل جو ایک غوغا مسلمانوں کی برائی اور مفسدہ اور بدذاتی کا چاروں طرف پھیل رہا ہے یہ بالکل مٹ جائے گا، گرچہ کچھ کچھ حالات فساد کے کھلتے چلے ہیں۔مگر روز بروز اور زیادہ کھلتے جائیں گے اور جب اصلی حال بالکل روشن ہو جائے گا تو جن لوگوں کی زبانیں مسلمانوں کی نسبت دراز ہو رہی ہیں سب بند ہو جائیں گی اور تحقیق ہو جائے گا کہ ہندوستان میں اگر کوئی قوم مذہب کی رو سے عیسائیوں سے محبت اور اخلاص اور ارتباط اور یگانگت کر سکتی ہے تو مسلمان ہی کر سکتے ہیں اور کوئی نہیں۔مگر ان دنوں میں جو میری نگاہ سے انگریزی اخبارات کثرت سے گزرے اور جو کتابیں اس ہنگامے کی جانب تصنیف ہوئیں وہ بھی میں نے دیکھیں تو ہر ایک میں یہی دیکھا کہ ہندوستان میں مفسد اور بدذات کوئی نہیں مگر، مسلمان! مسلمان! مسلمان! کوئی کانٹوں

والا درخت اس زمانے میں نہیں اُگا جس کی نسبت یہ نہ کہا گیا ہو کہ اس کا بیج مسلمانوں نے بویا تھا اور کوئی آتشیں ببولا نہیں اٹھا، جو یہ نہ کہا گیا ہو کہ مسلمانوں نے اٹھایا تھا مگر میں اس کے برخلاف سمجھتا ہوں۔ میں نے نہیں دیکھا کہ مسلمانوں کے سوا ایسا اور کوئی ہو جس نے خالص سرکار کی خیر خواہی میں، اپنی جان، مال، عزت، آبرو کھوئی ہو۔ زبانی بات چیت کی خیر خواہیاں ملا دینے اور جھوٹے سچے ایک دو پرچے لکھ بھیجنا بہت آسان ہے، مگر مسلمانوں کے سوا وہ کون شخص ہے جس نے صرف سرکار کی خیر خواہی میں اپنی اور اپنے کنبے کی جان دی ہو اور ہر وقت ہاتھ پاؤں اور دل و جان سے جاں نثاری کو حاضر رہا ہو۔''

''جن مسلمانوں نے سرکار کی نمک حرامی اور بدخواہی کی، میں ان کا طرف دار نہیں ہوں۔ میں ان سے بہت زیادہ ناراض ہوں اور ان کو حد سے زیادہ برا جانتا ہوں۔ کیوں کہ یہ ہنگامہ ایسا تھا کہ مسلمانوں کو اپنے مذہب کے بموجب عیسائیوں کے ساتھ رہنا چاہیے تھا۔ جو اہلِ کتاب اور ہمارے مذہبی بھائی بند ہیں۔ نبیوں پر ایمان لائے ہیں، خدا کے دیے ہوئے احکام اور خدا کی دی ہوئی کتاب اپنے پاس رکھتے ہیں جس کا تصدیق کرنا اور جس پر ایمان لانا ہمارا عین ایمان ہے۔ پس اس ہنگامے میں جہاں عیسائیوں کا خون گرتا وہیں مسلمانوں کا بھی خون گرنا چاہیے تھا۔ پھر جس نے ایسا نہیں کیا اس نے علاوہ نمک حرامی اور گورنمنٹ کی ناشکری کے جو سبھی حال میں رعیت کو جائز نہ تھی۔ اپنے مذہب کے بھی برخلاف کیا۔ اس لیے بلاشبہ وہ اس لائق ہیں کہ زیادہ ان

سے ناراض ہوا جائے، مگر عموماً اخباروں اور بغاوت کی کتابوں میں جو رائے ان کی نسبت چھاپی جاتی ہے اس میں اور میری رائے میں اتنا فرق ہے کہ جو تمہید اور جو بنا اور جو نشانہ کہ وہ لوگ ان کی نسبت لگاتے ہیں میں ان کو قبول نہیں کرتا اور کچھ شک نہیں کہ میں اپنی رائے کو بہت درستی اور انصاف سے کام میں لایا ہوں۔''

''اگرچہ چاروں طرف سے مسلمانوں پر یہ شور وغل ہو رہا ہے مگر مسلمانوں کو کسی طرح رنجیدہ خاطر ہونا نہیں چاہیے کیوں کہ ہماری نہایت منصف اعلیٰ گورنمنٹ مسلمانوں کی طرف ہے۔ ہماری گورنمنٹ نے اصلی حالات فساد پر بخوبی غور کیا ہے اور یقین ہے کہ ہماری گورنمنٹ کی ہرگز یہ رائے نہیں ہے جو تم اخباروں یا بغاوت کی کتابوں میں دیکھتے ہو۔ پس جب کہ مسلمانوں کی طرف خود گورنمنٹ ہے تو پھر اس شور وغوغا کا ان کو کیا غم ہے۔''

''ہم جو یہ بات لکھتے ہیں کہ ہماری منصف گورنمنٹ مسلمانوں کے ساتھ ہے، اس کی بہت روشن دلیل یہ ہے کہ ہماری قدردان گورنمنٹ نے خیرخواہ مسلمانوں کی کیسی قدر و منزلت اور عزت اور آبرو کی، انعام واکرام اور جاگیر اور پنشن سے نہال کر دیا ہے۔ ترقیِ عہدہ اور افزونیِ مراتب سے سرفراز کیا ہے، پھر کیا یہ ایسی بات نہیں ہے کہ مسلمان نازاں ہوں اور دل و جان سے اپنی گورنمنٹ کے شکرگزار و ثناخواں رہیں۔''

''مگر میں دیکھتا ہوں کہ مسلمانوں نے جو خیرخواہیاں کیں ان کا ذکر اخباروں میں بہت کم چھپتا ہے اور بغاوت کی جو کتابیں چھپی ہیں، ان میں تو اس کا ذکر

ہی نہیں۔ اس لیے میں نے ارادہ کیا ہے کہ مسلمان خیر خواہوں کا تذکرہ اس رسالہ میں لکھنا شروع کروں اور جن مسلمانوں نے علی الخصوص مسلمان ملازمانِ گورنمنٹ نے جو جو خیر خواہیاں گورنمنٹ کی ہیں ان کا بیان جہاں تک مجھ کو معلوم ہے لکھوں اور جو انعام و اکرام ہماری منصف و قدردان گورنمنٹ نے بہ عوض اس کے مسلمانوں کو دیے وہ سب بیان کروں تا کہ گورنمنٹ کی سخاوت اور منصفی اور قدردانی زیادہ تر مشہور ہو اور تمام رعایا اپنے ہم قوموں کے ساتھ گورنمنٹ کی ضرورت اور سلوک اور رعایت اور قدردانی دیکھ کر اس کے دل سے شکر گزار ہو اور ہر ایک کو یہ حوصلہ پیدا ہو کہ جس طرح ہمارے ہم قوموں نے گورنمنٹ کی رفاقت سے عزت اور نیک نامی حاصل کی اسی طرح ہم بھی حاصل کریں اور یہ بھی جان لیں کہ ہماری گورنمنٹ ہمیشہ اپنی مطیع رعایا پر دل سے مہربان اور ان کی قدر و منزلت کرنے کو تیار ہے۔''[۲۲]

لیکن افسوس کی بات یہ ہے کہ اس رسالے صرف تین نمبر ہی شائع ہوئے۔

جب انگریزوں نے ہندوستانیوں کے ساتھ اپنے ظلم و ستم اور قتل و غارت گری کو کچھ قابو میں کیا، حکومت کا رویہ کچھ بدل کر ہندوستانیوں کے حق میں ہوا اور وہ اب امن و امان کی پالیسی سے کام لے رہی تھی۔ ادھر عوام بھی حکومت کو اپنی وفاداری کا یقین دلا رہی تھی۔ اسی دوران غازی پور تبدیلی کے بعد سرسید سے بھی ۹ رجنوری ۱۸۶۴ء میں سائنٹفک سوسائٹی کی بنیاد رکھی۔

یہ سوسائٹی ہندو اور مسلمان دونوں کو مدنظر رکھ کر ہی قائم کی گئی تھی، کیوں کہ اس زمانے میں مسلمان انگریزی تعلیم سے نفرت کرتے تھے اور ہندو صرف نوکری حاصل کرنے کی غرض سے ہی انگریزی تعلیم حاصل کرتے تھے۔ اس لیے سرسید نے منصوبہ بنایا کہ یہاں پر انگریزی کی کتابوں کا اردو میں ترجمہ

کرا کر انگریزی لٹریچر وعلوم سے ہندو اور مسلمان دونوں کو واقف کرایا جائے اور ساتھ ہی ساتھ ہندوستانی و انگریزوں میں میل جول بھی پیدا کرایا جائے۔ اس کے ممبر انگریز اور ہندوستانی ہوں جو سائنس اور انگلش لٹریچر کی کتابوں کا ترجمہ کرا سکیں۔

لہٰذا سرسید اپنے اس منصوبے میں کامیاب ہوئے اور انگریزوں نے بھی ان کا تعاون کیا۔ مثلاً ڈیوک آف آرگل جو وزیر ہند تھے، وہ سوسائٹی کے پیٹرن منظور کیے گئے۔ لفٹننٹ گورنر شمال مغرب ڈریمنڈ صاحب اور لفٹننٹ گورنر پنجاب مکلوڈ صاحب وائس پیٹرن مقرر کیے گئے۔ اس کے علاوہ معزز ہندو اور مسلمانوں نے بھی اس کی ممبری قبول کی۔ اس طرح غازی پور میں اس سوسائٹی کے ذریعہ ترجمہ کا کام شروع ہو گیا۔

اس میٹنگ میں کافی تعداد میں انگریزوں اور ہندوستانیوں نے شرکت کی (صحیح تعداد نہیں معلوم ہو سکی) میٹنگ کی کاروائی کی ابتدا سید احمد خاں کے افتتاحی کلمات کے ساتھ ہوئی۔ جنھوں نے مسٹر جی۔ ایف۔ آئی۔ گراہم (اسسٹنٹ سپرنٹنڈنٹ پولیس، غازی پور) سے اپنے خیالات ظاہر کرنے اور میٹنگ کی کارروائی شروع کرنے کی درخواست کی۔ گراہم نے انگریزی میں تقریر کی جس کا اردو ترجمہ منشی محمد یار خاں نے پڑھ کر سنایا۔ (محمد یار خاں بعد میں انسٹی ٹیوٹ گزٹ کے اردو سیکشن کے انچارج رہے گویا یہ غازی پور سے سرسید کے ساتھ علی گڑھ آئے تھے۔)

گراہم نے اپنی تقریر میں کہا کہ:

> ''اس وقت تک تمام مغربی علوم کے دروازے ایشیا کے لوگوں کے لیے بند ہیں اور جب کہ ہم کو یہ معلوم ہے کہ انھیں علوم پر ملک کی ترقی کا انحصار ہے تو مجھے یقین ہے کہ وہ لوگ، جو ہندوستان کی بقا میں دلچسپی رکھتے ہیں ہماری سوسائٹی کو اپنا تعاون دیں گے۔ ہم میں سے زیادہ تر کو یہ بھی نہ معلوم ہوگا کہ ہندوستان

میں کتنے ایسے لوگ ہیں جن کو ہماری اس بیش قیمت زمین میں چھپے خزانوں کا علم ہے۔ کتنے لوگوں کو زمین کو جوتنے کے طریقوں یا پانی کی سطح کو اونچا کرنے یا کپاس سے کپڑا تیار کرنے یا اسی طرح کی دوسری بنیادی باتوں یا طریقوں کا علم ہے جن کو ہمارے کسان تیار کرتے ہیں۔ بہت سی ایسی کتابیں جن کا تعلق مندرجہ بالا چیزوں سے ہے، ان کا ترجمہ اس سوسائٹی کے ذریعہ کیا جائے گا، تاکہ یہ علوم عام لوگوں تک پہنچ سکیں۔ اس کام میں ہندوستان کے تمام لوگوں کا تعاون درکار ہوگا۔ اس سوسائٹی کے بانی سید احمد خاں کا مقصد انگریزی پڑھنے میں کوئی رُکاوٹ پیدا کرنا نہیں ہے، بلکہ اصل مقصد انگریزی ادب کو عوام تک پہنچانا ہے تاکہ اس کے ذریعہ تہذیب و تمدن کی ترقی کے ساتھ ملک میں معاشی خوش حالی اور ثقافتی ترقی کو بڑھاوا ملے۔'' [۲۳]

اس سوسائٹی کے ذریعہ سرسید کا مقصد صرف ترجمہ سازی ہی نہیں تھا بلکہ وہ اس کے ذریعہ وہ بلا امتیاز مذہب و ملت ہندوستانی عوام کے اندر ایک نئی سائنسی سمجھ پیدا کرنا چاہتے تھے۔ اس سلسلے میں انھوں نے سوسائٹی کے چھ سات مہینے بعد ہی ۱۶/اگست ۱۸۶۴ء میں اپنے ایک بیان میں کہا کہ:

''جب کہ یہ سوسائٹی مقرر ہوئی تھی تو اس کے معاونوں نے یہ خیال کیا تھا کہ صرف ترجمہ کے مفید علوم و فنون کے اور یوروپ کی روشن ضمیری کا عکسی ہندوستانیوں پر ڈالنے کو کافی نہ ہوگا بلکہ یہ بات ضروری ہوگی کہ نئے نئے علوم و فنون جو یوروپ میں ایجاد ہوتے ہیں ان کا امتحان اور تجربہ بھی بذریعہ کلوں کے ہندوستانیوں کو دکھلایا جائے تاکہ وہ روشن ضمیری حاصل کریں۔.....

ان مطالب کے حاصل کرنے کے لیے سوسائٹی کا ارادہ ہے کہ فلاحت کو بھی

ہندوستان میں بخوبی رواج دے اور انگریزی زبان میں جو اس فن کی عمدہ کتابیں ہیں ان کو بھی اپنے ملک کی زبان میں ترجمہ کرے اور یہ بھی ارادہ ہے کہ تمام مفید کلیں جو کاشت کاری سے علاقہ رکھتی ہیں وہ کلیں اور ان کے نمونے انگلستان سے منگائے اور لوگوں کو ان کا فائدہ دکھایا جائے اور ان کا استعمال سکھلائے۔ پس یہ مقصد اور منشا اس سوسائٹی کا ہے جو میں نے بیان کیا۔ مجھ کو امید ہے کہ آپ سب صاحب بخوبی یقین کرتے ہوں گے کہ اگر مقصد اور مطالب اس سوسائٹی کے پورے ہو جائیں تو ہندوستانیوں کے لیے کس قدر فائدہ ہے اور کیسی بہبودی اور ترقی ان کی مقصود ہے۔''

اس پیراگراف میں سوسائٹی کی اس تصویر کی جھلک صاف نظر آتی ہے جو سرسید نے سوسائٹی کے مقاصد اور مستقبل میں اس کے لائحہ عمل کے سلسلے میں شروع سے اپنے ذہن میں مرتب کر رکھی تھی اور یہی وجہ تھی کہ اس سوسائٹی کے قیام کے چند مہینوں بعد ہی سوسائٹی کی میٹنگ منعقدہ ۱۱/اپریل ۱۸۶۴ء (بمقام غازی پور) میں سوسائٹی کے نام کے سلسلے میں سرسید نے مندرجہ ذیل تجویز رکھی:

''سین ٹیفک سوسائٹی جو اس سوسائٹی کا نام بالفعل ہے وہ میں نے جلدی میں اور بغیر مشورہ کے کسی انگریز دوست کے رکھ دیا تھا اور اب جو بعض انگریزی ممبروں نے اوس کے مناسب نہ ہونے پر اعتراض کیا ہے اس سے میں تحریک کرتا ہوں کہ نام موجودہ کو کسی مناسب نام سے بدلا جاوے، لیکن سوسائٹی کا نام ترجمہ کی سوسائٹی نہ رکھا جاوے۔ کیوں کہ جس مقصدوں کے لیے یہ سوسائٹی قائم کی گئی ہے اور جن کا ذکر قانون سوسائٹی دفعہ ۲ میں ہے وہ اس نام سے اچھی طرح ظاہر نہ ہوں گے۔ میری رائے میں اس کا نام سوسائٹی فار دی ڈیفیوژن آف یوزفل نالج یعنی اشاعت علوم مناسب ہوگا۔''[۲۴]

اسی میٹنگ میں سرسید کی اس تحریک سے ممبران نے اتفاق کیا اور ممبران سوسائٹی سے اس معاملہ میں رائے طلب کرنے کی تجویز ہوئی۔ سین ٹیفک سوسائٹی کی اگلی میٹنگ منعقدہ ۱۵ر ستمبر ۱۸۶۴ء (بمقام علی گڑھ میں)، سید احمد خاں نے سوسائٹی کے نام کے سلسلے میں کہا کہ:

''گذشتہ اجلاس میں جو ۱۱ر اپریل ۱۸۶۴ء کو بمقام غازی پوری میں منعقد ہوا تھا، میں نے تحریک کی تھی کہ نام سوسائٹی کا بدلا جائے اور بجائے سین ٹیفک سوسائٹی کے، 'سوسائٹی فار دی ڈیفیوژن آف یوزفل نالج' رکھا جائے۔ اس سلسلے میں لفٹننٹ گراہم صاحب نے جو ہماری سوسائٹی کے مشہور دوست ہیں اس رائے پر اعتراض کیا ہے۔ ان کی چھٹی پیش کرتا ہوں اس امید سے کہ اجلاس سے اس امر میں تصفیہ کیا جائے۔''

چھٹی لفٹننٹ گراہم صاحب بہادر بنام سید احمد خاں مورخہ ۲۰ر جولائی بمقام میرٹھ:

''آپ کو معلوم ہے جب ہماری سوسائٹی قائم ہوئی تھی تو میری خواہش یہ تھی کہ جس نام سے وہ اب مشہور ہے اس سے کچھ کم حیثیت والا نام اس کا ہونا چاہیے۔ کیوں کہ مقصد اصلی اس کا یہ تھا کہ ان لوگوں کے فائدے کے واسطے جو انگریزی نہیں جانتے، یوروپ کے علوم و فنون کی کتابوں کا ترجمہ کیا جاوے۔ مجھ کو بخوبی معلوم تھا کہ درحالت کامیابی آپ کے مدنظر سوسائٹی کے اور بھی مقاصد تھے جیسے سائنسی آلات اور ان کے نمونے وغیرہ انگلستان سے منگوانا اور ان کی مدد سے ان عجائبات پر جو زمانہ حال میں سائنس نے تحقیق کیے ہیں اور اب عام استعمال میں ہیں، لکچرز دلوانا اور اس طرح اس ملک میں فہم و دانش مند لوگوں کو تیار کرنا جن کے ذریعہ ملک کے عوام میں علم کی روشنی کو

پھیلانا، اگر چہ آپ کا یہ ارادہ مجھ کو معلوم تھا مگر پھر بھی میری رائے تھی کہ شروع میں ایک کم عظمت والا نام سوسائٹی کا رکھا جائے کیوں کہ میں سمجھتا تھا کہ ایک لمبے عرصے تک سوسائٹی ترقی کی منزلوں کو طے کر کے ایک ایسے بلند مقام کو نہ پا سکے گی۔ جہاں پہنچ کر وہ اپنے آپ کو ایسے عظمت والے نام کا حق دار ثابت کر سکے۔ میں نے اس وقت یہ بھی کہا تھا کہ جب سوسائٹی کسی ایسے مقام پر پہنچ جائے اس وقت اس کا نام سین ٹیفک سوسائٹی رکھا جائے۔ مگر پھر بھی یہ نام اس کا رکھا گیا اور ابتدا سے ہی وہ اسی نام سے انگلستان اور ہندوستان میں مشہور ہوئی۔ اب میں نے سنا ہے کہ علی گڑھ اور اس کے قریب کے باحیثیت زمین داروں و ساہوکاروں کی فیاضی سے ہماری سوسائٹی کو اپنے اجلاس کرنے، چھاپا خانہ اور کتب خانہ کو رکھنے کے واسطے ایک عمارت ملنے کی توقع ہوگئی ہے۔ نیز یہ بھی امید جاری ہے کہ آلات مذکورہ بالا کے بہم پہنچانے کے واسطے بھی کافی روپیہ میسر ہوگا۔ اگر یہ بات صحیح ہے تو باشندگان علی گڑھ سوسائٹی کو ایسی فیاضانہ مدد دے کر، جس سے پورے ملک کو بڑا فائدہ ہوگا ایک دائمی احسان کریں گے۔ ایسی صورت میں میں بہت اصرار کے ساتھ رائے دیتا ہوں کہ سوسائٹی کا موجودہ نام ہی رہنے دیا جائے کیوں کہ وہ مختصر اور کثیر المعنی ہے اور ہر متعلقہ علم کا احاطہ کرتی ہے جو اس ملک کے لوگوں کو خواہ بذریعہ ترجموں کے یا بذریعہ لکچروں کے سمجھایا جانا چاہیے۔''[۲۵]

گراہم کے اس خط کے بعد راجہ جیکشن داس کی تحریک پر تجویز درباب طلب رائے واسطے تبدیلی نام سوسائٹی کے واپس لے لی گئی اور اس طرح سوسائٹی کا نام سین ٹیفک سوسائٹی ہی قائم رہا۔

۱۸۶۴ء میں سرسید غازی پور سے علی گڑھ آ گئے اور سوسائٹی کا سارا سامان بھی ساتھ لیے آئے۔ مسٹر ولیم جیکسن بریملی جو علی گڑھ کے جج تھے سوسائٹی کے پریسیڈنٹ مقرر ہوئے۔ یہاں پر سوسائٹی کے ممبروں کی تعداد بڑھ گئی تو ایک مکان بننے کی تجویز ہوئی۔ اس وقت عالی شان عمارت، دل کشا چمن اور وسیع احاطہ کی صورت میں موجود ہے۔ تقریباً ۳۰۰۰۰ ہزار کی لاگت سے سرسید کی نگرانی میں تیار ہوا۔ اس کی بنیاد کا پتھر آنریبل ڈائمنڈ لفٹننٹ گورنر اضلاع شمال مغرب کے ہاتھوں رکھوایا گیا اور دو کتبے ہز آنر اور مسٹر بریملی جج علی گڑھ کے نام کے، اس کے سب سے بڑے ہال میں اب تک لگے ہوئے ہیں۔ ۱۴ر فروری ۱۸۶۶ء مسٹر ولیمس کمشنر میرٹھ کے ہاتھوں اس کا افتتاح ہوا۔ انھوں نے ایک تقریر بھی کی کہ:

> ''سید احمد خاں کے اس کام کی عظمت میں مبالغہ کرنا فضول ہے۔ تم سب صاحبوں کو معلوم ہے کہ یہ انھیں کا کام ہے اور وہی اس جلسے کے بڑے ترقی دینے والے ہیں اور اس عمدہ عمارت کے جس کے کھولنے کے لیے ہم سب جمع ہوئے ہیں وہی بانی ہیں۔ اخیر کلام میرا یہ ہے کہ سید احمد خاں نے جو محبت لوگوں کے ساتھ ظاہر کی ہے سب کے دلوں کا سبب ہو کہ ہم سب ہندوستانی اور انگریز ایسے بھلے کاموں میں دل سے شریک ہوا کریں اور یہی سید احمد خاں کی بڑی خواہش ہے۔ پس آؤ ہم سب ان کی مدد کریں اور ان کا شکر بھی ادا کریں۔ اے خدا اس انسٹی ٹیوٹ کو سرسبز کرنا۔''[۲۶]

سرسید کی اس کوشش سے اس مکان میں ہر مہینے میں متعدد جلسے ہونے لگے اور سرسید نے چندہ وغیرہ کے علاوہ اپنے پاس سے بھی اس کو فائدہ پہنچایا۔ مثلاً انھوں نے اپنا ذاتی پریس جو انھوں نے آٹھ ہزار روپیہ خرچ کر کے خریدا تھا، سوسائٹی کا سارا کام اسی پر ہوتا تھا۔ اس کو دیکھتے ہوئے سوسائٹی کے چیئرمین جارج ہنری لارنس نے کہا کہ:

''اگر چہ سوسائٹی سید احمد خاں کی فیاضی کی پہلے ہی سے مقروض ہے مگر اب اس احسان کو اس عالی شان عطیے نے اور زیادہ کر دیا ہے۔''

نواب سکندر بیگم صاحبہ مرحومہ رئیسہ بھوپال نے جب یہ سنا کہ:

''سید احمد خاں کی کوشش سے ہندوستان کی بھلائی کے لیے یہ سوسائٹی قائم ہوئی ہے تو جون ۱۸۶۶ء میں انھوں نے بہ طور اظہار خوشنودی کے ایک الماس کی انگوٹھی قیمتی ایک ہزار روپیہ خاص سرسید کے واسطے بھیجی۔ سرسید نے یہ انگوٹھی سوسائٹی کو دے دی۔'' (ص:۱۲۸)

سرسید نے ۳۰ر دسمبر ۱۸۶۵ء کو سوسائٹی کی طرف سے گورنمنٹ شمال مغرب میں، ایک درخواست بھیجی کہ سوسائٹی کا ارادہ ہے کہ اضلاع شمال مغرب کے طریقۂ کاشت کاری پر کتابیں تالیف کرے۔ اگر گورنمنٹ کچھ سالانہ امداد کرتی رہے تو سوسائٹی نے اس کے معاوضہ میں کتابیں دیا کرے گی اور کتابوں کا تالیف کرنا سرسید نے خود اپنے ذمے لیا۔ چنانچہ گورنمنٹ نے اگست ۱۸۶۶ء میں سوسائٹی سے پانسو روپیہ سالانہ کی کتابیں خریدنی منظور کر لیں، مگر یہ کتابیں لکھی نہیں گئیں۔ صرف مضامین کی طولانی فہرست جو سرسید نے سوسائٹی میں پیش کی تھی وہ سوسائٹی اخبار کے پرچہ نمبر ۳۲ جلد اوّل میں درج ہے۔ اس فہرست کے دیکھنے سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ ایک نہایت مشکل کام تھا۔

برٹش انڈین ایسوسی ایشن:

۱۰ر مئی ۱۸۶۶ء کو سرسید کی تحریک سے بہت سے رئیس ضلع علی گڑھ اور اس کے نواح کے اور چند یوروپین افسر سوسائٹی کے مکان میں جمع ہوئے اور سرسید نے ایک لمبی اسپیچ کی جس کا ماحصل یہ تھا کہ:

''ہندوستانیوں کو گورنمنٹ سے اپنے حقوق حاصل کرنے کے لیے پارلیمنٹ سے تعلق پیدا کرنا چاہیے۔ ایسٹ انڈیا کمپنی کی عمل داری میں بڑی دقت

ہندوستان کو یہ تھی کہ اس کے تقریباً تمام معاملات صرف کورٹ آف ڈائرکٹرز تک پہنچتے تھے اور پارلیمنٹ سے بہت ہی کم تصفیہ پاتے تھے۔ مگر اب حکومت ہندوستان کی ملکۂ معظّمہ نے اپنے ہاتھ میں لی ہے اور اب ہندوستان کے امورات کو زیادہ تر پارلیمنٹ سے تعلق رہے گا۔ پس اس غرض کے لیے پارلیمنٹ کے ممبر ہمارے حالات اور معاملات سے بخوبی واقفیت حاصل کریں۔ ہم کو ایسی تدبیر کرنی چاہیے جس سے ہم اپنے صحیح حالات اور مناسب خواہشوں سے ان کو مطلع کرسکیں اور جس طرح ان انگریزوں نے جو ہندوستان میں رہتے ہیں، ایک ایسوسی ایشن ہندوستان میں قائم کرنی چاہی ہے اسی طرح ہم بھی تمام اضلاع شمال مغرب کی طرف سے ایک ایسوسی ایشن اپنے ملک میں قائم کریں اور اس کے ذریعے سے اپنے تمام مطالب اور مقاصد گورنمنٹ اور پارلیمنٹ تک پہنچائیں۔

اس تجویز کو تمام حاضرین نے پسند کیا اور اسی وقت نو معزز ہندو اور مسلمان اس کے ممبر مقرر ہوئے اور اس جماعت کا نام 'علی گڑھ برٹش ایسوسی ایشن' رکھا گیا۔''

لیکن سرسید کی بنارس تبدیلی کے بعد یہ بھی ختم ہوگئی۔ ۱۸۶۶ء میں سوسائٹی کی عمارت تیار ہو جانے کے بعد سرسید نے اپنے منصوبوں کے مطابق اس میں کام شروع کیے۔ جیسے سوسائٹی اخبار کا شائع کرنا، لکچر کروانا، میوزیم و تجربہ گاہ قائم کروانا، تجربات کر کے دکھلانا، ریڈنگ روم و لائبریری قائم کرنا وغیرہ۔

علی گڑھ انسٹی ٹیوٹ گزٹ ۱۸۶۶ء میں سرسید نے اسی ایسوسی ایشن سے نکالا، یہ ان کے آخر دم تک جاری رہا۔ شروع میں اس میں زیادہ تر سیاسیات سے متعلق ہی مضامین لکھے جاتے تھے۔ اس اخبار

کا مقصد ہندوستانیوں کو انگریزوں کی پالیسیوں وغیرہ سے اور انگریزوں کو ہندوستانی عوام کے حالات وغیرہ سے آگاہ کرنا تھا۔ اس اخبار کی خوبی یہ تھی کہ اس کا ایک کالم انگریزی میں اور ایک اردو میں ہوتا تھا۔

اس میں سوشل، اخلاقی اور پولٹیکل مضامین برابر چھپتے تھے۔ اس کی آواز اور اخباروں کی طرح معمولی نہ تھی، بلکہ اس کی آواز حکمراں اور عوام دونوں کے لیے ہی قابلِ توجہ تھی۔

کتاب 'پلر زاوف دی انڈین امپائر' کا مصنف اپنی کتاب میں لکھتا ہے کہ:

''علی گڑھ انسٹی گزٹ سے جو مسلمانوں کا خاص آلہ ہے اگر پچھلے سال کے مضامین جمع کیے جائیں تو ہندوستان کے قابل اور معزز مسلمانوں کی رائے کا اگر چہ وہ تعداد میں کم ہیں، ایک عجیب اور مفید مجموعہ جنگ روم وروس اور روس وافغانستان اور روس وہندوستان کے بن جائے گا۔''[۲۷]

اتنے لمبے عرصے تک جاری رہنے کی وجہ اس کی کچھ خاص خصوصیات تھیں مثلاً اس نے کبھی کسی کی دل آزاری نہیں کی، سنجیدگی اور متانت سے کام لیا۔ قوم کی نسبت دوستی یا خیر خواہی کے خلاف کبھی ایک حرف نہیں لکھا۔ غیر قوم کے عہدہ داروں کی ترقی سے ناراضگی ظاہر نہیں کی، کبھی ہندو یا مسلم ریاست کے خلاف نہیں لکھا، کبھی ہندو مسلم تعصّبات کو بڑھاوا نہیں دیا، ہمیشہ غیر جانب داری سے ہی کام لیا۔ حالاں کہ یہ گورنمنٹ اور اس کے مدبروں پر نکتہ چینی کرتا تھا لیکن تہذیب وتمیز کو ہمیشہ ملحوظ رکھتا تھا۔ اس کی خبروں کا ماخذ ہمیشہ معتبر اور مستند اخبار رہے۔ ہر ایک واقعہ کو پوری دیانت کے ساتھ شروع سے آخر تک مسلسل بیان کرتا تھا۔ اس کی باقاعدگی کا یہ عالم تھا کہ وہ بتیس سال تک برابر جاری رہا۔

انگلستان کی تعلیم وترقی پر غور کرنا:

انگلستان کے طریقۂ تعلیم پر غور کرنے کے بعد سرسید نے لندن ہی میں ایک پمفلٹ انگریزی میں شائع کیا جس میں ہندوستان کے طریقۂ تعلیم کے نقصانات تفصیل کے ساتھ ظاہر کیے تھے۔ تعلیم کے سوا

یورپ کی عام شائستگی اور طرزِ تمدن اور حسن معاشرت اور ہر قسم کی ترقیات کے اسباب جیسا کہ ان کی تحریروں سے ثابت ہوتا ہے ملاحظہ کیے اور جہاں تک ممکن تھا اپنی معلومات کو وسعت دی۔ یورپ کے طریقِ معاشرت کو دیکھا، وہاں کے امرا کے محل اور مکانات اور طرز ماند و بود پر نظر کی، عجائب خانوں اور کتب خانوں میں علوم اور تحقیقات کے ذخیرے ملاحظہ کیے۔ انجینئری کے عجائبات، جہازوں کی تیاری، توپوں کا ڈھلنا، سمندری تار کا بننا، انجینئروں اور عالموں کی سوسائٹیاں، عام کاری گروں اور اہلِ حرفہ کے کام اور عموماً اہلِ انگلستان کے علمی ذوق وشوق اور علمی ترقیات کو دیکھا۔ جس سرگرمی کے ساتھ اہلِ مذہب، مذہب کی حمایت کراتے ہیں اور باوجود اس کے نہایت بے تعصبی سے غیر مذہب والوں کے ساتھ پیش آتے ہیں اور جو اخلاق کہ وہ پڑوسیوں اور مہمانوں کے ساتھ برتتے ہیں یہ سب کچھ دیکھا۔ ان کے عیبوں سے قطع نظر کی اور ان کی خوبیوں کو چنا۔ یہ سب انھوں نے دل لگی کے لیے نہیں دیکھا بلکہ ایک وطن دوست کی طرح دل سوزی، غیرت اور عبرت کی نگاہ سے دیکھا اور انگلستان کی حالت کو اپنے ملک کی حالت سے مقابلہ کر کے اپنے دردِ دل کو بڑھایا اور اس درد کو دوسروں کے دل میں پیدا کرنے کا ذریعہ بنایا۔

وہ لندن سے نہایت قیمتی اطلاعیں لے کر ہندوستان میں آئے جن سے انھوں نے ملک اور قوم کو بے انتہا فائدہ پہنچایا۔ شمالی ہندوستان میں ان سے پہلے ظاہراً کسی ہندو یا مسلمان نے اپنی اولاد کو تعلیم کے لیے ولایت نہیں بھیجا تھا غالباً سید محمود شمالی ہندوستان میں پہلے شخص ہیں جو ولایت سے بیرسٹری کا ڈپلوما لے کر آئے۔

نواب محسن الملک اپنی ایک تحریر میں آنریبل حاجی اسمٰعیل خاں کو لکھتے ہیں کہ:

''سید احمد خاں ولایت گئے، مگر اس مطلب سے کہ اپنی آنکھ سے اس قوم کو جو اس وقت تمام اقوام روئے زمین پر شرف رکھتی ہے انھیں کے گھروں میں اور انھیں کے ملک میں دیکھیں اور جو کچھ وہاں دیکھا ہے واپس آ کر اپنی قوم میں

پھیلائیں۔لوگ ولایت میں جا کر تماشا گاہ، تھیٹر، پارک، میوزیم اور عمارات
کی سیر کرتے ہیں اور یہ حاجی دین اسلام کتب خانہ میں بیٹھا ہوا خطباتِ
احمدیہ کی تصنیف میں منہمک تھا اور کالجوں اور یونیورسٹیوں کے انتظام پر غور
کر رہا تھا۔اس شخص کا ولایت جانا قوم کے واسطے تھا، رہنا قوم کے واسطے اور
واپس آنا قوم کے واسطے۔''[۲۸]

سرسید کی لندن سے روانگی کے بعد ایک لمبا مضمون ہندوستان کے ایک مسلمان سید عبداللہ جو کہ لندن میں مقیم تھے انھوں نے ہوم ورڈ میں مورخہ ۲۶ر ستمبر ۱۸۷۰ء میں سرسید کی نسبت چھپوایا تھا۔ جو سوسائٹی اخبار مورخہ ۱۱ر نومبر ۱۸۷۰ء میں بھی نقل کیا گیا تھا۔اس مضمون میں چند فقرے مختلف مقامات سے یہاں لکھے جاتے ہیں کہ:

''جن انگریزوں سے یہاں (یعنی انگلستان میں) ان کی ملاقات ہوئی ان پر
ان کی عام لیاقت کا اور اس بات کا جن شخصوں نے ان سے ہندوستان کی
بابت گفتگو کی، ان سب کو ہر ایک امر سے بخوبی آگاہ کر دیا۔ بہت عمدہ اثر ہوا
یہاں کے بہت سے مدبرانِ سلطنت کی رائے ہے کہ اگر ہم ایک ایسے لئیق اور
واقف کار ہندوستانی مسلمان سے جیسے کہ سید احمد خاں ہیں نہ ملتے تو
ہندوستانیوں کی لیاقت کی نسبت ہماری رائے ہمیشہ ضعیف اور بودی (پور)
ہوتی۔اس مضمون کے لکھنے سے میری یہ غرض ہے کہ ہندوستان کے لوگوں کو
معلوم ہو جائے کہ جو ہندوستانی تربیت یافتہ اور مہذب ہوتا ہے، اس کی اہلِ
یورپ کتنی بڑی قدر و منزلت کرتے ہیں.... سید احمد خاں کی بدولت اس بات کا
ثبوت حاصل ہونے سے بڑی خوشی حاصل ہوتی ہے کہ اس ملک میں ہندوستان

کے ایک شریف آدمی کی بڑی قدر و منزلت ہوئی ہے اور اعلیٰ درجہ کے انگریز
اس سے بڑی محبت اور تواضع اور تکریم سے پیش آتے ہیں۔''[۲۹]

چنانچہ انھوں نے بجنور میں کافی انگریزوں کی جان بچائی اور جلد ہی انھوں نے اسباب بغاوت ہند لکھ کر حکومت کی غلطیوں کو منظر عام پر لانے کی کوشش کی، لیکن ساتھ ہی ساتھ وہ اس بات سے بھی آگاہ ہو گئے کہ انھیں اب صرف مسلمانوں کی بھلائی کے لیے تدبیریں کرنی چاہئیں۔ کیوں کہ اس وقت ہندوستانی مسلمان دوسرے ملکوں کے مسلمانوں کے مقابلے میں ترقی کے لحاظ سے پیچھے تھے۔ جب کہ ترکی، ایران اور مصر مغربی علوم کی برکتوں کے قابل ہو چکے تھے۔ یہاں تک کہ عرب طلبا کے لیے بھی فرانس میں اعلیٰ پیمانے پر دارالاقاصہ قائم تھا۔ یعنی کہ سب سے زیادہ بری حالت ہندوستانی مسلمانوں کی ہی تھی۔

جب انھوں نے اس راز کو پالیا کہ ہندوستان کی ترقی کا راز تعلیم کے عام ہونے میں مضمر ہے تو انھوں نے ہندو مسلمان دونوں کے لیے تعلیمی ترقی کے منصوبے بنائے اور جب غازی پور میں اسکول قائم کیا تو اس کا سنگِ بنیاد راجا سر دیو نرائن سنگھ بہادر اور مولانا محمد فصیح اللہ کے ہاتھوں رکھوایا۔ راجا جے کشن داس برسوں سائنٹفک سوسائٹی کے بااختیار عہدے دار رہے۔

ہندوستانی قومیت کی حمایت میں سرسید نے بار بار قلم اٹھایا، انھوں نے اپنے اخبار کے صفحات میں بار بار اس خواہش کا اظہار کیا کہ ہندو مسلمانوں میں ایسی دوستی ہو اور ایسے برادرانہ تعلقات پیدا ہو جائیں کہ مسلمان بجز مسجدوں کے اور ہندو بجز مندروں کے کہیں پہچانے نہ جائیں۔ انھوں نے اس خبر پر بڑی خوشی کا اظہار کیا کہ بریلی کے ہندو مسلمانوں میں بڑی یگانگت پیدا ہو گئی ہے۔ مسلمانوں نے گائے کی قربانی بند کر دی ہے اور ہندوؤں نے محرم میں سبیلیں لگائی ہیں۔ انھوں نے لکھا کہ:

''اگر گائے کی قربانی ترک کرنے سے آپس میں ہندو اور مسلمانوں کی دوستی اور
محبت قائم ہو تو گائے کی قربانی نہ کرنا، اس کے کرنے سے ہزار درجہ بہتر ہے۔''

سفر پنجاب کے دوران انھوں نے کہا تھا کہ: ''ایک ملک کے تمام رہنے والے ایک قوم کہلاتے ہیں اور یہ کہ ہندو، مسلمان، عیسائی یہ محض مذہبی الفاظ ہیں ورنہ ملک کے فائدے میں اس کے سب رہنے والے شریک ہوتے ہیں۔''[۳۰]

ایک تقریر میں انھوں نے کہا کہ:

> ''ہندوستان میں رہتے سہتے دونون کا خون بدل گیا، دونوں کی رنگتیں ایک سی ہوگئیں، دونوں کی صورتیں بدل کر ایک دوسرے سے مشابہ ہوگئیں۔ مسلمانوں نے ہندوؤں کی سیکڑوں رسمیں عادتیں لے لیں، یہاں تک کہ ہم دونوں آپس میں ملے کہ ہم دونوں نے مل کر ایک نئی زبان پیدا کرلی، جو نہ ہماری زبان تھی نہ ان کی، پس اگر ہم اس حصے سے جو ہم دونوں میں خدا کا حصہ ہے قطع نظر کرلیں تو درحقیقت ہندوستان میں ہم دونوں بہ اعتبار ہم وطن ہونے کے ایک قوم ہیں۔''

لیکن سرسید کی یہی فخریہ زبان دونوں میں اختلاف کا سبب بنی کیوں کہ ہندوؤں نے جگہ جگہ یہ کوشش کی کہ اردو دفتری زبان کی حیثیت سے باقی نہ رہے، بلکہ سائنٹفک سوسائٹی میں بھی راجا شیو پرشاد کی طرف سے یہ تحریک ہوئی کہ کتابیں دیوناگری رسم خط میں چھاپی جائیں اور اخبار ہندی میں نکالا جائے۔ یہ باتیں سرسید کو ایسی ناگوار گزریں کہ انھیں ہندوؤں سے ایسی بدگمانی ہوئی جو آخر وقت تک دور نہ ہوسکی۔ کیوں کہ انھیں یہ یقین ہوگیا کہ ہندو اس زبان کو مسلمانوں کی نشانی سمجھ کر مٹانے والے ہیں:

۱۸۶۴ء میں اٹاوہ کے بابو دینا ناتھ گنگولی نے اس خیال کا اظہار کیا تھا کہ: ''اردو مسلمانوں کی زبان ہے اور مسلمانوں کے عہد میں اس کا سیکھنا کارآمد تھا لیکن اب اسے ترک کردینا چاہیے ورنہ ہندو اپنی مذہبی کتابوں سے بے بہرہ ہوجائیں گے اور سنسکرت جو ہندوستان کی اصلی زبان ہے اس کی طرف توجہ کرنی چاہیے تاکہ رفتہ رفتہ سب کی زبان ایک ہوجائے۔''[۳۱]

سرسید نے انسٹی ٹیوٹ گزٹ کے صفحات میں اس کی شدید مخالفت کی تھی اور سنسکرت کو ایک مردہ زبان بتایا تھا۔ ایک وقت ایسا آیا کہ سرسید کو یقین ہوگیا کہ اب ہندو مسلمان اتحاد ممکن نہیں۔ انھوں نے محسن الملک کو ایک خط میں لکھا کہ:

''میں سمجھتا ہوں کہ اگر مسلمان ہندو سے علیحدہ ہوکر اپنا کاروبار کریں گے تو مسلمان کو زیادہ فائدہ ہوگا اور ہندو نقصان میں رہیں گے۔ حالاں کہ میں کل ہند کیا مسلمان سب کی بھلائی چاہتا ہوں۔''[۳۲]

مدراس کے گورنر نے جب یہ کہا تھا کہ:

''عقاب چڑیوں کی چائیں چائیں کی کچھ پرواہ نہیں کرتا، لیکن باز یا جرہ اس کے آگے چوں بھی کرتا ہے تو فوراً اس کی گردن توڑ دیتا ہے۔''[۳۳]

اس لیے اب سرسید ہر وقت مسلمانوں کی بھلائی کے لیے ہی تدبیریں و منصوبے بناتے رہتے۔ کبھی مضامین لکھتے، کتابیں لکھتے، تقریریں کرتے، سیاسی انجمنیں قائم کرتے، لیکن افسوس کی بات یہ تھی کہ سرسید کے پاس کام زیادہ اور وقت کم تھا لیکن وہ مسلمانوں کی حالت پر برابر غور و فکر کرتے رہے۔ اسی دوران ان کا تبادلہ غازی پور میں ہوگیا۔ اس کا فائدہ یہ ہوا کہ یہاں انھیں ذرا سکون سے غور و فکر کرنے کا موقع مل گیا اور ایک وقت ایسا آیا کہ انھوں نے اپنی بیمار قوم کا علاج تلاش کر ہی لیا۔ وہ یہ کہ انھیں اندازہ ہوگیا کہ جب تک مسلمان جدید تعلیم سے روشناس نہ ہوں گے تب تک وہ اس گہرے تاریک گڑھے سے باہر نہیں نکل سکتے۔

اب سرسید کے سامنے جدید تعلیم کو مسلمانوں میں عام کرنا تھا اس کے لیے انھیں خوب معلوم تھا کہ انھیں کافی جدوجہد کرنی ہے، لیکن انھوں نے ہمت نہ ہاری۔ آخر کار انھوں نے اسی مقصد کے لیے سفر انگلستان کا ارادہ کیا۔

سرسید یکم اپریل ۱۸۶۹ء میں بنارس سے اپنے بیٹوں سید حامد، سید محمود، دوست خداداد بیگ اور اپنے خدمت گار چھجو کے ساتھ انگلستان گئے۔ وہاں ان کی نظر ایڈیسن اور اسٹیل کے جاری کیے ہوئے رسالوں پر پڑی جو کہ انھوں نے اپنی قوم کو سدھارنے اور انھیں بیدار کرنے کے لیے جاری کیے تھے۔ تا کہ وہ اپنی قوم کو جھوٹی بناوٹی زندگی سے آزاد کریں اور انھیں سادہ زندگی گزارنے پر آمادہ کریں۔ سرسید لکھتے ہیں کہ:

''ان پرچوں کے جاری ہونے سے انگریزوں کے اخلاق اور عادات اور دین داری کو نہایت فائدہ پہنچا اور ہر ایک کے دل پر ان کا اثر ہوا۔ جس زمانے میں کہ پہلے پہل ٹیلر نکلا ہے انگلستان کے لوگوں کی جہالت اور بداخلاقی اور ناشائستگی نفرت کے قابل تھی۔ وضع دار لوگ کیا مرد کیا عورت تحصیل علم سے نفرت رکھتے تھے اور علم پڑھنے کو خود فروشی و یاد فروشی کہتے تھے اور کمینوں کا کام سمجھتے تھے۔ جہالت کی شرم کسی کو نہ تھی، عورت کا پڑھا لکھا ہونا اس کی بدنامی کا باعث ہوتا تھا.... عورتیں آپس میں بدگوئی کیا کرتی تھیں۔ خلاف تہذیب کی باتیں کرنا گویا ایک بڑی وضع داری گنی جاتی تھی.....''[۳۴]

ایک دفعہ لکھا تھا کہ: ''میں اخلاق میں خوش طبعی کی جان ڈالوں گا، خوش طبعی کو اخلاق سے ملاؤں گا، تا کہ جہاں تک ممکن ہو اس کے پڑھنے والے دونوں باتوں میں نصیحت پاویں اور تا وقتیکہ لوگ ان تمام خرابیوں سے جن میں اس زمانے کے لوگ پڑے ہیں سنبھل جاویں۔ ہر روز ان کو نصیحت کی باتیں یاد دلاتا رہوں گا، کیوں کہ جو دل ایک دن بھی بے کار پڑا رہتا ہے اس میں بے شمار عیب جڑ پکڑ جاتے ہیں جن کے ریشے بہت مشکل سے دور ہوتے ہیں۔ سقراط کی نسبت ایسا کہا گیا ہے کہ اس نے فلسفے کو آسمان سے اُتارا اور انسانوں میں بسایا مگر میں اپنی نسبت صرف اتنا ہی کہلانا چاہتا ہوں کہ میں نے فلسفے کو مدرسوں اور

مکتبوں کے کتب خانے کی کوٹھری سے نکالا اور جلسوں اور چائے خانوں وقہوہ خانوں تک پھیلایا اور ایک ایک کے دل میں بسایا۔''

لہٰذا سرسید نے واپس آ کر تہذیب الاخلاق سے یہی کام ہندوستان میں لیا۔

لیکن ہندوستان میں مسئلہ الگ تھا کیوں کہ ایڈیسن اور اسٹیل نے مذہبی معاملات میں دخل اندازی نہیں کی تھی، لیکن ہندوستان میں اس پرچے پر کافی اختلاف ہوا۔ کیوں کہ سرسید نے جب یہ دیکھا کہ مسلمان ہر معاملے میں مذہب کا سہارا لے کر یہ کہتے ہیں کہ یہ چیز ممنوع ہے اور اگر اس سے روکا جاتا تو یہ کہتے کہ اس کے کرنے سے ثواب ہے۔ اس لیے سرسید کو مجبوراً یہ کہنا پڑا کہ جس چیز کو تم مذہب سمجھ رہے ہو وہ مذہب نہیں یکسر تمہاری اختراعات ہیں۔ سرسید کی اس بات نے لوگوں کو ناراض کر دیا اور کافر، مرتد، ملحد، زندیق، اسلام کا دشمن، مسلمانوں کا ہاجی، قوم کا عیب جو کہا گیا ہے، لیکن اتنی مخالفت کے باوجود سرسید نے اس پرچے سے اس وقت تک خدمت انجام دیں جب تک کہ قوم پوری طرح سے بیدار نہ ہوگئی اور اس پرچے نے واقعی ایسی خدمت انجام دی کہ وہ قوم جو اپنی خوبیوں، خرابیوں سے نا آشنا تھی، اب وہی قومی ہمدردی، قومی خیر خواہی سے آشنا ہوگئی۔ اس میں اپنی مدد کا جذبہ پیدا ہوا، جدید علوم سے آشنا ہوئی، اجتماعی قوت کے احساس سے آشنا ہوئی۔ انھوں نے اپنے شعر وادب کا تنقیدی نظریے سے جائزہ لیا اور اس کی ترقی کی طرف قدم بڑھایا۔ مذہبی اور غیر مذہبی رسم ورواج میں تمیز کرنا سکھایا۔

جدید تعلیم:

سرسید کے نزدیک جدید تعلیم ہی مسلمانوں کی پریشانی کا واحد علاج تھا۔ اس لیے انھوں نے اپنی ساری توجہ اسی طرف مبذول کر دی، لہٰذا اس کے لیے انھوں نے طرح طرح کے منصوبے بنائے۔ مسلم ایجوکیشنل کانفرنس کے قیام کا مقصد ہی یہ تھا کہ ملک میں ہر طرف تعلیمی ادارے قائم کیے جائیں۔ اس کے سالانہ جلسوں میں مختلف علاقوں کی تعلیمی پیش رفت کا جائزہ لیا جائے، یہی نہیں بلکہ علی گڑھ میں

محمڈن اینگلواورینٹل کالج کا قیام بھی اسی مقصد کے تحت کیا گیا۔ ان کے تعلیمی منصوبوں میں علی گڑھ اورینٹل کالج کو خاص اہمیت حاصل ہے۔ یہی وہ کالج تھا جس کے لیے سرسید نے اپنی زندگی کو اس کی ترقی واستحکام کے لیے وقف کر دیا تھا۔ اس کے لیے انھیں کافی محنت اور جدوجہد کرنی پڑی، لیکن وہ ہمت نہیں ہارے۔

محمڈن ایجوکیشنل کانفرنس قائم کرنا:

اس کا پہلا جلسہ ۲۷/دسمبر ۱۸۸۶ء کو بہ مقام علی گڑھ محمڈن اینگلواورینٹل کالج میں منعقد ہوا۔ اس کانفرنس کے مقاصد اوّلاً حسب ذیل قرار دیے گئے:

(۱) مسلمانوں میں مغربی تعلیم کو اعلیٰ درجہ تک پہنچانے میں کوشش کرنا (۲) مسلمانوں کی تعلیم کے لیے جو انگریزی مدرسے مسلمانوں کی طرف سے جاری ہوں ان میں مذہبی تعلیم کے حالات دریافت کرنا اور تا مقدور عمدگی سے اس تعلیم کے انجام پانے میں کوشش کرنا (۳) علوم مشرقی اور دینیات کی تعلیم جو علمائے اسلام جابجا بہ طور خود دیتے ہیں اس کو تقویت دینا اور اس کو بدستور قائم اور جاری رکھنے کی مناسب تدبیریں عمل میں لانا (۴) جو تعلیم قدیم طرز پر دیسی مکتبوں میں جاری ہے اس کے حالات کی تفتیش کرنا اور ان میں جو تنزل ہو گیا ہے اس کی ترقی اور توسیع کی تدبیریں اختیار کرنا۔ قرآن خوانی اور حفظ قرآن کے لیے جو مکتب جاری ہیں اور جن کو روز بروز تنزل ہوتا جاتا ہے ان کے حالات کی تفتیش کرنا اور ان کے قائم رکھنے اور استحکام دینے کی تدبیریں عمل میں لانا۔[۳۵]

۲/اکتوبر ۱۸۷۰ء کو سرسید، سید حامد کے ساتھ ولایت سے بنارس آئے۔ یہاں آکر انھوں نے مسلمانوں کی تعلیم پر خاص توجہ دی (کیوں کہ انھوں نے یہ سفر اسی مقصد کے لیے کیا تھا) اس میں انھیں دو مشکلوں کا سامنا کرنا پڑا۔ (۱) مسلمانوں کے مذہبی اوہام، انگریزی تعلیم سے نفرت اور (۲) ایجوکیشن کے مفہوم سے ناواقفیت۔

رسالہ تہذیب الاخلاق کے پہلے شمارے میں سرسید نے رسالہ کے مقاصد بیان کرتے ہوئے لکھا ہے:

''اس پرچے کے اجرا سے مقصد یہ ہے کہ ہندوستان کے مسلمانوں کو کامل درجے کی سولیزیشن یعنی تہذیب اختیار کرنے پر راغب کیا جائے، تاکہ جس حقارت سے سویلائزڈ یعنی مہذب قومیں ان کو دیکھتی ہیں وہ رفع ہو اور وہ بھی دنیا میں معزز مہذب قوم کہلاویں۔''

بعد کے ایک پرچے میں اس مقصد کی تفصیل یوں بیان کی ہے:

''جب ہم کسی قوم کو تہذیب کی طرف مائل کرتے ہیں تو ہم کو یہ ضرور ہے کہ ہم یہ بھی بتادیں کہ اس قوم کو کن کن چیزوں میں تہذیب کرنی چاہیے۔ ہندوستان کے مسلمانوں کے جو حالات ہیں ان کے لحاظ سے ہمارے خیال میں آتا ہے کہ مفصلہ ذیل چیزیں ہیں جن کی تہذیب پر ان کو متوجہ ہونا چاہیے:

(۱) آزادیٔ رائے (۲) درستی عقائد مذہبی (۳) خیالات وافعال مذہبی

(۴) تدقیق بعض مسائل مذہبی (۵) تصحیح بعض مسائل مذہبی (۶) تعلیم اطفال

(۷) سامان تعلیم (۸) عورتوں کی تعلیم (۹) ہنر وفن حرفہ

(۱) آزادیٔ رائے:

یعنی مسلمانوں نے تقلید کرتے کرتے اپنے خیالات کو اتنا پامال کردیا ہے جس کی وجہ سے وہ ترقی سے دور ہوگئے ہیں۔ اس لیے جب تک رائے کی آزادی ان میں پیدا نہ ہوگی، اس وقت تک یہ تہذیب سے محروم رہیں گے۔

(۲) درستی عقائد مذہبی:

ہندوستان کے مسلمانوں کے مذہبی عقائد بھی اسلام کے مطابق نہیں ہیں۔ کتابی عقائد الگ ہیں اور ان کے دلوں میں بسے ہوئے عقائد الگ ہیں۔ بلکہ اگر یہ کہا جائے کہ انھوں نے شرک اختیار کرلیا ہے تو بے جا نہ ہوگا۔

اس لیے ان کی تہذیب کرنا اور اپنے عقائد کو ہیئت اسلام کے مطابق کرنا اور اسی پر یقین رکھنا تہذیب وشائستگی حاصل کرنے کی اصل جڑ ہے۔

(۳) خیالات وافعال مذہبی:

ہندوستانی مسلمانوں میں صدہا خیال اور توہمات ایسے موجود ہیں جن کو وہ عمدہ افعال مذہبی سمجھ کر ادا کرتے ہیں۔ حالاں کہ ان کو مذہب اسلام سے کچھ علاقہ نہیں ہے یا تو وہ خود بدعت ہیں یا رسومات وخیالات کفر وشرک ہیں جو باعث ہمارے نامہذب ہونے کے ہیں۔ پس ہم کو مہذب ہونے کے لیے ان کی تہذیب درکار ہے۔

(۴) تدقیق بعض مسائل مذہبی:

ہمارے مذہب کے بعض صحیح اور اصلی مسائل ایسے ہیں جن کی پوری پوری تحقیق وتدقیق اب تک نہیں ہوئی ہے اور اگرچہ مسائل فی نفسہٖ صحیح اور درست ہیں۔ الا بیان واضح وتحقیق کامل نہ ہونے کے سبب علوم عقلیہ کے برخلاف اور تہذیب وشائستگی کے مخالف معلوم ہوتے ہیں۔ پس ہم کو ان کی تشریح و تفسیر میں تہذیب کرنی چاہیے۔

(۵) تصحیح بعض مسائل مذہبی:

ہم کچھ شک نہیں کرتے کہ بعض مسائل ایسے بھی ہیں یا یوں کہو کہ بعض ایسے مسائل کا ہونا ممکن ہے جن میں متقدمین نے غلطی کی ہو۔ پس ان کو بحث میں لانا اور ایک امر منقح ٹھہرانا ہمارے لیے ضروری ہے۔

(۶) تعلیم اطفال:

مذہب کے بعد جو چیز سب سے زیادہ ضروری ہے وہ تعلیم ہے۔ ہم کو زمانہ گذشتہ اور حال پر نظر کر کے ایک ایسا طریقۂ تعلیم معین کرنا چاہیے جس سے علوم دینی و دنیوی دونوں قسم کو اعلیٰ درجہ تک قابو ملے۔

(۷) سامان تعلیم:

ہمارے لیے صرف طریقۂ تعلیم کا معین کرنا کافی نہیں ہوگا، بلکہ آپس کی مدد اور مجموعی ہمت اور فیاضی سے اس کا سامان بھی مہیا کر دینا ضروری ہوگا۔

(۸) عورتوں کی تعلیم:

کچھ شبہ نہیں کہ قومی تہذیب وشائستگی کے لیے عورتوں کا تعلیم یافتہ ہونا ضروری ہے۔ پس ہم کو لڑکیوں کی تعلیم کے لیے اور ان کو دست کاری سکھانے کے لیے کوئی عمدہ بندوبست کرنا چاہیے۔

(۹) ہنر وفن حرفہ:

اپنی قوم میں ہر قسم کے ہنر اور صنعت اور فن وحرفہ کو پھیلانا اور ترقی دینا قومی تہذیب کا ایک بہت بڑا جزو ہے۔

اس کے بعد اخلاقی، معاشرتی اور معاشی زندگی کی بیس اور شقوں کا ذکر ہے جن کی اصلاح و ترقی تہذیب الاخلاق کے مقصد میں داخل ہے۔ عنوانات درج ذیل ہیں:

(۱) خرد عرضی (۲) عزت اور غیرت (۳) ضبط اوقات

(۴) اخلاق (۵) صدق مقال (۶) دوستوں سے راہ ورسم

(۷) کلام (۸) لہجہ (۹) طریق زندگی

(۱۰) صفائی (۱۱) طرزِ لباس (۱۲) طریق اکل وشرب

(۱۳) تدبیر منزل (۱۴) رفاہ عورتوں کی حالت (۱۵) کثرتِ ازدواج

(۱۶) غلامی (۱۷) رسوماتِ شادی (۱۸) رسومات غمی

(۱۹) ترقیِ زراعت (۲۰) تجارت

اس سے اندازہ ہوگیا ہوگا کہ اصلاح وتجدید کا جو تصور سید صاحب کے ذہن میں تھا، وہ مسلمانوں کی اجتماعی اور انفرادی زندگی کے تقریباً کل شعبوں کو محیط تھا۔ ایک اور جگہ تہذیب الاخلاق کے مقاصد کی بحث میں ان خرابیوں کا ذکر کرتے ہوئے جن کی اصلاح کے لیے یہ پرچہ نکالا گیا تھا۔ فرماتے ہیں:

> ''علم وادب وانشا کی خوبی صرف لفظوں کے جمع کرنے اور مبالغہ آمیز باتوں کے لکھنے پر منحصر ہے۔ یہاں تک کہ دوستانہ خط وکتابت اور چھوٹے چھوٹے روزمرہ کے رقعوں میں بھی یہ سب برائیاں بھری ہوئی ہیں۔ کوئی خط یا رقعہ ایسا نہ ہوگا جس میں جھوٹ اور وہ بات جو حقیقت میں دل میں نہیں ہے، مندرج نہ ہو۔ خطوط رسمیہ کہ پڑھنے سے ہرگز تمیز نہیں ہوسکتی کہ حقیقت میں اس خط کا لکھنے والا ایسا ہی ہمارا دوست ہے۔ جیسا کہ لکھنے کا عموماً رواج پڑ گیا ہے۔ پس ایسی طرز تحریر نے ہم کو جھوٹی اور بناوٹی تحریر کا عادی کر دیا ہے۔''[۳۶]

تہذیب الاخلاق کی زندگی کا پہلا دور ۶ یا ۷ سال تک رہا۔ اس نے مسلمانوں کو بے حسی اور بے عملی کی نیند سے جھنجھوڑ کر جگایا، یاس کی تاریکی میں انھیں امید کی روشنی دکھائی۔ نفسی نفسی کے زمانے میں ان کے ذہن میں ملک وقوم کا تصور اور ان کے دل میں ملت کا درد پیدا کیا اور انھیں اصلاح وترقی پر مائل کیا۔

اسی دوران سید صاحب کو جلد یہ محسوس ہوگیا کہ مغربی تعلیم کے لیے علی گڑھ میں ایک کالج کھولنے کی تجویز جو فوری ضرورت کے لحاظ سے ان کی تجویزوں میں سب سے زیادہ اہم تھی، اس وقت تک کامیاب نہیں ہوسکتی جب تک انھیں ممتاز اور سربرآوردہ مسلمانوں کا تعاون حاصل نہ ہو، اور یہ تعاون تبھی حاصل ہوگا جب وہ مسلمانوں کی عام زندگی خصوصاً مذہبی زندگی کی اصلاح وتجدید سے ہاتھ کھینچ لیں۔ سرسید

۱۸۷۶ء میں پنشن لے کر علی گڑھ میں مقیم ہو گئے۔ تا کہ اس اسکول کو جو ۱۸۷۵ء میں یہاں قائم ہوا تھا، کالج کے درجے تک پہنچانے کی کوشش کریں اور ۱۸۷۷ء میں ایم۔اے۔او کالج کی بنیاد رکھنے کے بعد تہذیب الاخلاق کو بند کرنے کا اعلان کر دیا۔

تہذیب الاخلاق کو بند کرنے کی پہلی وجہ یہ تھی کہ اب انھیں ایم۔اے۔او کالج کے لیے چندہ اکٹھا کرنا تھا۔ اس لیے اتنی فرصت نہ تھی کہ وہ اور ان کے دوست رسالے کو پابندی سے نکال سکیں۔ دوسری وجہ سید صاحب نے خود بتائی کہ:

> ''سات برس تک ہم نے بذریعہ اس پرچے کے اپنی قوم کی خدمت کی، مذہبی بے جا جوش سے جس تاریک گڑھے میں وہ چلی جاتی تھی اس سے خبردار کیا۔ دنیاوی باتوں میں جن تاریک خیالات کے اندھیرے میں وہ مبتلا تھی، ان کو روشنی دکھائی.....قومی ہمدردی، قومی عزت، سیلف آنر یعنی اپنی عزت کا آپ خیال، اگر ہم نے اپنی قوم میں پیدا نہیں کیا تو ان لفظوں کو ضرور اردو زبان کے علم و ادب میں داخل کیا۔ ہم نے کچھ کیا ہو یا نہ کیا ہو، مگر ہر طرف سے تہذیب و شائستگی کا غلغلہ سنا۔ قومی ہمدردی کی صداؤں کا ہمارے کانوں میں آنا، اردو زبان کے علم و ادب کا ترقی پانا، یہی ہماری مرادیں تھیں جن کو ہم نے بھر پایا۔ اب بہت لوگ ہیں جو ان باتوں کو پکارتے ہیں گو اس وقت ٹیڑھی میڑھی لہریں کھاتے ہیں۔ مگر پانی میں حرکت آ جانا ہی کافی ہے۔ پھر وہ خود اپنی پنسال میں آپ چورس ہو رہے گا۔ اس لیے مناسب ہے کہ اب ہم بس کریں اور پانی کو اپنی پنسال میں آپ چورس ہونے دیں۔ ہمارے دوست ہماری اس خاموشی کا کوئی سبب دور از کار خیال نہ کریں گے اور نہ اس پر التفات کریں گے۔'' (ص:۵)

پھر انھوں نے دوبارہ اس کی اشاعت شروع کی جو سوا دو برس اور بعد میں سوا تین برس جاری رہ کر بند ہو گیا۔

علی گڑھ میں مدرسۃ العلوم ۲۴ رمئی ۱۸۷۵ء جو کہ ملکۂ معظّمہ کی سال گرہ کا دن مدرسہ کے افتتاح کی تاریخ قرار پائی۔ جب علی گڑھ میں مدرسہ کو قائم ہوئے ایک سال گزر گیا تو سرسید بھی بنارس سے اپنی سرکاری نوکری چھوڑ کر اس کی خدمت میں لگ گئے۔ انھیں نوکری اس لیے چھوڑنی پڑی کیوں کہ وہ مصروف رہتے تھے اور اس کے لیے چندہ کرنے میں بھی انھیں تھوڑی ہچکچاہٹ ہوتی تھی۔ جب وہ علی گڑھ آئے تو ان کی پہلی کوٹھی تو لندن جانے کے لیے گروی رکھی ہوئی تھی اس لیے سید محمود نے دوسری کوٹھی خریدی۔ سرسید کے آنے کی خوشی میں علی گڑھ کے رؤسا نے ایک شان دار جلسہ اور دعوت رکھی۔ اس جلسے میں سرسید کی خدمات کی تعریف ہوئی، تو سرسید نے بھی ایک چھوٹی سے تقریر کی۔ کہا کہ:

> ''ہاں یہ بات سچ ہے کہ میں نے اپنے اس قدیم نامی اور پرانے شہر کو جہاں میرے بزرگوں اور عزیزوں کی ہڈیاں اب تک زمین میں پڑی ہیں اور جہاں میرے بہت سے عزیز اب تک رہتے ہیں جس کی مٹی سے لوگوں نے خیال کیا تھا میں بنا ہوں اور پھر اسی میں میری خاک مل جائے گی۔ صرف مدرسۃ العلوم کی محبت، اپنی قوم کی بھلائی اور رئیسانِ ضلع علی گڑھ و بلند شہر کی محبت و عنایت کے خیال سے چھوڑا ہے اور یہاں ایک غریب مسافر کی طرح سکونت اختیار کی ہے۔ میں نے صرف اس خیال سے کہ کیا راہ ہے جس سے قوم کی حالت درست ہو؟ دور دراز سفر اختیار کیا اور بہت کچھ دیکھا جو دیکھنے کے لائق تھا۔ میں آپ کو یقین دلاتا ہوں کہ جب میں نے کوئی عمدہ چیز دیکھی، جب دیکھی، عالموں اور مہذب آدمیوں کو دیکھا، جب کبھی علمی مجلسیں دیکھیں، جہاں کہیں

عمدہ مکانات دیکھے، جب کبھی عمدہ پھول دیکھے، جب کبھی کھیل کود عیش و آرام کے جلسے دیکھے، یہاں تک کہ جب کبھی کسی خوب صورت شخص کو دیکھا، مجھ کو ہمیشہ اپنا ملک اور اپنی قوم یاد آئی اور نہایت رنج ہوا کہ ہائے ہماری قوم ایسی کیوں نہیں؟ جہاں تک ہوسکا ہر موقع پر میں نے قومی ترقی کی تدبیروں پر غور کیا۔ سب سے اوّل یہی تدبیر سوجھی کہ قوم کے لیے قوم ہی کے ہاتھ سے ایک مدرسۃ العلوم قائم کیا جائے، جس کی بنا آپ کے شہر میں اور آپ کے زیر سایہ پڑی ہے۔''[۳۷]

بنارس کی نوکری کے دوران سرسید نے فائدہ اٹھاتے ہوئے وہاں کے لوگوں سے چندہ وصول نہیں کیا، کیوں کہ اس دوران جس قدر چندہ ہوا، وہ علی گڑھ، لاہور، پٹنہ، مرزاپور اور پٹیالہ وغیرہ سے ہوا۔ بنارس میں انھوں نے اپنے ہندو اور مسلمان دوستوں کے علاوہ چندہ وصول نہیں کیا۔ ہنی ریڈنگ کا جلسہ قرار دیا، تو دوستوں نے سمجھایا کہ لوگ تماشا والا کہیں گے۔ سرسید نے کہا کہ:

''اگر میں لوگوں کے کہنے کا خیال کرتا تو جو کچھ اب تک کیا ہے اس میں سے کچھ بھی نہ کرسکتا۔ لوگوں کے کہنے کا کچھ خیال نہ کرو، بلکہ یہ دیکھو کہ اس سے درحقیقت قوم کو فائدہ پہنچے گا یا نہیں۔''[۳۸]

اسی جلسے میں سرسید نے کہا کہ:

''کون ہے جو آج مجھ کو اسٹیج پر دیکھ کر حیران ہوتا ہوگا؟ وہی جن کے دل میں قوم کا درد نہیں، وہی جن کا دل جھوٹی شیخی اور جھوٹی مسیحت سے بھرا ہوا ہے۔ آہ اس قوم پر جو شرم ناک باتوں کو اپنی شیخی اور افتخار کا باعث سمجھیں اور جو کام قوم اور انسان کی بھلائی کے لیے نیک نیتی سے کیے جائیں ان کو بے عزتی کے کام

سمجھیں۔ آہ اس قوم پر جو لوگوں کو دھوکا دینے کے لیے مکر و پندار کے کالے سوت سے بنے ہوئے تقدس کے برقع کو اپنے منھ پر ڈالے ہوئے ہوں مگر اپنی بدصورتی اور دل کی برائی کا کچھ علاج نہ سوچیں۔ آہ اس پر جو اپنی قوم کو ذلت اور نکبت کے سمندر میں ڈوبتا ہوا دیکھے اور خود کنارے پر بیٹھا ہنستا رہے۔ اپنے گھر میں کھلے خزانے سے ایسی بے شرمی اور بے حیائی کے کام کرے جن سے بے شرمی اور بے حیائی بھی شرما جائے لیکن قوم کی بھلائی کے کام کو شرم اور نفریں کا کام سمجھے۔''[۳۹]

''اے رئیسو اور دولت مندو! تم اپنی دولت و حشمت پر مغرور ہو کر یہ مت سمجھو کہ قوم کی بری حالت ہو اور ہمارے بچوں کے لیے سب کچھ ہے۔ یہی ان لوگوں کا خیال تھا جو تم سے پہلے تھے، مگر اب انھیں کے بچوں کی وہ نوبت ہے جس کے لیے ہم آج اسٹیج پر کھڑے ہیں۔ اے صاحبو! ہر کوئی تسلیم کرتا ہے کہ تعلیم نہ ہونے سے قوم کا حال روز بروز خراب ہوتا جاتا ہے۔ قوم کے بچے اخراجات تعلیم کے سرانجام نہ ہونے سے ذلیل اور رذیل ہوتے جاتے ہیں۔ میں نے کوئی پہلو ایسا نہیں چھوڑا جس سے قوم کے غریب بچوں کے اخراجات تعلیم میں مدد پہنچے۔ مگر افسوس! کامیابی نہیں ہوئی خود لوگوں سے بھیک مانگی، مگر قلیل ملی، والنٹیر بنانے چاہے، مگر بہت کم بنے اور جو بنے ان سے کچھ بن نہ آئی۔ پس میں اسٹیج پر اس لیے آیا ہوں کہ قوم کے بچوں کی تعلیم کے لیے کچھ کر سکوں۔''[۴۰]

سرسید نے مدرسہ کی خاطر ہر بات کو اپنے نفس پر گوارہ کر لیا تھا، اسی سلسلے میں انھوں نے لاہور میں لکچر دیا۔ یہاں پر دس بارہ ہزار آدمی موجود تھے، انھوں نے مذہبی مخالفتوں کا ذکر کرتے ہوئے کہا کہ:

''فرض کرو کہ میں ایک بدعقیدہ ہوں، مگر اے بزرگانِ پنجاب! میں آپ سے پوچھتا ہوں کہ اگر ایک کافر مرتد آپ کی قوم کی بھلائی میں کوشش کرے تو کیا آپ اس کو اپنا خادم اور اپنا خیر خواہ نہ سمجھیں گے! آپ کے لیے دولت سرا بنانے میں جس میں آپ آرام کرتے ہیں اور آپ کے بچے پرورش پاتے ہیں، یا آپ کے لیے مسجد بنانے میں جس میں آپ خدائے واحد ذوالجلال کا نام پکارتے ہیں چوڑھے، چمار، قلی، کافر، بت پرست، بدعقیدہ سب مزدوری کرتے ہیں، مگر آپ نہ کبھی اس دولت خانہ کے دشمن ہوتے ہیں اور نہ کبھی اس مسجد کے منہدم کرنے پر آمادہ ہوتے ہیں۔ آپ مجھ کو بھی اس مدرسہ کے قائم کرنے میں ایک قلی چمار کی مانند تصور کیجیے اور میری محنت اور مشقت سے اپنے لیے گھر بننے دیجیے اور اس وجہ سے کہ اس کا بنانے والا یا اس میں مزدوری کرنے والا ایک قلی، چمار ہے اپنے گھر کو مت ڈھایئے۔''[۴۱]

علی گڑھ تحریک کے وجود میں آنے کے اسباب پر ہم روشنی ڈال چکے ہیں۔ اس لیے اب ہماری کوشش یہ ہے کہ اس کے اہم پہلوؤں پر بھی روشنی ڈالیں اور معلوم کریں کہ یہ پہلو کیا تھے اور کس حد تک کامیاب رہے۔

تحریک کے پہلوؤں کی تعداد بھی لامحدود ہے کیوں کہ یہ تحریک ایک ایسی بیمار قوم کے علاج کے لیے وجود میں آئی تھی کہ جو ہر لحاظ سے اپاہج تھی۔ کان ہوتے ہوئے بہری، آنکھ ہوتے ہوئے اندھی، ہاتھ ہوتے ہوئے لولی، پیر ہوتے ہوئے لنگڑی، منھ ہوتے ہوئے گونگی اور دل و دماغ ہوتے ہوئے ناسمجھ اور نافہم تھی۔ ظاہر ہے کہ جب بیماری طویل ہوتی ہے تو اس کا علاج و پرہیز بھی طویل ہوتا ہے۔

اس تحریک نے مسلمانوں کی جمودی کیفیت کو متحرک کیا۔ مسلمانوں میں جو محدودیت پیدا ہوگئی تھی اس کو لامحدود کیا۔ اس میں وسعت پیدا کی، ان کی اندرونی کش مکش کو دور کر کے خارجی حالات کی طرف راغب کیا۔ اسلام کے دائرے میں رہتے ہوئے نئے دور سے استفادہ کرنا سکھایا۔ تقلیدی روش کو مسمار کر کے جدید روش پر چلنے کی دعوت دی۔

تحریک کا کام ہی جمود کو توڑ کر حرکت پیدا کرنا ہوتا ہے، لیکن علی گڑھ تحریک ایک ایسی تحریک ہے کہ جس نے ایک دو جمود کو متحرک نہیں کیا۔ چوں کہ اس زمانے میں مسلمانوں کے جمود کی شکل بھی لامحدود تھی، اس کو حرکت میں لانے کی کوشش کی گئی۔ یہ لامحدود جمود ہی اس کے اہم پہلوؤں کی شکل میں سامنے آیا۔

علی گڑھ تحریک کی اگر مختصر تعریف کی جائے تو صرف اتنا ہی کافی ہے کہ ''اس تحریک نے مریض مسلمان قوم کی اصلاح کی۔'' اس نے مسلمانوں کو موجودہ حالت سے واقف کرایا۔ علی گڑھ تحریک کی فکری اساس کا مطالعہ اور جائزہ درج ذیل عنوانات کے تحت پیش کیا جا سکتا ہے:

(۱) عقلیت (۲) مادّیت (۳) اجتماعیت (۴) سیاست

(۱) عقلیت:

مسلمانوں کی اس بُری حالت کو سدھارنے کے لیے سرسید کے نزدیک ایک اہم ذریعہ صرف جدید تعلیم تھی لیکن مسلمانوں کا رجحان اس کی طرف بالکل نہیں تھا۔ اس لیے سرسید نے ان کی اس دُکھتی ہوئی رگ پر ہاتھ رکھا جس کی وجہ سے وہ جدید تعلیم کو قبول کرنے میں ہچکچاہٹ محسوس کر رہے تھے اور وہ دُکھتی ہوئی رگ مذہب تھا۔

سرسید نے اپنے نظریۂ عقلیت کی بنا پر مذہب کو تحقیق و دلائل سے سمجھنے کی دعوت دی، عقل کی تعریف کرتے ہوئے لکھتے ہیں کہ:

''انسان اور جانور کے درمیان جو شے خط امتیاز کھینچتی ہے وہ عقل ہے کیوں کہ یہی وہ شے ہے جس کے ذریعہ انسان دنیوی مشکلات اور مسائل پر قابو پاتا ہے اور یہ کام انسان عقل کے ذریعے علم حاصل کرنے کے بعد کرتا ہے یعنی حقیقت تک رسائی علم کے ذریعہ ہی ہوسکتی ہے۔ اس سے ثابت ہوتا ہے کہ 'یقین بغیر علم کے اور علم بغیر یقین کے سچا اور پورا نہیں ہے۔' چوں کہ ایمان کے لیے یقین لازمی ہے اس لیے اس کا منطقی نتیجہ یہ نکلتا ہے کہ ایمان یقین کے بغیر اور یقین علم کے بغیر ممکن نہیں۔ یقین کی حیثیت مذہب اسلام میں مرکزی ہے اور یقین کا مدار علم پر ہوتا ہے اور عقل ہی علم حاصل کرنے کا ذریعہ ہے۔''[۴۲]

اس سے نتیجہ اخذ کیا جاسکتا ہے کہ:

''عقل اور عقیدے میں کوئی تناقص نہیں ہے بلکہ عقیدے کی تطبیق عقل سے ہی کی جانی چاہیے۔ بلکہ عقل ہی کو تمام چیزوں پر فوقیت حاصل ہے۔''

سرسید اس کی تشریح اس طرح کرتے ہیں کہ:

''ان سب مباحثوں کے بعد میں نے یقین کیا کہ علم یا یقین یا ایمان حاصل کرنے کے لیے آلہ اور نہایت عمدہ رہنما ہے۔ پھر میں نے خیال کیا کہ ''عقل پر غلطی سے محفوظ رہنے کا کیوں کر یقین ہو، میں نے اقرار کیا کہ حقیقت میں اس پر یقین نہیں ہوسکتا، مگر جب عقل ہمیشہ کام میں لائی جاتی ہے تو ایک شخص کی عقل کی غلطی دوسرے شخص کی عقل سے اور ایک زمانے کی عقلوں کی غلطی دوسرے زمانے کی عقلوں سے صحیح ہوجاتی ہے، مگر جب کہ علم یا یقین یا ایمان کا مدار عقل پر نہ رکھا جاوے تو اس کا حاصل ہونا کسی زمانہ اور کسی وقت میں بھی ممکن نہیں۔''

اس کے بعد سرسید نے سوال کیا کہ:

''کیا یہ ممکن نہیں ہے کہ عقل سے بڑا کوئی اور رہنما ہو جو عقل کو بھی شکست دے دے!''

پھر خود ہی جواب دیا کہ:

''ایسے رہنما کے موجود ہونے کے احتمال سے ہمارا کام نہیں چلتا، اس کے موجود ہونے کا ہم کو علم اور یقین چاہیے۔ جب یہ نہیں ہے تو عقل کے سوا اور کوئی رہنما بھی نہیں ہے۔''[۴۳]

اس وقت مسلمان قرآن کی اصل تعلیم پر عمل کرنے کے بجائے صرف جنت، دوزخ، آخرت، معراج اور فرشتوں وغیرہ کے قصوں کو ہی کافی سمجھتے تھے۔ اس طرح قرآن سے دور اور اوہام سے قریب تر ہوتے جا رہے تھے اور صرف آیاتِ قرآنی کو تعویز بنا کر گلے میں ڈالنا یا پانی پر پڑھ پھونک کر ہی شفا حاصل کرنا چاہتے تھے۔ ان کے اس رویے نے ان کو اتنا بے حس بنا دیا تھا کہ اب ان کے اندر اتنی قابلیت و سکت بھی باقی نہ رہی کہ اس زمانے میں اسلام پر لگائے گئے الزامات کا جواب بھی دے سکیں۔ لہٰذا اس تحریک کا سب سے اہم کام یہی تھا کہ مسلمانوں کو مذہب کی اصل تعلیم سے روشناس کرا کر ان کو عقل و دلائل کی طرف راغب کیا جائے۔

اس تحریک نے مذہب کو نئے زاویہ سے روشناس کرایا کیوں کہ اس سے پہلے لوگ مذہب کے نام پر اپنے حال سے نظریں چراتے تھے۔ روایات کے اسیر تھے اور مستقبل کے نام پر آخرت کی زندگی کو ہی سب کچھ سمجھتے تھے۔ ان کی زندگی کا مقصد تزکیۂ روحانی اور تصفیۂ باطنی تھا، لیکن اس تحریک کا نصب العین خالص عقلی اور عملی تھا۔ اس کا نظریہ یہ تھا کہ لوگ اپنی آئندہ زندگی کو ترقی کے ساتھ گزاریں۔ اس تحریک کے نزدیک دین کا کام صرف اتنا تھا کہ اس سے دنیا کو سجایا اور سنوارا جائے اور حکم خداوندی کے تحت یعنی دین کی روشنی میں ہی زندگی گزار دی جائے۔

قرآن میں اللہ خود فرماتا ہے کہ:

''رَبَّنَا آتِنَا فِی الدُّنیَا حَسَنَۃً وَّ فِی الآخِرَاتِ حَسَنَۃً وَّ قِنَا عَذَابُ النَّار وَ قِنَا عَذَابَ الْقَبْر وَ قِنَا عَذَابَ الْحَشْر''

(مطلب یہ کہ اس آیت میں سب سے پہلے دنیا کی بھلائی اور اس کو بہتر بنانے کی بات کہی گئی ہے۔ بعد میں آخرت، دوزخ، قبر اور حشر کا ذکر کیا گیا ہے۔)

اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ اس تحریک کے خیالات دین سے کافی منسلک تھے، لیکن اس زمانے میں سرسید کے ان خیالات کو غلط ٹھہرایا گیا۔ لہٰذا سرسید کے ان مذہبی نظریات کو واضح کرنے کے لیے ہم ایک مثال پیش کرتے ہیں تاکہ اب تک ان کے بارے میں مذہب کو لے کر لوگوں کا جو خیال ہے وہ کچھ دھندلکے سے باہر آجائے۔ مثلاً:

کرکٹ کے میدان میں گیارہ کھلاڑی ہوتے ہیں اور ان کو اپنی اپنی قابلیت کے مطابق میدان میں تقسیم کردیا جاتا ہے۔ کچھ گیند بازی پر منسلک ہوتے ہیں، کچھ میدان کے چاروں طرف پھیلا دیے جاتے ہیں، تاکہ بال کو پکڑ کر بلے باز کو شکست دے سکیں۔ اس طرح سب کی نظریں صرف بال پر ہی ہوتی ہیں۔ جہاں جہاں وہ بال جاتی ہے وہاں وہاں سب کی نظریں اُٹھتی ہیں۔ اب دیکھنا یہ ہے کہ اتنی پابندیوں کے باوجود بلے باز کس طرح چھکے اور چوکے مار کر کامیابی حاصل کرتا ہے۔

مطلب یہ کہ اللہ تعالیٰ نے بھی انسان کے چاروں طرف اسی طرح کی کچھ پابندیاں عائد کردی ہیں اور خود یہ دیکھتا ہے کہ دنیا میں رہ کر کون میرے حکم کو بجالاتا ہے۔ اللہ کو تو خود نئی نئی چیزوں کی تلاش کرنے والے پسند ہیں۔

ان ہی وجوہات کی بنا پر سرسید نے عقل کو سب سے زیادہ اہم قرار دیا ہے۔ ان کا نظریہ یہ ہے کہ جب اللہ نے انسان کو تمام اعضا عطا کیے ہیں تو ان کے کام بھی الگ الگ تقسیم کردیے ہیں، اور جب یہ تمام

اعضا اپنا اپنا کام انجام دے رہے ہیں تو پھر دماغ جس کا کام سوچنا اور مسئلوں کا حل تلاش کرنا ہے تو پھر اس دماغ سے چیزوں کو عقل کی کسوٹی پر پرکھنے کا کام کیوں نہ لیا جائے۔ سرسید نے خود عقل کی کسوٹی پر ہی سر ولیم میور کی کتاب کا جواب لکھا۔ اگر عقل نہ ہوتی تو کیا وہ سوچ سکتے تھے کہ اس بے حرمتی والی کتاب کا کس طرح منھ توڑ جواب دیا جائے۔ جانوروں اور انسانوں میں ایک بڑا فرق صرف قوتِ گویائی اور عقل کا ہے۔ انسان اپنی عقل و شعور اور قوتِ گویائی کی بنا پر ہی جانوروں سے افضل ہے۔

دنیا میں اللہ تعالیٰ نے اپنے نبی اور رسولؐ بھیجے، لیکن جب وہ دنیا میں آئے تو انھوں نے بھی اللہ کو اپنی عقل سے ہی تلاش کیا۔ مثلاً جب ابراہیمؑ نے چاند، سورج اور ستارے دیکھے تو کہا: ''یہ میرا رب ہے لیکن جب وہ چھپ گئے تو فرمایا نہیں یہ چھپنے والے میرے رب نہیں ہو سکتے۔'' یعنی انھوں نے بھی اللہ تعالیٰ کو دنیا میں آ کر عقل کی کسوٹی پر ہی پہچانا۔

اسی طرح جب اللہ تعالیٰ نے آدمؑ کی تخلیق کا ذکر فرشتوں سے کیا تو انھوں نے کہا کہ اے ہمارے رب! کیا تو زمین پر ایسی مخلوق پیدا کرنا چاہ رہا ہے جو فتنہ و فساد پھیلائے گی۔ لیکن اللہ نے ان کی اس بات کا جواب نہ دیا۔ پھر جب آدمؑ کی تخلیق ہوگئی تو اللہ نے انھیں تمام چیزوں کے نام سکھا دیے، پھر فرشتوں سے کہا کہ تم ان چیزوں کے نام بتاؤ لیکن وہ نام بتانے سے قاصر رہے۔ پھر آدمؑ سے کہا کہ تم نام بتاؤ۔ آدمؑ نے فرشتوں کو چیزوں کے نام بتا دیے۔ اللہ نے کہا کہ میں تم سب سے بہتر جانتا ہوں۔

اس واقعہ سے مراد یہ ہے کہ اللہ نے فرشتوں کے سامنے انسان کی برتری ظاہر کی اور ان پر اس بات کو ظاہر کیا کہ انسان اپنی عقل و شعور کی وجہ سے ہی اشرف المخلوقات ہے۔

علی گڑھ تحریک کا اہم مقصد بھی مسلمانوں کو عقل و شعور کی طرف راغب کرانا تھا۔

سرسید مسلمانوں کی فلاح و بہبود چاہتے تھے۔ ان کے انگلستان جانے کا اہم مقصد بھی مسلمانوں کی بھلائی تھی۔ وہاں جا کر انھوں نے وہاں کی ہر شے پر ایک ہمدرد مفکر کی نظر ڈالی اور ساتھ ہی ساتھ

قوم کی حالت کو بہتر بنانے کے منصوبے بھی تیار کیے۔ لندن میں سرسید نے اپنے سترہ مہینے کی مسافرت کے دوران قوم کو جدید تعلیم سے روشناس کرانے کا پکا عزم کیا۔ سرسید تہذیب کی تعریف کرتے ہوئے لکھتے ہیں کہ:

''اس کے معنی نہایت وسیع ہیں اس سے مراد ہے انسان کے تمام افعال ارادی اور اخلاق اور معاملات اور معاشرت تمدن اور طریقۂ تمدن اور صرفِ اوقات اور علوم اور ہر قسم کے فنون و ہنر کو اعلیٰ درجہ کی عمدگی پر پہنچانا اور ان کو نہایت خوبی اور خوش اسلوبی سے برتنا جس سے اصلی خوشی اور جسمانی خوبی ہوتی ہے اور تمکن اور وقار و منزلت حاصل کی جاتی ہے اور وحشیانہ پن اور انسانیت میں تمیز نظر آتی ہے۔''

ایک جگہ لکھتے ہیں کہ:

''سویلزیشن، یعنی شائستگی کے لفظ کو عام اصطلاح میں ایسا لفظ سمجھنا چاہیے جس سے اعلیٰ ترقی یافتہ اور شائستہ قوموں کی حالت ان قوموں کے مقابلے میں جن کو وحشی یا نصف وحشی سمجھا جاتا ہے سمجھ میں آسکے۔''[۴۴]

سرسید اس بات سے بخوبی آشنا تھے کہ قوموں کی ترقی میں مذہب کا اہم رول ہوتا ہے اس لیے مذہب پر زور دیتے ہوئے کہتے ہیں کہ:

''بے شک بعض مذہب ایسے ہیں کہ وہ تہذیب قومی کے بڑے مانع ہیں، اس کے بعد انھوں نے اپنے عہد کے زوال آمادہ مسلم معاشرے کے پیش نظر مذہب اسلام کی نوعیت کی چھان بین کرنے کا مشورہ دیا۔''[۴۵]

سرسید لکھتے ہیں کہ ایک عیسائی مورخ نے ترکی کی سیاحت کے بعد اپنے سفرنامہ میں اسلام کے بارے میں لکھا کہ:

''یہ انسانی تہذیب کی ترقی کے موافق نہیں ہے۔ اس لیے مذہب اسلام کو ترک کیے بغیر ترکی مسلمان مہذب نہیں ہو سکتے ہیں۔''

اس رائے زنی کے پیش نظر سلطان دوم شاہ عبدالعزیز نے چند عالموں، دانش وروں اور وزیروں پر مشتمل ایک تحقیقاتی کمیٹی قائم کی، تاکہ اس کی اصل کی جانچ کی جا سکے۔ اس کمیٹی نے جو رپورٹ پیش کی، اس کے دو فقروں کا ترجمہ سرسید نے پیش کیا:

''سرسید کے نزدیک جو قوم زیادہ سفر کرتی ہے اس میں دوسری قوموں کی تہذیب قبول کرنے اور دوسری قوموں کی تہذیبی اصلاح کرنے کی صلاحیت دیگر قوموں سے زیادہ ہوتی ہے وہ جزائر قائر، فنشیا، کارتھیج اور یونان کے قدیم باشندوں کو عہد وسطیٰ کے ونیشیا اور جینوا کی قوموں کو اور عہد جدید کے انگریز، ڈچ، فرانسیسی اور امریکی کو تہذیب پھیلانے کے نہایت عمدہ ذریعہ قرار دیتے ہیں۔''[۴۶]

سرسید مسلم معاشرہ کی کن کن برائیوں کو دور کر کے ان کی اصلاح کرنا چاہتے تھے ان اصلاحی پہلوؤں کا ذکر وہ اپنے ایک مضمون میں اس طرح کرتے ہیں کہ:

''خاندانی اور سماجی رسوم

کثرتِ ازدواج کا خاتمہ

شادی اور غمی کے رسوم سے ہندو اثرات کا اخراج

عورتوں کی حالت میں اصلاح اور تہذیب

اکل و شرب میں مغربی طور طریقے کا برتاؤ

دوستوں سے رسم و راہ، طرز گفتگو اور لہجہ میں شائستگی کا برتاؤ

طرز لباس میں درستگی، جو تہذیب یافتہ قوم کی پہچان ہے

مسلم قوم کی بہتری

ترک تقلید اور آزادیٔ رائے قائم کرنا

ضبط اوقات کی پابندی

شادی بیاہ اور دوسرے موقعوں پر فضول خرچی کی روک تھام

خودغرضی کی جگہ مسلمانوں میں قومی جذبہ پیدا کرنا

زراعت اور تجارت

مسلم کسانوں کے درمیان جدید تکنیک کے ذریعہ زراعت کو فروغ دینا

مسلمانوں کے درمیان تجارت کو فروغ دینا

جدید مغربی تکنالوجی کا استعمال

امور تعلیم، علم دینی کے ساتھ ساتھ اعلا دنیوی تعلیم کا حصول۔ اس سمت میں ذاتی کوشش کرنا، چندہ وغیرہ کی صورت میں مغربی سائنس اور تکنالوجی کا پرچار کرنا۔

عورتوں کی تعلیم، دست کاری کے لیے عمدہ بندوبست کرنا

مذہبی امور

مذہب سے توہمات کا اخراج کرنا

مذہبی عقائد کی درستگی، قرآن اور حدیث کے مطابق

مذہبی احکام کی تحقیق وتدوین۔''[۴۷]

عقل وشعور سے کام لے کر ترقی کرنے کے بارے میں سرسید لکھتے ہیں کہ:

''آدمی مثل ایک کل کے نہیں ہے جو اس کے واسطے مقرر کر دیا ہے اسی کو انجام دیا کرے بلکہ وہ ایک ایسا درخت ہے جو ان اندرونی قوتوں سے جو خدا نے

اس میں رکھی ہیں اور جن کے سبب سے وہ زندہ مخلوق کہلاتا ہے۔ ہر چہار طرف پھیلے اور بڑھے، پھولے اور پھلے۔''[۴۸]

ایک جگہ لکھتے ہیں کہ:

''.....جب.....ہم دیکھتے ہیں کہ ہماری قوم نے سویلائزڈ قوم کی عمدہ خصلتوں اور عادتوں میں پیروی کی تو ہم کو بہت خوشی ہوتی ہے اور جب یہ سنتے ہیں کہ اس نے ان کی برائیوں کی پیروی کی اور شراب پینی شروع کی اور پکا متوالا ہوگیا اور جوا کھیلنا سیکھا اور بے قید ہوگیا تو ہم کو نہایت افسوس ہوتا ہے۔ ہم امید کرتے ہیں کہ ہماری قوم عمدہ باتوں کو سیکھے گی اور بری باتوں کو ہمیشہ برا سمجھے گی۔''[۴۹]

سرسید نے مہذب قوموں کے رسم ورواج کو اسلام شرعی کے تحت اپنانے کی تلقین کی۔ وہ لکھتے ہیں کہ:

''مگر چوں کہ ہم لوگ مسلمان ہیں اور ایک مذہب رکھتے ہیں جس کو ہم دل سے سچ جانتے ہیں، اس لیے ہم کو مذہبی پابندی ضروری ہے اور وہ اسی قدر ہے کہ جو بات معاشرت اور تمدن اور زندگی بسر کرنے اور دنیوی ترقی کے اختیار کرنے میں۔ اس کی نسبت اتنا دیکھ لیں کہ وہ مباحثات شرعیہ میں سے ہے یا محرمات شرعیہ میں سے۔ درصورت ثانیہ بلاشبہ ہم کو احتراز کرنا چاہیے اور درصورت اوّل بلالحاظ پابندی رسوم کے اور بلالحاظ اس بات کے کہ لوگ ہم کو برا کہتے ہیں یا بھلا، اس کو اختیار کرنا ضرور، بلکہ واسطے ترقی قومی کے فرض ہے۔''[۵۰]

لندن سے واپس آ کر انھوں نے مسلمانوں کو جدید تعلیم حاصل کرنے کی دعوت دی لیکن اس راستے میں مسلمانوں کے مذہبی نظریۂ اوہام انگریزی تعلیم سے نفرت اور ایجوکیشن سے ناواقفیت نے ان کے دل کو بڑی ٹھیس پہنچائی۔ مسلمانوں کے دل میں اپنے قدیم علوم وفنون کی قدر ومنزلت اس قدر رچ بس گئی تھی کہ اب وہ جدید علوم حاصل کرنے کو معیوب، بلکہ مذہب کے خلاف تصور کرتے تھے۔ جب کہ ان کے قدیم علوم میں اس زمانے کے حالات سے نظریں ملانے کی قابلیت وصلاحیت بھی موجود نہ تھی۔

مسلمانوں کی غفلت کا یہ عالم تھا کہ وہ جدید علوم کو کفر سمجھتے تھے۔ اس لیے سرسید کو مجبوراً مذہب میں مداخلت کرنی پڑی۔ کیوں کہ سرسید ہر حال میں مسلمانوں کی عقل پر پڑے پردے کو اٹھانا چاہتے تھے، لیکن قوم نے ان کی مداخلت کو غلط تصور کیا اور انھیں طرح طرح کے الزامات سے نوازا۔ سرسید نے ان الزامات کی پرواہ کیے بغیر مسلمانوں کی بھلائی کے منصوبے بنائے۔ سرسید نے سب سے پہلے مسلمانوں کے ذہن سے مذہب کے غلط تصور کو درست کرنے کا ارادہ کیا۔ انھوں نے مسلمانوں کو مذہب کے متعلق ایسی ایسی باتیں بتائیں جن کو انھوں نے پہلے نہیں سنا تھا۔ اس لیے وہ سرسید کے خلاف ہو گئے کہ یہ ہمیں مذہب سے منحرف کر رہے ہیں لیکن ان کا یہ خیال بالکل غلط تھا۔ سرسید کے مذہبی رجحان کا مطالعہ کرنے سے یہ بات ثابت ہو جاتی ہے کہ دراصل سرسید کا مقصد اپنے نظریۂ عقلیت کی بنا پر لوگوں کو مذہب کی طرف اور بھی زیادہ راغب کرانا تھا کیوں کہ اعتراضات بھی دو قسم کے ہوتے ہیں۔ ایک تو وہ جو باہر والوں کی طرف کیے گئے ہوں اور ایک وہ جو گھر والوں کی جانب سے کیے گئے ہوں۔ لیکن اعتراض کا اثر باہر کے مقابلے میں گھر والوں کے اعتراض سے زیادہ ہوتا ہے۔ سرسید کی پالیسی بھی یہی تھی کہ جب تک کوئی اپنا (مسلمان) مسلمانوں کو ان کی کمیوں کے بارے میں نہیں بتائے گا تب تک انھیں اپنے حالات سدھارنے کا خیال پیدا نہیں ہو سکتا، اس لیے انھوں نے سب سے پہلے مذہب کو ہی دلائل سے سمجھانے کی کوشش کی۔ کیوں کہ مسلمانوں نے مذہب اسلام کے نام پر بہت سی من گھڑت کہانیاں بنا رکھی تھیں۔ سرسید نے مذہب کی بہت سی باتوں کو دلائل

سے سمجھانے کی کوشش کی۔ ان کی توجہ روحانی اور باطنی زندگی سے ہٹ کر خارجی زندگی کی طرف مبذول کرائی۔ انھوں نے دنیا اور آخرت دونوں کو ساتھ ساتھ لے کر چلنے کی تلقین کی۔ دنیا انسان کے لیے ایک کھیت کی حیثیت رکھتی ہے جس میں وہ طرح طرح کے بیج بوتا ہے اور آخرت فصل کاٹنے کی جگہ ہے۔ اس لیے دنیا اور آخرت ترازو کے دو پلڑوں کی طرح ہیں اگر اس میں سے ایک بھی جھکا ہوا ہوگا تو انسان کا عمل مکمل اکائی کی حیثیت نہیں رکھ سکتا، اس لیے دونوں کو برابر برابر ہونا چاہیے۔ اسلام کی تعلیم نہایت پاکیزہ، مکمل اور مفید ہے، اگر مسلمان اس کے مطابق زندگی گزاریں تو کبھی بھی انھیں ذلت و پستی کا سامنا نہیں کرنا پڑے گا۔

قرآن شریف کا نزول خود اس بات کی گواہی دیتا ہے کہ اس کے ذریعہ انسانوں کی دین و دنیا کی بھلائی کی جائے۔ اس کی کسی بھی آیت سے یہ ظاہر نہیں ہوتا کہ دنیا کو چھوڑ کر صرف مذہب کے پیچھے لگیر کے فقیر بن کر تقلید کی جائے۔ یہ تو علما و واعظین نے اپنا مطلب پورا کرنے کے لیے مسلمانوں کو گمراہ کر دیا ہے۔ سرسید نے مسلمانوں کو اس گمراہ کن راستے سے الگ کرنے کے لیے واضح الفاظ میں کہا کہ:

> ''اسلام کوئی مٹی کا پتلا نہیں ہے جس کو کوئی دیکھ سکے۔ مسلمانوں کی حالت اور ان کے چال چلن سے اسلام کی صورت دکھائی دیتی ہے، سو انھوں نے اس کو ایسا بدصورت بنایا ہے کہ جو کوئی نفرت کرے تو تعجب نہیں۔ پس میری خواہش ہے کہ مسلمان اپنے اخلاق، تہذیب، شائستگی کی درستی میں پوری کوشش کر کر اور اپنے حال اور چال چلن کو درست و عمدہ کر کر اسلام کی جو اصلی صورت ہے وہ دنیا کو دکھا دیں۔''[۵۱]

اب زمانہ تحقیق و علم کا ہے۔ وقت کا تقاضا یہ ہے کہ مذہب کو بھی تحقیق و علم کی روشنی میں ہی جانچا اور پرکھا جائے۔ مذہب کی بنیاد علم و فطرت پر قائم ہو اور دینی عقائد کو بھی علم و فطرت کے مطابق ہی ثابت کرنے کی کوشش کی جائے۔

سرسید کے انھیں خیالات کی وجہ سے قوم نے انھیں کافر، مرتد اور نیچری وغیرہ الفاظ سے نوازا، لیکن سرسید نے اپنے ان خیالات میں کبھی تبدیلی نہیں آنے دی۔ اس سلسلے میں سرسید نے کہا کہ:

''کسی نے خدا کو اور کسی طرح نہیں جانا، اگر جانا تو نیچر ہی سے جانا۔ موسیٰ نے رب ارنی کے جواب میں کیا سنا ''لن ترانی ولکن انظر الی الجبل (تو مجھے نہیں دیکھ سکتا ہے) اور (اگر دیکھنا ہی ہے تو) (پہاڑوں پر دیکھو) پہاڑوں پر کیا تھا وہی نیچر قانونِ قدرت کا نمونہ تھا۔ خود خدا بھی اپنے آپ کو کچھ نہیں بتلا سکا اور جو بتلایا تو نیچر ہی کو بتلایا۔ فرعون نے موسیٰ سے کہا کہ خدا کون ہے؟ موسیٰ نے نیچر ہی سے سمجھایا اور کہا کہ آسمانوں کا اور زمین کا اور جو کچھ کہ ان میں ہے ان کا خدا۔ موسیٰ پر کیا موقوف ہے جتنے پیغمبر گزرے ہیں سب نیچری تھے۔ خدا خود نیچری ہے جب لوگوں نے نیچر کے قوانین کو چھوڑا تب ہی اس نے پیغمبر بھیجا جو پیغمبر آیا اس نے کیا کیا؟ پھر لوگوں کو نیچر کا رستہ بتایا اور جتنا بگاڑا تھا اتنے کو پھر سنوارا۔ جب موسیٰ سے نیچر سٹ کو لوگوں نے مجنوں کہا تو پھر ہم کس گنتی میں ہیں ہم کو جو چاہیں کہیں۔''[۵۲]

غرض یہ کہ سرسید نے ہر ممکن کوشش یہی کی کہ مذہب کو دلائل و تحقیق سے سمجھنے اور سمجھانے کی کوشش کی جائے۔ مسلمانوں کی آنکھوں سے اس غفلت کی پٹی کو کھولنے کے لیے انھوں نے دلائل کی بنیاد پر مذہبی کتابیں اور رسالے تصنیف کیے۔ مثلاً خطباتِ احمدیہ، تبیین الکلام اور تفسیر القرآن وغیرہ۔

اس کے علاوہ مولانا الطاف حسین حالی سے مدوجزر اسلام لکھوا کر اپنے خیالات کو اور بھی واضح کر دیا۔ مسدسِ حالی کا ایک بند ملاحظہ ہو:

سدا علم و تحقیق سے دل میں بل ہے　　حدیثوں پہ چلنے میں دیں کا خلل ہے
فتاوؤں پہ بالکل مدارِ عمل ہے　　ہر اک رائے قرآں کا نعم البدل ہے

کتاب اور سنت کا ہے نام باقی
خدا اور نبی سے ہیں کام باقی

مختصر یہ کہ سرسید کے نظریۂ عقلیت کی وجہ سے نہ صرف مسلمانوں کی مذہبی زندگی میں سدھار آیا بلکہ اردو ادب میں کافی ترقی ہوئی اور ادب میں نئے نئے رجحانات پیدا ہوئے۔

(۲) مادّیت:

سرسید تحریک کا دوسرا اہم پہلو مادیت ہے۔اس سے مراد جسمانیت یعنی اصل شے ہوتی ہے۔ یہ پہلو اس بات کی طرف توجہ مبذول کراتا ہے کہ کسی بھی چیز کو اپنانے سے پہلے اس کی اصل شکل وصورت کو ضرور دیکھ لیا جائے، تاکہ بعد میں اس کو اپنانے کے بعد صرف تقلید کے طور پر اس کی پیروی نہ کی جائے اور وہ شے انسان کے لیے ایک بوجھ یا رسم ورواج کے طور پر ثابت نہ ہو۔

انگریزوں کا دورِ حکومت جو کہ سائنس اور ٹکنالوجی کا دور تھا اور ان کے آنے سے ہندوستان میں بھی کافی سہولیتیں مہیا ہو چکی تھیں لیکن مسلمان خاص طور سے ان ترقیات سے مستفید ہونے کے بجائے اپنے فرسودہ طریقۂ تعلیم اور رسم ورواج سے اس قدر مانوس تھے کہ وہ اپنے اس سرمائے پر بھی نظر نہیں ڈال رہے تھے جو کہ انھوں نے اندھا دھند تقلید کے زیرِ اثر جمع کر رکھا تھا۔

سرسید نے جب مسلمانوں کی اس حالت پر غور کیا تو انھیں یقین ہو گیا کہ یہ اپنے جمع کیے ہوئے سرمائے کی اصل تعلیم تک سے واقف نہیں ہیں بلکہ یہ لوگ ہر چیز کو چاہے وہ مذہب ہو یا تعلیم، تجارت اور معاشرت سب میں تقلیدی روش اختیار کیے ہوئے ہیں۔ یہ کسی بھی میدان میں اصل کے قائل نہیں تھے۔ مذہب کی سنی سنائی باتوں پر یقین کیے ہوئے تھے، تجارت میں وہی گھسے پٹے طریقے اپنائے

ہوئے تھے، رہن سہن کو بھی تبدیل نہیں کر رہے تھے۔ سماج کی پابندیاں وہی تھیں جو ان کے آباواجداد سے چلی آرہی تھیں۔ بس انھیں کی وہ پیروی کر رہے تھے۔

ادب کے نام پر وہی صدیوں پرانا فرسودہ طریقۂ تعلیم رائج تھا۔ کتابیں اتنی فرسودہ تھیں کہ خود ان عالموں اور مولویوں کی سمجھ میں نہیں آتی تھیں۔ سرسید نے اپنے ایک مضمون میں لکھا کہ:

''ہم اپنے ہاں کے عالموں کا حال بالکل یہی دیکھتے ہیں کہ ان کے روحانی قویٰ بالکل نیست و نابود ہو جاتے ہیں اور صرف زبانی بک بک یا تکبر و غرور اور اپنے آپ کو بے مثل و نظیر قابلِ ادب سمجھنے کے اور کچھ باقی نہیں رہتا، زندہ ہوتے ہیں، مگر دلی اور روحانی قویٰ کی شگفتگی کے اعتبار سے بالکل مردار ہوتے ہیں۔ کتابیں پڑھتے ہیں اور جس قدر عمدہ کتابیں افراط سے بہم پہنچیں ان کو اور زیادہ پڑھتے ہیں اور ان سے تربیت حاصل کرتے ہیں اور ایسے بیل کے مانند ہو جاتے ہیں جو برابر چرتا ہے اور پھر بھی چراگاہ ہی میں رہنے کی خواہش کرتا ہے۔ پس کتابیں پڑھ لینے سے انسانیت نہیں آجاتی بلکہ وہ کتابی علم خود ان پر بوجھ ہوتا ہے۔''[۵۳]

اس سے مراد یہ ہے کہ مسلمان اصل تعلیم سے پیچھے ہیں صرف انھوں نے تصوراتی زندگی کو ہی اصل زندگی سمجھ لیا ہے۔ سرسید کی زیادہ سے زیادہ توجہ مسلمانوں کو ان کی تصوراتی زندگی سے حقیقی زندگی کی طرف لانے کی طرف رہی ایک ایسی حقیقی زندگی جہاں پر تصور کا کوئی کام نہ تھا بلکہ ہر چیز اصل، حقیقت اور دلائل سے ہی ثابت کی جاتی تھی۔ جہاں پر گل و بلبل، عاشق و معشوق، ہجر و وصال وغیرہ کو خود اپنی آنکھ سے دیکھا جا سکے۔

اس پہلو نے مسلمانوں کو اپنے گرد و پیش کے حالات سے واقف کرایا، کیوں کہ مغل حکومت کے زوال کا ایک بڑا سبب یہی تصوراتی زندگی تھی۔ یہ لوگ اپنے حال سے بے خبر اور ماضی کی دل کش

رعنائیوں میں ہر وقت گم رہتے اور صرف اپنے آباواجداد کے کارناموں پر فخر کرتے تھے، لیکن ان کی اس بے خبری سے ملک ان کے ہاتھ سے چھن کر سات سمندر پار فاتح قوم کے حوالے کر دیا گیا۔

مادیت کے پہلو کی بنا پر ہی ادب کو پہلی بار ادب تصور کیا گیا کیوں کہ سرسید اور ان کے رفقا نے ایک ایسے ادب کی بنیاد ڈالی جو کہ اس تصوراتی ادب سے بالکل مختلف تھا۔ مثلاً محمد حسین آزاد نے نیچرل شاعری کی بنیاد ڈالی۔ حالؔی نے مقدمہ شعر و شاعری لکھ کر جدید تنقید کی بنیاد ڈالی اور مسدس حالی لکھ کر مسلمانوں کی پوشیدہ خودی کو اجاگر کیا۔ سرسید نے خطباتِ احمدیہ لکھ کر سوانح نگاری کی ابتدا کی۔ نذیر احمد کے ذریعہ ناول نگاری کی ابتدا ہوئی جس میں ان ہی واقعات کو بنیادی اہمیت دی گئی جن سے سماج کے اسرار و رموز آشکار ہو سکیں۔

غرض یہ کہ اس پہلو کے تحت ہر چیز میں اصیت اور حقیقت کو ہی بنیادی اہمیت دی گئی اور مسلمانوں کی اس کمزوری کو دور کرنے کی کوشش کی گئی جس کے تحت مسلمان صرف خانقاہوں، مسجدوں، بزرگانِ دین کے تکیوں میں بیٹھ کر باطنی زندگی کو ہی اصل زندگی خیال کرتے تھے، لیکن اس پہلو نے ان کو اس باطنی زندگی سے نجات دلا کر انھیں عملی زندگی کی طرف راغب کیا اور بتایا کہ عمل سے ہی کائنات کو تسخیر کیا جا سکتا ہے نہ کہ تصور سے۔ اگر عملی زندگی کی اہمیت نہ ہوتی تو کیا آں حضرتؐ تجارت کا پیشہ اختیار کرتے، مزدوری کر کے پیٹ بھرنے کے لیے کنویں سے پانی کھینچنا پڑتا اور اگر اللہ تعالیٰ کو ایسی بے عمل زندگی پسند ہوتی تو کیا وہ اپنے محبوب سے اتنی محنت و مشقت کا کام انجام دلاتا۔ غرض یہ کہ آپؐ کی زندگی اس بات کی گواہ ہے کہ مسلمانوں کو عملی زندگی بسر کرنی چاہیے اور یہی وجہ ہے کہ اللہ نے آپؐ کو خود انسان بنا کر بھیجا تا کہ اور انسانوں کے لیے آپ کی زندگی ایک نمونہ ثابت ہو۔

(۳) اجتماعیت:

سرسید کے لندن جانے کا اہم مقصد مغربی نظامِ تعلیم کو بلکہ وہاں کی ہر شے پر مثلاً عجائب خانوں، کتب خانوں، دست کاریوں، کارخانوں اور وہاں کی تہذیب و تمدن پر ایک مفکرانہ نظر ڈالنا تھا۔

وہاں کی ترقیات دیکھ کر انھیں اپنے ملک کی پس ماندگی پر نہایت افسوس ہوتا تھا اور بار بار یہی سوال ان کے دل و دماغ کو پریشان کرتا تھا کہ ایسی ترقی ہمارے ملک میں کیوں نہیں ہے اور جب انھوں نے اسٹیل اور ایڈیسن کے شائع کیے ہوئے رسالے اسپکٹیٹر اور ٹیٹلر دیکھے جو کہ مغربی قوم کو مہذب بنانے کی غرض سے جاری کیے گئے تھے تو انھیں بھی قوم کی حالت کو بہتر بنانے کا ایک اہم ذریعہ ہاتھ آ گیا۔ سرسید نے لندن میں ہی ایک پمفلٹ شائع کیا اور ہندوستان کے موجودہ طریقۂ تعلیم، رہن سہن، رسم و روایات اور تہذیب و تمدن کی خرابیوں کو اجاگر کیا۔ غرض یہ کہ سرسید لندن سے نہایت قیمتی سرمایہ لے کر ہندوستان واپس آئے جس سے ملک و قوم کو کافی فائدہ پہنچا۔ اس سلسلے میں ایک پیراگراف ملاحظہ ہو۔ نواب محسن الملک اپنی ایک تحریر میں آنریبل حاجی اسمٰعیل خاں کو لکھتے ہیں کہ:

> ''سید احمد خاں ولایت گئے، مگر اس مطلب سے کہ اپنی آنکھ سے اس قوم کو جو اس وقت تمام اقوام روئے زمین پر شرف رکھتی ہے۔ انھیں کے گھروں میں اور انھیں کے ملکوں میں دیکھیں اور جو کچھ وہاں دیکھا ہے، واپس آ کر اپنی قوم میں پھیلائیں۔ لوگ ولایت میں جا کر تماشا گاہ، تھیٹر، پارک، میوزیم اور عمارت کی سیر کرتے ہیں اور یہ حاجی دین اسلام کتب خانے میں بیٹھا ہوا ''خطباتِ احمدیہ'' کی تصنیف میں منہمک تھا اور کالجوں اور یونیورسٹی کے انتظام پر غور کر رہا تھا۔ اس شخص کا ولایت جانا قوم کے واسطے تھا اور واپس آنا قوم کے واسطے۔''[۵۴]

واپس آنے کے بعد سرسید کی ساری توجہ مسلمانوں کی تعلیم و تربیت کی طرف مائل ہوگئی۔ حالاں کہ لندن جانے سے پہلے بھی وہ اپنی قوم کے بارے میں سوچتے اور ان کی فلاح و بہبود کے منصوبے بناتے تھے۔ ان کی قوم سے محبت اسی واقعہ سے اور بھی زیادہ واضح ہو جاتی ہے کہ جب ۱۰ر مئی ۱۸۵۷ء میں

غدر ہوا تو اس وقت سرسید بجنور میں صدر امینی کے عہدے پر فائز تھے۔ ہنگامہ کے دوران سرسید نے انگریزوں کا ساتھ دیا۔ ان کی اس خدمت کے صلے میں حکومت نے انھیں انعام کے طور پر ایک بڑی جائداد دینی چاہی، لیکن انھوں نے یہ کہہ کر اس کو لینے سے انکار کر دیا کہ ''میرا ارادہ ہندوستان میں رہنے کا نہیں ہے'' جب کہ حقیقت یہ تھی کہ وہ اپنے ہی مسلمان بھائی کی جائداد پر حاکم بننا نہیں چاہتے تھے۔ اس کی وضاحت اس تحریر سے ہوتی ہے جو نواب محسن الملک کی طرف سے مولانا نذیر احمد نے حیدرآباد میں لکھی تھی۔ اس سے صاف ظاہر ہوتا ہے کہ:

> ''سرسید احمد خاں کو حسنِ خدمات غدر کے صلے میں بجنور کے ایک بڑے مسلمان رئیس کا بڑا بھاری علاقہ سرکار نے دینا تجویز کیا تھا مگر سید احمد خاں نے صرف اسی وجہ سے اس کے لینے سے انکار کر دیا کہ ایک مسلمان بھائی کے خون سے اپنی پیاس بجھانی ان کو کسی طرح گوارہ نہیں ہو سکتی تھی۔''[۵۵]

چنانچہ اب ان کی پوری کوشش یہی تھی کہ مسلمانوں کو جدید تعلیم و تربیت سے روشناس کرایا جائے۔ لندن جانے سے پہلے بھی سرسید تعلیم کو مسلمانوں کے حق میں بہتر مانتے تھے، لیکن اس وقت وہ اپنی مادری زبان (اردو) میں ہی تعلیم پھیلانے کے حق میں تھے۔ انھوں نے خود کہا کہ:

> ''انگریز قوم نے جو اس قدر ترقی کی ہے، وہ صرف اس بات کا نتیجہ ہے کہ تمام علوم و فنون اسی زبان میں ہیں جو وہ لوگ بولتے ہیں۔ اگر انگریزی زبان میں تمام علوم و فنون نہ ہوتے بلکہ لیٹن یا گریک میں یا فارسی عربی میں ہوتے تو تمام انگریز اب تک ایسے ہی جاہل اور بے علم اور ناخواندہ ہوتے جیسے کہ بدنصیبی سے ہم لوگ ہندوستان میں جاہل ہیں اور آئندہ کو بھی، جب تک کہ تمام علوم و فنون ہماری زبان میں نہ ہوں گے، ہم جاہل اور نالائق رہیں گے اور کبھی عام تربیت نہ ہوگی۔ پس جو لوگ حقیقت میں ہندوستان کی بھلائی اور

ترقی چاہنے والے ہیں وہ یقین جان لیں کہ ہندوستان کی بھلائی اسی پر منحصر ہے کہ تمام علوم اعلیٰ سے لے کر ادنیٰ تک انھیں کی زبان میں ان کو دیے جائیں۔ میری یہ رائے ہندوستان کے ہمالیہ پہاڑ کی چوٹی پر نہایت بڑے بڑے حرفوں میں آئندہ زمانے کی یادگاری کے لیے کھودی جائے کہ اگر تمام علوم ہندوستان کو اسی کی زبان میں نہ دیے جائیں گے تو کبھی ہندوستان کو شائستگی وتربیت کا درجہ نصیب نہیں ہوگا۔''[۵۶]

لیکن جلد ہی وہ اپنی اس رائے سے انحراف کرتے ہوئے جدید تعلیم وتربیت کی حمایت کرتے ہیں اور کہتے ہیں کہ:

''یہ خیال پرانا ہے کہ اگر ہماری تعلیم ہماری زبان میں ہوتو ہمارے لیے اور ملک کی ترقی کے لیے زیادہ تر مفید ہے۔ لارڈ میکالے سے پہلے ایسٹ انڈیا کمپنی نے اس پر بہت کچھ عمل کیا تھا، جن ملکوں نے اس زمانے میں اعلیٰ درجے کی ترقی کی ہے اس کا بڑا سبب یہی ہے کہ انھوں نے تمام علوم وفنون کو اپنی زبان میں کرلیا ہے۔ مگر جن ملکوں نے ایسا کیا، ان میں اور ہندوستان میں بہت بڑا فرق ہے۔ ان ملکوں میں ایک ہی قوم اور ایک ہی زبان حکومت کرتی ہے، مگر ہندوستان میں ہندوستانی حکومت کرتے ہیں نہ یہاں کی زبان حکمراں ہے۔ ہندوستان میں اس خیال کا پیدا کرنا کہ ہم مشرقی علوم اور دیسی زبان اور دیسی علوم کو ترقی دے کر، عزت و دولت، حشمت وحکومت حاصل کرلیں گے۔ بعینہٖ ایسا ہے جیسے کوئی امریکہ کے اعلیٰ باشندوں کو خیال دلائے کہ تم اپنی دیسی زبان اور دیسی علوم میں ترقی کرکے اپنی حکمراں قوم میں عزت ودولت، حشمت وحکومت حاصل کرلوگے۔''[۵۷]

سرسید تعلیم کے ساتھ ساتھ تربیت کے بھی حامی تھے، کیوں کہ تربیت کے بغیر تعلیم کوئی معنی نہیں رکھتی ہے۔ تربیت سے چیزوں کو سجایا اور سنوارا جاسکتا ہے۔ اس لیے انسان کی پوشیدہ صلاحیتوں کو تربیت سے ہی اجاگر کیا جاسکتا ہے۔ لہٰذا سرسید تعلیم کے ساتھ ساتھ تربیت کو بھی لازمی قرار دیتے رہے۔ کیوں کہ رجحانات کی صحیح سمت مقرر کرنے والی چیز تربیت ہے۔

غرض یہ کہ علی گڑھ تحریک کی اس فکری اساس کے ذریعہ سرسید نے مسلمانوں کی بے عمل زندگی کو جہد وعمل کی طرف، گوشہ نشینوں کو کھلی فضا و ماحول کی طرف، ماضی کے پرستاروں کو حال کی طرف، تنگ نظری اور تعصب کا نظریہ رکھنے والوں کو وسعتِ نظر کی طرف، مشرق کے پجاریوں کو مغرب کی طرف، تقلید پرستوں کو اجتہاد کی طرف اور تصوراتی ذہن والوں کو غور وفکر اور تجزیہ واستدلال کی طرف مائل کیا۔

مطلب یہ کہ انھوں نے اور ان کی تحریک نے مسلمانوں کو زندہ قوموں کی طرح زندگی گزارنے اور سربلند ہوکر جینے کا سلیقہ سکھایا۔ اجتماعیت سے سرسید کی مراد یہی تھی کہ انفرادی اور شخصی ترقی سے صرف ایک فرد یا چند افراد کو فائدہ پہنچ سکتا ہے لیکن قومی ترقی کے لیے ضروری ہے کہ اجتماعی شعور عام ہو، سب کی ترقی ہو اور اس سلسلے میں سب مل کر کوشش کریں۔

(۴) سیاست:

سرسید تحریک کا چوتھا اہم پہلو سیاست ہے۔ جس وقت ۱۸۵۷ء کا ہنگامہ وجود میں آیا، اس وقت سرسید بجنور میں تھے۔ اس ہنگامے میں انھوں نے ہندوستانیوں کا ساتھ دینے کے بجائے انگریزوں کا ساتھ دیا جس کی وجہ سے ہندوستانی ان کی جان کے دشمن ہوگئے، لیکن پھر بھی سرسید نے انگریز، مرد، عورت اور بچوں کی جان بچائی۔ جب ہنگامہ ختم ہوگیا تو انگریزوں کا قہر وعتاب سب سے زیادہ مسلمانوں کے حصے میں آیا۔ اس کی دو وجوہات تھیں ایک تو یہ کہ مسلمانوں میں تعلیم کی کمی تھی جس کی وجہ سے وہ اپنی بات

حکومت تک پہنچانے میں قاصر تھے۔ دوسری وجہ یہ تھی کہ انگریزوں نے ملک مسلمانوں کو شکست دے کر حاصل کیا تھا، اس لیے انگریز انھیں بغاوت کا اصل سرچشمہ تسلیم کرتے تھے۔

اس وقت پوری دنیا کے مسلمانوں کی حالت قریب قریب بہتر تھی۔ سوائے ہندوستانی مسلمانوں کے جو کہ حکومت کی طرف سے باغی کے خطاب سے نوازے جا چکے تھے۔ اس بغاوت کی وجہ سے انگریزوں کا مسلمانوں کے ساتھ سلوک یہ تھا کہ اگر انھیں یہ معلوم ہو جاتا کہ یہ شخص مسلمان ہے تو وہ اس کو فوراً سزا دینے پر آمادہ ہو جاتے تھے۔ حالاں کہ انھیں یہ بھی معلوم ہوتا تھا کہ بغاوت میں اس کا ہاتھ نہیں ہے لیکن سزا دینے کے لیے یہی جاننا کافی تھا کہ یہ شخص مسلمان ہے۔

اس وقت مسلمانوں کی سیاسی، سماجی اور معاشی حالت درست نہ تھی، لیکن باوجود اس کے مسلمان بھی انگریزوں سے حد درجہ نفرت کرتے تھے۔ وہ ان کے صحیح قدم کو بھی شک کی نگاہ سے دیکھتے تھے، ان کے اسکولوں میں اپنے بچوں کو نہیں بھیجتے تھے، انگریزی ملازمت کرنا پسند نہ تھا، بھوکوں مرنا پسند تھا۔ مولوی حضرات کا یہ عالم تھا کہ وہ ان سے ہاتھ ملانا تک گوارا نہ کرتے تھے۔ ادھر انگلستان سے آئے ہوئے خطوط نے مسلمانوں کی بے چینی میں اور بھی اضافہ کر دیا تھا اور اب ان کا شک یقین میں بدل گیا کہ اب تو ہمارا مذہب رسم و رواج، رہن سہن اور طور طریقے سب تبدیل ہو جائیں گے۔ ۱۸۵۹ء کے اس خط نے اور بھی بے چین کر دیا۔ اس میں لکھا تھا کہ:

> ''تمام ہندوستان میں ایک عمل داری ہوگئی ہے۔ تار برقی کی وجہ سے ایک جگہ کی خبریں دوسری جگہ بڑی آسانی سے آجا سکتی ہیں۔ ریل کے اجزا کی وجہ سے آمد و رفت میں بھی آسانی ہوگئی ہے اس لیے مناسب ہے کہ لوگوں کا مذہب بھی ایک یعنی کہ عیسائی مذہب ہو جائے۔''[۵۸]

اس طرح کے خطوط سے مسلمانوں میں نفرت و غصہ اور بھی زیادہ بڑھ گیا۔ سرسید نے انگریزوں اور مسلمانوں کا بہ غور مطالعہ کیا اور اس نتیجہ پر پہنچے کہ یہ کوشش کرنی بیکار ہے کہ انگریز ہندوستان کو

چھوڑیں گے۔ اگر کوشش ہی کرنی ہے تو اس بات کی کی جائے کہ مسلمانوں کی حالت بہتر بنائی جائے۔ اس لیے انھوں نے یہ منصوبہ بنایا کہ مسلمانوں کی حالت کو بہتر تب ہی بنایا جاسکتا ہے کہ جب ان کو سیاست سے بالکل الگ رکھا جائے کیوں کہ یہ لوگ عقل سے زیادہ جذبات سے کام لیتے ہیں۔ سرسید نے مسلمانوں کو سیاست سے دور رہنے کے مشورے دیے اور زیادہ سے زیادہ یہی کوشش کی کہ انھیں جدید تعلیم یعنی سائنس وٹکنالوجی کی طرف راغب کیا جائے اور ایسی تعلیم سے دور رکھا جائے جو کہ ہمارے ہندو بھائی صرف نوکری حاصل کرنے کی غرض سے حاصل کرتے ہیں۔ سرسید نوکری حاصل کرنے کی غرض سے تعلیم حاصل کرنے کے خلاف تھے۔ وہ ایسی تعلیم کے حامی تھے جو انسان کو انسان بننے میں مدد کرے۔ ان کے اس منصوبے سے جواہر لال نہرو نے بھی اتفاق کیا۔ انھوں نے لکھا کہ:

> ''سرسید کا یہ فیصلہ کہ تمام کوششیں مسلمانوں کو تعلیم جدید سے آراستہ کرنے پر صَرف کردینی چاہئیں، یقیناً درست اور صحیح تھا۔ میرا خیال ہے کہ بغیر اس تعلیم کے مسلمان طرزِ جدید کی قومیت کی تعمیر میں کوئی قابلِ قدر حصہ نہ لے سکتے تھے، بلکہ اندیشہ تھا کہ وہ ہمیشہ ہمیشہ کے لیے ہندوؤں کے غلام بن جائیں گے جو تعلیم میں ان سے آگے تھے اور معاشی اعتبار سے بھی زیادہ مضبوط۔''[۵۹]

سرسید نے اس سلسلے میں خود کہا کہ:

> ''جن لوگوں کا یہ خیال ہے کہ پالٹیکل امور پر بحث کرنے سے ہماری ترقی ہوگی، میں ان سے اتفاق نہیں کرتا۔ ہماری قوم کو بجز ترقیِ تعلیم کے اور کسی چیز پر کوشش کرنے کی ضرورت نہیں، اگر ہماری قوم میں کافی تعلیم ہوجاوے گی تو ہم کو وہی کافی ذریعہ تنزل کی حالت سے نکلنے کا ہوگا۔''[۶۰]

غرض یہ کہ سرسید نے اپنے اہم پہلو کے ذریعہ مسلمانوں میں تنگ نظری، تعصب اور انگریزوں سے نفرت کی بجائے ان سے میل جول کرنے کی طرف توجہ مبذول کرائی۔ تاکہ مسلمان بھی ہندوؤں کی طرح حکومت کی نظر میں سرخ روئی حاصل کرسکیں۔

اپنے ایک خط میں جو کہ انھوں نے انگلستان سے بھیجا تھا لکھا کہ:

''اے ہندوستان کی بھلائی چاہنے والو! تم کسی سے توقع مت رکھو اور خود اپنے بھروسے اور آپس کے چندے سے اپنے ملک میں تمام علوم اعلیٰ درجے سے ادنیٰ درجے تک اپنی زبان میں پھیلاؤ، پھر جب تم علوم سے واقف ہو جاؤ گے تب تمہاری نگاہ میں گورنمنٹ کی نوکریوں کے لالچ کی کچھ بھی حقیقت نہیں معلوم ہوگی۔ امید ہے کسی نہ کسی دن ایسا ہوگا، ہوگا، ہوگا۔''[۶۱]

خلاصہ یہ ہے کہ سرسید نے مسلمانوں کو جو کہ اپنے ہم وطن بھائیوں سے تعداد میں، تعلیم و تربیت میں اور دولت و عزت میں ہر لحاظ سے کم تھے، انھیں زیادہ سے زیادہ سیاست سے دور رہنے کی نصیحت و تلقین کی۔

○○○

حواشی:

۱۔ سرسید بنام محسن الملک، مورخہ ۱۱ر فروری ۱۸۷۰ء مکتوبات سرسید، ص ص: ۸۹۔۹۰۔ بحوالہ مظہر حسین، علی گڑھ تحریک سماجی اور سیاسی مطالعہ، ۲۰۰۲ء اشاعت دوم، ص: ۷۵۔۷۶

۲۔ دین اور دنیا کا رشتہ' ۸۲۔۸۶' مقالات سرسید، اخلاقی اور اصلاحی مضامین، لاہور ۱۹۶۲ء، ص: ۸۵۔ بحوالہ مظہر حسین، علی گڑھ تحریک سماجی اور سیاسی مطالعہ، ۲۰۰۲ء اشاعت دوم، ص: ۷۶

۳۔ مذہب و معاشرت' ۱۔۹' مقالات سرسید، ص: ۶۔ بحوالہ مظہر حسین، علی گڑھ تحریک سماجی اور سیاسی مطالعہ، ۲۰۰۲ء اشاعت دوم، ص: ۷۸

۴۔ ایضاً۔

۵۔ رسوم وعادات '۱۳۔۱۹'۔بحوالہ مظہر حسین،علی گڑھ تحریک سماجی اور سیاسی مطالعہ،۲۰۰۲ءاشاعت دوم،ص:۷۸

۶۔ رسم و رواج کے پابندی کے نقصانات،'۲۰۔۳۱'۔بحوالہ مظہر حسین،علی گڑھ تحریک سماجی اور سیاسی مطالعہ،۲۰۰۲ء اشاعت دوم،ص:۷۹

۷۔ سرسید کے فکری زاویے۔ڈاکٹر نفیس بانو،ص:۲۰

۸۔ تعصب۔'۱۲۔۱۵' تہذیب الاخلاق۲، مضامین سرسید احمد خاں (لاہور ملک جنن ککے زئی ب۔ت) ص ص:۱۳۔۱۵۔بحوالہ مظہر حسین،علی گڑھ تحریک سماجی اور سیاسی مطالعہ،۲۰۰۲ءاشاعت دوم،ص:۸۰

۹۔ تہذیب الاخلاق، پرچہ اوّلین۔از مضمون 'تکمیل'۔ص:۱۴

۱۰۔ الطاف حسین حالی۔حیات جاوید،۲ (نئی دہلی،ترقی اردو بیورو۱۹۸۲ء) ص ص:۷۵۔۷۶۔بحوالہ مظہر حسین، علی گڑھ تحریک سماجی اور سیاسی مطالعہ،۲۰۰۲ءاشاعت دوم،ص:۳۵

۱۱۔ تاریخ سرکشی ضلع بجنور۔ص:۴۵۰ تا ۴۵۲۔بحوالہ مظہر حسین،علی گڑھ تحریک سماجی اور سیاسی مطالعہ،۲۰۰۲ءاشاعت دوم،ص:۴۲

۱۲۔ سرسید احمد خاں بنام جان میولن آرنلڈ،ب۔ت،مکتوبات سرسید،ص ص:۱۹۔۲۱۔بحوالہ مظہر حسین،علی گڑھ تحریک سماجی اور سیاسی مطالعہ،۲۰۰۲ءاشاعت دوم،ص:۶۱

۱۳۔ عیسائیوں اور مسلمانوں میں باہمی مودت اور اتحاد، ۲۹۔۳۵، آخری مضامین لاہور، رفاہ عام پریس،۱۸۹۳ء، ص:۳۱۔بحوالہ مظہر حسین،علی گڑھ تحریک سماجی اور سیاسی مطالعہ،۲۰۰۲ءاشاعت دوم،ص:۶۱

۱۴۔ حالات وواقعات خیر خواہانِ مسلمانان،نمبر اوّل،۳۹۔۸۶،مقالات سرسید،ص ص:۴۰۔۴۱۔بحوالہ مظہر حسین، علی گڑھ تحریک سماجی اور سیاسی مطالعہ،۲۰۰۲ءاشاعت دوم،ص:۵۹

۱۵۔ جہاد کا فرانی فلسفہ، ۲۷۰۔۲۷۷، مقالات سرسید ۱۳، ذاتی عقائد کے متعلق مضامین، لاہور مجلس ترقی ادب، ص:۲۷۴۔بحوالہ مظہر حسین،علی گڑھ تحریک سماجی اور سیاسی مطالعہ،۲۰۰۲ءاشاعت دوم،ص:۶۳

۱۶۔ حیات جاوید۔حالی،۱۹۹۷ء،ص:۹۶

۱۷۔ ایضاً۔ص:۹۵

۱۸۔ ایضاً۔ص:۹۶

۱۹۔ ایضاً۔ص:۹۷

۲۰۔ ایضاً۔ص:۱۰۳

۲۱۔ ایضاً۔

۲۲۔ ایضاً۔ص:۱۰۶

۲۳۔ روئداد نمبر ۶، سین ٹیفک سوسائٹی، منعقدہ ۱۶/اگست ۱۸۶۴ء بمقام علی گڑھ گورنمنٹ پریس الہ آباد، بحوالہ: افتخار عالم خاں، سرسید اور سین ٹیفک سوسائٹی، مکتبہ جامعہ لمٹیڈ، جامعہ نگر نئی دہلی، ص: ۱۷۔۱۸

۲۴۔ روئداد نمبر ۴، سین ٹیفک سوسائٹی، منعقدہ ۱۱/اپریل ۱۸۶۴ء بمقام غازی پوری، مطبع میڈیکل ہال بنارس، ۱۸۶۴ء۔ بحوالہ: سرسید اور سین ٹیفک سوسائٹی، افتخار عالم، مکتبہ جامعہ لمٹیڈ، جامعہ نگر دہلی

۲۵۔ روئداد نمبر ۷، سین ٹیفک سوسائٹی، منعقدہ ۱۱/اپریل ۱۸۶۴ء بمقام غازی پوری، مطبع میڈیکل ہال بنارس، ۱۸۶۴ء۔ بحوالہ: سرسید اور سین ٹیفک سوسائٹی، افتخار عالم، مکتبہ جامعہ لمٹیڈ، جامعہ نگر دہلی، ص: ۲۰۔۲۱

۲۶۔ حیات جاوید۔حالی، ۱۹۹۷ء، ص: ۲۴

۲۷۔ ایضاً۔قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان، نئی دہلی، ۱۹۷۹ء

۲۸۔ ایضاً۔ص: ۱۶۱

۲۹۔ ایضاً۔ص: ۱۶۲

۳۰۔ مقالات سرسید، جلد اوّل۔ص: ۲۹۱۔بحوالہ: نورالحسن نقوی، ص: ۵۶

۳۱۔ حیات جاوید۔حالی، ص: ۴۹۵

۳۲۔ مقالات حالی، جلد اوّل۔دہلی ۱۹۳۴، ص: ۲۲۱

۳۳۔ حیات جاوید۔حالی، ص: ۳۱۰

۳۴۔ سرسید اور ہندوستانی مسلمان۔نورالحسن نقوی، ص: ۳۰

۳۵۔ حیات جاوید۔حالی، ص: ۳۳

۳۶۔ سرسید کا خواب اور اس کی تعبیر۔ڈاکٹر سید عابد حسین، ص: ۴

۳۷۔ حیات جاوید۔الطاف حسین حالی، ص: ۱۸۹، پہلا ایڈیشن ۱۹۷۹ء

۳۸۔ حیات جاوید۔الطاف حسین حالی، ص: ۱۹۵، پہلا ایڈیشن ۱۹۷۹ء

۳۹۔ ایضاً۔ص: ۱۹۶

۴۰۔ ایضاً۔ص: ۱۹۶

۴۱۔ ایضاً۔ص: ۱۹۸

۴۲۔ انسان کے خیالات ''۲۴۹۔۲۵۶'' مقالاتِ سرسید، ص: ۲۴۹۔۲۵۶۔بحوالہ: منظر حسین، علی گڑھ تحریک سماجی اور سیاسی مطالعہ، ۲۰۰۲ء اشاعت دوم، ص: ۹۸

۴۳۔ ایضاً۔

۴۴۔ سویلزیشن، یعنی 'شائستگی اور تہذیب'۔ ۳۶۔۳۴۰، مقالاتِ سرسید، علمی و تحقیقی مضامین (لاہور، مجلس ترقی ادب، ۱۹۶۲ء)، ص: ۳۴۰۔ بحوالہ مظہر حسین، علی گڑھ تحریک سماجی اور سیاسی مطالعہ، ۲۰۰۲ء اشاعت دوم، ص: ۷۶۔۷۷

۴۵۔ 'تمہید۔ مقالاتِ سرسید ۱، ص: ۳۶۔ بحوالہ مظہر حسین، علی گڑھ تحریک سماجی اور سیاسی مطالعہ، ۲۰۰۲ء اشاعت دوم، ص: ۷۷

۴۶۔ سویلزیشن، یعنی شائستگی اور تہذیب۔ ص ص: ۳۴۶۔۳۴۷۔ بحوالہ مظہر حسین، علی گڑھ تحریک سماجی اور سیاسی مطالعہ، ۲۰۰۲ء اشاعت دوم، ص: ۸۴

۴۷۔ کن کن چیزوں میں تہذیب چاہیے۔ '۵۰۔۵۵' تہذیب الاخلاق، ص: ۵۰۔۵۵۔ بحوالہ مظہر حسین، علی گڑھ تحریک سماجی اور سیاسی مطالعہ، ۲۰۰۲ء اشاعت دوم، ص: ۹۰

۴۸۔ رسم و رواج کی پابندی کے نقصانات۔ ص: ۲۲۔ بحوالہ مظہر حسین، علی گڑھ تحریک سماجی اور سیاسی مطالعہ، ۲۰۰۲ء اشاعت دوم، ص: ۹۱

۴۹۔ مہذب قوموں کی پیروی، ص ص: ۳۳۔۳۴۔ بحوالہ مظہر حسین، علی گڑھ تحریک سماجی اور سیاسی مطالعہ، ۲۰۰۲ء اشاعت دوم، ص: ۹۲

۵۰۔ رسم و رواج کی پابندی کے نقصانات۔ ص: ۳۱۔ بحوالہ مظہر حسین، علی گڑھ تحریک سماجی اور سیاسی مطالعہ، ۲۰۰۲ء اشاعت دوم، ص: ۹۳

۵۱۔ مقالاتِ سرسید۔ از عبداللہ خویشگی، ص: ۵۳، بحوالہ قدسیہ خاتون، ص: ۱۴۰

۵۲۔ فکر و نظر، سرسید نمبر۔ اکتوبر خصوصی شمارہ ۱۹۹۲ء، حصہ اوّل۔ بحوالہ: سرسید کا نظریۂ عقل و فطرت۔ اسلوب احمد انصاری، ص: ۱۷

۵۳۔ فکر و نظر، حصہ اوّل۔ تعلیم و تربیت سرسید کی نظر میں۔ عتیق احمد صدیقی، ص: ۲۳، شمارہ ۱۹۹۲ء

۵۴۔ حیاتِ جاوید۔ الطاف حسین حالی، ص: ۱۶۱

۵۵۔ ایضاً۔ ص: ۸۷

۵۶۔ سرسید مسافرانِ لندن۔ ص: ۱۹۷

۵۷۔ تہذیب الاخلاق۔ ص: ۳۳، ۱۸۸۰ء

۵۸۔ مقدمہ ابواللیث صدیقی۔ اسباب بغاوت ہند ۱۸۵۷ء، ص: ۱۹

۵۹۔ سرسید اور ہندوستانی مسلمان۔ نورالحسن نقوی، ۴۳۴۶، جواہر لال نہرو میری کہانی، جلد دوم۔ ب، ت، ص: ۳۱۵

۶۰۔ مکمل مجموعہ لکچرز و اسپیچز۔ امام الدین گجراتی، ص: ۳۲۵، ایجوکیشنل کانفرنس کے اجلاس اوّل میں ۲۷ر دسمبر ۱۸۸۶ء، نول کشور پریس لاہور، بحوالہ: قدسیہ، ص: ۱۵۲

۶۱۔ مکتوب سرسید لندن، ۱۵ر اکتوبر ۱۸۶۹ء بنام سکریٹری سائنٹفک سوسائٹی، مشمولہ مکاتیب سرسید احمد خاں، ص: ۳۵

●●●

علی گڑھ تحریک اور سرسید کی خدمات

سرسید کی ادبی وقومی خدمات کسی ایک میدان تک محدود نہ تھیں، بلکہ ان کی خدمات کا دائرہ بھی ان کی فکر کی طرح لامحدود تھا۔ مسلمانوں کی فلاح اور اصلاح سرسید کی زندگی کا اہم مقصد تھا۔ اپنے اس مقصد کے حصول کے لیے انھوں نے علی گڑھ تحریک کا آغاز کیا۔

علی گڑھ تحریک نے مسلمانوں کے فکری جمود کو توڑا اور ان کی زندگی میں حرکت پیدا کی۔ ان میں سوچنے، سمجھنے، حالات کا مقابلہ کرنے، حکمراں قوم اور اپنے ہم وطن بھائیوں سے کاندھے سے کاندھا ملا کر چلنے کی ہمت وصلاحیت پیدا کی۔ غرض یہ کہ اس تحریک نے تمام ہندوستان کو بیدار کر کے قومیت کے تصور کو اُجاگر کیا۔

علی گڑھ تحریک کی اہم خدمات یہ ہیں کہ اس نے ہندوستانیوں خاص کر مسلمانوں کو قدیم طریقے پر گامزن رہنے سے گریز کرنا سکھایا۔ جدید تعلیم سے ڈرنے، نفرت کرنے کے بجائے اس سے رغبت دلائی اور فائدہ حاصل کرنا سکھایا۔ مذہب کو دلائل عقلی سے سمجھنے اور مذہب کی اصل تعلیم کو عام کرنے کی کوشش کی۔ اس نے ہر فرد میں ملّی احساس، قومی شعور، اجتماعی رجحان پیدا کیا اور قدیم جاگیردارانہ تصورِ حیات سے نکال کر جدید صنعتی دور کی طرف لوگوں کو متوجہ کیا۔ ادب کو افادیت اور مقصدیت سے ہم کنار کیا۔ حاکم ومحکوم یعنی مسلمانوں اور انگریزوں کو ایک دوسرے سے قریب لانے کی کوشش کی۔

علی گڑھ تحریک کی ان خدمات نے بالخصوص مسلمانوں اور بالعموم ہندوستانیوں کو ایک نئی قوت عطا کی۔ انھیں مایوسی، محرومی اور ناکامی کے احساس سے باہر نکال کر ان میں نئی روح پھونکی اور انھیں اس بات کا یقین دلایا کہ ہندوستان بھی کسی سے کم نہیں ہے۔

علی گڑھ تحریک کے پیشوا کی حیثیت سے سرسید نے جو خدمات انجام دیں انھیں مطالعے کی آسانی کے لیے ہم درج ذیل حصوں میں تقسیم کر سکتے ہیں:

۱۔ سائنٹفک سوسائٹی اور علی گڑھ انسٹی ٹیوٹ گزٹ

۲۔ رسالہ تہذیب الاخلاق

۳۔ ایم۔اے۔او کالج کا قیام

۴۔ مسلم ایجوکیشنل کانفرنس

۵۔ اردو شعر و ادب

سرسید کی خدمات کے مذکورہ گوشوں پر روشنی ڈالنے سے قبل مناسب یہ ہے کہ ان کی خدمات پر بھی ایک نظر ڈال لی جائے جو انھوں نے اپنی ملازمت کے دوران انجام دی تھیں۔ ان کی ان خدمات کی تعریف انگریز افسروں نے بھی کی ہے۔

مسٹر شیکسپیئر اپنے ایک خط میں لکھتے ہیں کہ:

> ''سرسید احمد خاں ان باتوں کی طرف بھی متوجہ ہوئے ہیں جو ان کے خاص کام سے علاقہ نہیں رکھتیں۔ چنانچہ انھوں نے اس ضلع کی تاریخ بھی بہت محنت کے ساتھ تیار کی تھی کہ غدر سے چند روز پہلے ہم نے یہ کتاب گورنمنٹ میں بھیجی تھی۔ اگر وہ اس وقت یہاں میرے پاس موجود ہوتی تو بہت بکا و آمد ہوتی۔ مگر غالب ہے کہ آگرہ میں بہ باعث غدر کے تلف ہوگئی۔''[۱]

چنانچہ جب سرسید میرٹھ میں بیمار پڑ گئے اور ان کی بیماری کی اطلاع مسٹر کری کرافٹ ولسن کو ملی تو وہ خود سرسید کو دیکھنے آئے اور کہا کہ:

''تم ایسے نمک حلال نوکر ہو کہ ایسے نازک وقت میں تم نے سرکار کا ساتھ نہیں چھوڑا۔ باوجودیکہ ضلع بجنور میں ہندو مسلمان میں کمال عداوت تھی، مگر جب تم کو اور ذہنی رحمت خاں کو ضلع سپرد کرنا چاہا تو تمہاری نیک خصلت اور اچھے چلن اور سرکار کی نہایت طرف داری کے سبب تمام ہندوؤں نے جو ضلع میں نامی چودھری اور بڑے رئیس تھے کمال خوشی اور آرزو سے تم مسلمانوں کا اپنے اوپر حاکم بننا قبول کیا بلکہ خود درخواست کی کہ تمہیں سب ہندوؤں پر ضلع میں حاکم بنائے جاؤ۔ سرکار نے بھی تم کو اپنا خیر خواہ اور نمک حلال نوکر جان کر کمال اعتماد کے ساتھ ضلع کی حکومت تم کو سپرد کی اور تم اپنی طرح نمک حلال اور وفادار سرکار کے اپنے اس کے صلے میں اگر تمہاری ایک تصویر بنا کر پشت ہا پشت کی یادگاری اور تمہاری اولاد کی عزت اور فخر کے لیے رکھی جائے تو بھی کم ہے۔''[۲]

جب میں بجنور میں انگریزوں کا دوبارہ قبضہ ہوا تو اس وقت انھوں نے باغیوں کو تلاش کرنا شروع کیا۔ لہٰذا اس وقت مسلمانوں کی نسبت نہ تو حکام ضلع کا خیال اچھا تھا اور نہ افسران فوج کا اور ہندو رئیس جنھوں نے مسلمانوں سے شکست پائی تھی، وہ سب مسلمانوں سے خلاف تھے اور انھیں ہی اصل باغی قرار دینا چاہتے تھے۔ لہٰذا اس سلسلے میں سرسید نے افسرانِ فوج سے گفتگو کی۔ کہا کہ:

''سرکار کے نزدیک باغی صرف وہی لوگ قرار پانے چاہئیں جو اب سرکار سے مقابلہ کے ساتھ پیش آئیں۔ باغی جو لڑائیاں اور فسادات رعایا نے ایک دوسرے سے کیے قانون کی رو سے ان کی نسبت جو کچھ ہو سو ہو، مگر ان کی وجہ

سے کسی کو سرکار کے مقابلے میں باغی قرار نہیں دیا جاسکتا۔ میرے نزدیک بروقت داخل ہونے سرکاری فوج کے اگر کوئی مقابلہ نہ کرے اور سب لوگ مع نواب محمود خاں کے حاضر ہو جائیں تو ضلع بجنور کے کسی شخص کو باغی قرار دینا نہیں چاہیے۔''[۳]

جو لوگ پوری طرح سے باغی ثابت ہو چکے تھے سرسید نے ان کی حمایت ہرگز نہیں کی، لیکن جو لوگ مجبوری کی وجہ سے شامل تھے یا جنھوں نے سرسید کو ذاتی طور پر تکلیف پہنچائی تھی تو ان کو بچانے کی پوری پوری کوشش کی۔

ایک تحریر میں جو نواب محسن الملک نے لکھوائی اور مولانا نذیر احمد نے جو خاص بجنور کے رئیس ہیں، اپنے قلم سے لکھی اور جو کہ گویا ان دونوں نامور اور معزز شخصوں کے خیالات کا مجموعہ ہے اس میں سے ہم ذیل کا فقرہ نقل کرتے ہیں:

''سید احمد خاں کو سرکار انگریزی کی طرف سے ضلع بجنور کا نظم و نسق سپرد تھا اور وہاں کے ہندو مسلمانوں کی خانہ جنگیاں یادگار غدر ہیں۔ اس عموم بے تمیزی میں خود سید احمد خاں کے ساتھ بھی لوگ نہایت درجہ کی گستاخی اور بے توقیری سے پیش آئے اور قریب تھا کہ ہلاک کریں، عودِ تسلط کے بعد اس ضلع کے تمام باشندوں کی جان سید احمد خاں کی مسیحی میں تھی۔ اگر ان سے اختیارات کسی دوسرے کے ہوتے تو بجنور کے حصہ میں قیامت آ گئی ہوتی، مگر یہ معاملہ فہم و منصف مزاج، نرم دل، نیک طینت آدمی اس وقت بھی فرق کرتا تھا بغاوت اور خانہ جنگیوں میں، مخالفت اور جہالت میں، حملہ اور حفاظت میں اور سید احمد خاں کی بدولت بجنور ہی ایک ضلع تھا جو عواقب و تبعات غدر سے محفوظ رہا۔''[۴]

سرسید کو غدر کی خدمات کے صلہ میں مسز شیکسپیئر نے بڑی جائداد دینی چاہی مگر انھوں نے یہ بہانا بنایا کہ مجھے ہندوستان میں رہنا نہیں ہے، جب کہ بات دوسری تھی۔ اس کی وضاحت اس تحریر میں جو نواب محسن الملک کی طرف سے مولانا نذیر احمد نے حیدرآباد میں لکھی تھی۔ صاف ظاہر ہوتی ہے کہ:

''سید احمد خاں کو حسنِ خدمات غدر کے صلے میں ضلع بجنور کے ایک بڑے مسلمان رئیس باغی کا بڑا بھاری علاقہ سرکار نے دینا تجویز کیا تھا، مگر سید احمد خاں نے صرف اسی وجہ سے اس کے لینے سے انکار کیا کہ ایک مسلمان بھائی کے خون سے اپنی پیاس بجھانی ان کو کسی طرح گوارہ نہیں ہوسکتی تھی۔''[۵]

سرسید اپریل ۱۸۵۸ء میں بجنور سے صدرالصدوری کے عہدہ پر ترقی پاکر مرادآباد گئے۔ یہاں پر بھی سرسید نے ملازمت کے علاوہ اپنی قوم کی بھلائی کی، وہ اس طرح سے کہ جب ۱۸۵۹ء میں باغیوں کی جائدادیں منضبط کے متعلق عذردار ہونے لگیں اور ان کی سماعت اور تحقیقات کے لیے ایک اسپیشل کمیشن بیٹھا۔ اس میں دو یوروپین ممبر ایک کمشنر روہل کھنڈ دوسرے جج مرادآباد اور ایک ہندوستانی ممبر یعنی سرسید مقرر ہوئے۔ چنانچہ دو برس تک وہ اپنے عہدے کے علاوہ یہ کام بھی انجام دیتے رہے جس کی وجہ سے مرادآباد کے مسلمانوں کو کافی فائدہ پہنچا اور سب کے ساتھ انصاف ہی کیا۔

مرادآباد میں ہی سرسید نے ۱۸۵۹ء میں ایک فارسی مدرسہ قائم کیا، یہاں اس سے پہلے کوئی مدرسہ نہ تھا۔ انھیں دنوں میں انھوں نے ایک رائے تعلیم کے باب میں اردو انگریزی دونوں زبانوں میں لکھ کر شائع کی جس میں گورنمنٹ کے ورنیکلر اسکولوں پر سخت اعتراض تھا اور ہندوستانیوں کو انگریزی زبان میں تعلیم دینے کا سرکار کو مشورہ دیا تھا۔

ہم اس مضمون میں سے دو تین فقرے اس مقام پر نقل کرتے ہیں:

''گذشتہ چند سالوں میں گورنمنٹ نے جو انتظام رعایاے ہندوستان کی تعلیم کا

کیا ہے سب سے اوّل اس میں یہ بات قابلِ لحاظ ہے کہ آیا فی نفسہٖ وہ انتظام ایسا ہے یا نہیں؟ کہ رعایا کا اس سے ناراض ہونا اور خواہ نہ خواہ بدگمانی کرنا ضروری ہے، ہماری رائے یہ ہے کہ بلاشبہ ایسا ہی ہے۔ گورنمنٹ نے یہ خیال کیا کہ جب کسی قوم کی تربیت کا ارادہ کیا جائے تو جو اس قوم کی زبان ہے اسی میں اس کی تربیت ہو تو بہت آسان ہوگی اور دوسری زبان کے لغت اور محاورے سیکھنے میں جو وقت ضائع ہوتا ہے وہ بچے گا۔ بہ ظاہر اس کی نظیریں بھی موجود تھیں، کیوں کہ تمام اہلِ یورپ اور اہلِ عرب نے اپنی ہی زبانوں میں علم سیکھے ہیں۔ یہ رائے غلط تھی، کل زبانوں پر ایسا خیال کر لینا صحیح نہیں ہے بلکہ ہم کو چاہیے کہ اس بات پر بھی غور کریں کہ جس زبان میں ہم کسی قوم کی تعلیم چاہتے ہیں آیا اس زبان کی حالت ایسی ہے یا نہیں کہ اس زبان میں تعلیم کا ہونا ممکن ہو۔"[۶]

ہمیشہ تعلیم سے یہ مقصود رہا ہے کہ انسان میں ایک ملکہ اور اس کی عقل اور ذہن میں ایک جودت پیدا ہوتا کہ جو امور پیش آئیں ان کے سمجھنے کی برائی، بھلائی جاننے کی اور عجائب قدرت الٰہی پر فکر کرنے کی اس کو طاقت ہو، اس کے اخلاق درست ہوں، معاملات معاش کو نہایت صلاحیت سے انجام دے اور امورِ معاد پر غور کرے۔ گورنمنٹ کا یہ کہنا کہ: "ہم کو اس قدر تربیت سے کچھ علاقہ نہیں، بلکہ ہم اسی قدر تعلیم کے خواہاں ہیں جو امورِ معاش سے علاقہ رکھتی ہیں اور جو منحصر ہے صرف جغرافیہ، حساب اور ہندسہ پر نہایت بے جا ہے:

"سررشتۂ تعلیم جو چند سال سے جاری ہے وہ تربیت کے لیے ناکافی ہی نہیں بلکہ خراب کرنے والا تربیت اہلِ ہند کا ہے۔ اردو زبان جس کے وسیلے سے

اکثر جگہ تعلیم جاری ہے اس کی حالت ایسی نہیں ہے جس سے تعلیم ہونا ممکن ہو، کیوں کہ جس زبان میں ہم کسی قوم کی تعلیم کا ارادہ رکھتے ہیں اس زبان کی نسبت اوّل ہم کو یہ دیکھنا چاہیے کہ اس میں علمی کتابیں کافی موجود ہیں یا نہیں؟ کیوں کہ اگر یہ نہ ہو تو تعلیم ممکن نہیں۔ دوسرے یہ کہ وہ زبان فی نفسہٖ اس قابل ہے یا نہیں کہ اس میں علمی کتابیں تصنیف ہو سکیں؟ کیوں کہ پہلی بات کا تو علاج ہو سکتا ہے، مگر دوسری بات لاعلاج ہے۔ تیسرے یہ کہ آیا وہ ایسی زبان ہے یا نہیں کہ اس میں علوم پڑھنے سے جودت طبع، جدت ذہن، سلاستِ فکر، ملکۂ عالی، قوتِ ناطقہ، پختگی تقریر اور تربیتِ دلائل کا سلیقہ پیدا ہو سکے؟ ان تینوں باتوں میں سے اردو زبان میں کوئی بات نہیں۔ پس گورنمنٹ پر واجب ہے کہ اسی طریقۂ تعلیم کو جو درحقیقت تربیت انسان کو خراب کرنے والا اور خود بخود لوگوں کے دلوں میں بدگمانی پیدا کرنے والا ہے بالکل بدل دے اور اس زبان میں تربیت جاری کرے جس سے تربیت کا جو اصلی نتیجہ ہے وہ حاصل ہو۔''[۷]

مراد آباد میں ہی اپنی صدر الصدوری کے دوران جب اضلاع شمال مغرب میں قحط پڑا تو وہاں کے کلکٹر مسٹر جان اسٹریچی نے انتظام سرسید کے حوالے کر دیا۔ سرسید نے اپنی اور خدمات کی طرح یہ خدمت بھی بڑی محنت و جاں فشانی سے انجام دی۔

سرسید نے اس قحط کا انتظام اس شرط پر لیا تھا کہ بچے مشنریوں کو نہیں دیے جائیں۔ تمام لاوارث بچے جو ہندوؤں کے ہوں وہ ہندوؤں کو اور جو مسلمانوں کے ہوں وہ مسلمانوں کو دیے جائیں۔ لہٰذا انھوں نے یہی کیا اور ساتھ ہی ساتھ بچوں کو لینے والوں سے یہ اقرار نامہ لکھوایا جاتا تھا کہ ہم انھیں لونڈی یا غلام نہیں بنائیں گے۔

لیکن اسی دوران اسٹریچی صاحب کی تبدیلی ہوجانے پر مسٹر پاوران کی جگہ قائم ہوگئے۔اس طرح اب مشنریوں نے لاوارث بچوں کے لینے کی بات ان کے سامنے پیش کردی اور کہا کہ تمام بچے واپس لینے جائیں اور آخرکار سرسید کی تمام کوشش وجدوجہد کے باوجود بچے مشنریوں کو دے دیے۔تب ہی سرسید نے ایک یتیم خانہ قائم کرنے کا ارادہ کیا لیکن پہلے انھوں نے تعلیم کو ہی بہتر جانا۔

بنارس میں ہی سرسید نے ۲۵رستمبر ۱۸۶۷ء میں ایک شفاخانہ بنام ''ہومیوپیتھک ڈسپنسری اینڈ ہاسپٹل'' کھولا اور ایک رسالہ ۱۸۶۷ء میں ہیضہ کے علاج پر شائع کیا۔اس ہاسپٹل کا فائدہ یہ ہوا کہ کافی لوگ اس کی طرف متوجہ ہوئے۔اس سے پہلے لوگ اس طریقۂ علاج سے واقف نہ تھے۔

بنارس میں انھوں نے دوسری کمیٹی خواست گار ترقیِ تعلیم مسلمانان قائم کی۔سکریٹری سرسید تھے، وہ لندن ہی سے ایک اشتہار ۲۶ردسمبر ''تدابیر ترقیِ تعلیم مسلمانان'' کی نسبت اردو انگریزی میں چھپوا کر اپنے آنے سے پہلے مولوی سید مہدی علی خاں کے پاس جو اس زمانے میں مرزاپور میں تحصیل دار تھے، اشاعت کی غرض سے بھیج چکے تھے لیکن انھوں نے اس کو معمولی سمجھا۔ولایت سے آنے کے بعد انھوں نے اس کام کو شروع کیا۔اس کا عنوان ''التماس بخدمت اہلِ اسلام و حکام ہند درباب ترقی تعلیم مسلمانان ہندوستان'' تھا۔۱۸۷۰ء کو یہ اخبار جاری ہوا۔

اس کمیٹی کا کام یہ معلوم کرنا تھا کہ سرکاری کالجوں اور اسکولوں میں مسلمان کس سے کم پڑھتے ہیں، علوم قدیمہ ان میں کیوں گھٹ گئے اور علومِ جدیدہ کیوں نہیں رواج پاتے اور جب یہ موانع ٹھیک ٹھیک دریافت ہوجائیں تو ان کے وضع کرنے کی تدبیریں دریافت کرے اور ان تدبیروں پر عمل درآمد کرنے میں کوشش کرے۔

۱۸۷۸ء میں سرسید وائسریگل لیجسلیٹو کونسل کے ممبر مقرر ہوئے۔انھوں نے اپنی ممبری کونسل کے زمانہ میں ہندوستان کی بھلائی کے لیے قانون بنایا، یہاں وہ چار سال تک مقرر رہے۔ یہاں

انھوں نے دو اہم خدمات چیچک کے ٹیکے کے قانون اور قاضیوں کے تقرر کے قانون سے متعلق انجام دیں۔ ۱۸۷۹ء میں ٹیکہ کا قانون پاس ہوا اور ۱۸۸۰ء میں قانون تقرر قاضیاں پاس ہوا۔

۱۸۸۳ء میں سرسید نے ''محمڈن سول سروس ایسوسی ایشن'' قائم کی، یہ مسلمانوں کو ولایت جانے میں مدد کی غرض سے قائم کی گئی کہ اگر پانسو مسلمان ممبر دو دو روپیہ ماہوار دینے والے پیدا ہو جائیں تو اس سے ہزار روپیہ سالانہ کی آمدنی ہو جائے گی جو بہ طور فنڈ کے جمع ہوتی رہے گی تا کہ مسلمان نوجوان جو ولایت کا خرچ نہیں اُٹھا سکتے ان کی اس فنڈ سے مدد کی جائے۔

اس کے علاوہ مدرسۃ العلوم میں ایک خاص کلاس قائم کی، تعلیم کا طریقہ ایسا مقرر کیا گیا تھا جس سے اس کلاس کے طالب علموں کو ولایت پہنچ کر سول سروس کے امتحان میں مدد ملے۔

سرسید کی ان خدمات پر نظر ڈالنے سے حیرت ہوتی ہے کیوں کہ سرسید نے ملازمت اس وقت اختیار کی تھی کہ جب وہ خود ۲۱ سال کے تھے۔ والد (میر متقی) کا سایہ ۱۸۳۸ء میں اُٹھ چکا تھا جس کی وجہ سے ان کی صحیح ڈھنگ سے تعلیم نہ ہو سکی، لیکن انھیں تعلیم حاصل کرنے کا بڑا شوق تھا۔ سرسید کے تعلیم حاصل کرنے کے شوق کے سلسلے میں مولانا حالی نے سید میر محمد مرحوم امام جامع مسجد دہلی کا یہ بیان نقل کیا ہے کہ:

> ''جس زمانے میں سید صاحب دلّی سے رہتک بدل کر گئے، میں بھی ان کے ساتھ گیا تھا۔ تو وہ صبح سے دس بجے تک مولوی نوازش علی صاحب سے، جن کو وہ دلّی سے ہمراہ لائے تھے، سبق پڑھتے تھے۔ بیس بیس بائیس بائیس صفحے شرح جامی اور قطبی کے وہ ہر روز پڑھ لیتے تھے۔ میں بھی ان کے ساتھ پڑھنے کے لیے گیا تھا، مگر اس رفتار سے ان کے ساتھ نہ چل سکا اور واپس چلا آیا۔ سبق کے بعد وہ کھانا کھا کر تھوڑی دیر قیلولہ کرتے تھے، پھر کچہری جاتے اور

شام تک کچہری کرتے۔ وہاں سے آکر شام کے کھانے اور نمازوں سے
فارغ ہوکر سو رہتے۔ کوئی تین ساڑھے گھنٹے سوتے تھے۔ اس کے بعد ہمیشہ
بلاناغہ اُٹھ بیٹھتے اور صبح تک برابر مطالعہ کرتے یہ اس زمانے کا حال ہے جب
سرسید کی عمر ۳۶ برس کی تھی۔''[۸]

سرسید شروع سے ہی علماء، فضلا کی صحبتوں میں شریک رہے۔ مثلاً مفتی صدرالدین خاں، صہبائی، شیفتہ اور مومن وغیرہ۔ مولانا صہبائی اور نواب ضیاء الدین سے ان کے دوستانہ تعلقات تھے۔ مرزا غالب بھی ان سے کافی محبت واُنسیت رکھتے تھے اور سرسید بھی ان کو چچا کہہ کر پکارتے تھے۔

دہلی کی ان علمی وادبی صحبتوں کا ذکر سرسید نے اپنے ایک مضمون 'سراب حیات' میں افسانوی انداز میں کیا ہے۔ فرماتے ہیں کہ:

''میں دل بہلانے کے لیے اپنے باغ میں گیا جو ایک بہت بڑا باغ تھا اور
جوانی اور ولولہ کے زمانے میں میں نے اس کو از سرنو نہایت خوب صورت و
خوش نما آراستہ کیا تھا اور وہاں اکثر دوستوں کا اور بڑے بڑے نامی اور باکمال
لوگوں کا مجمع ہوتا تھا۔ غالب کی دل کش ومحبت آمیز بزرگانہ باتوں سے،
آزردہ کی دلچسپ ودل رُبا فصاحت سے، شیفتہ کی متین ونیم خندہ زن وضع
سے اور صہبائی جاں نواز کے مے خانۂ محبت سے دل شاد شاد رہتا تھا۔''[۹]

ازدواجی زندگی کی شروعات تھی، معاشی پریشانی میں مبتلا تھے لیکن اس قدر پریشانی میں مبتلا ہونے کے باوجود سرسید نے جو خدمات انجام دیں وہ کسی عجوبے سے کم نہیں ہیں۔

سرسید کی خدمات کا دائرہ کافی وسیع ہے۔ انھوں نے اپنی ملازمت کے دوران، ایسی ایسی گراں مایہ خدمات انجام دی ہیں کہ جس سے ملک وقوم کے لیے ان کی والہانہ محبت صاف ظاہر ہوجاتی ہے۔

ان خدمات کو کئی حصوں میں تقسیم کیا جا سکتا ہے:

۱۔ تصنیفی خدمت ۲۔ تعمیری خدمت

۳۔ اخلاقی وانسانی خدمت ۴۔ مذہبی خدمت

۵۔ سرکاری وسیاسی خدمت ۶۔ ملکی وقومی خدمت

سرسید کی ذات میں شروع سے ہی خدمت، ہمدردی اور مدد وفیاضی کا جذبہ نظر آتا ہے۔ اس کی عمدہ مثال ان کے اخبارات، مدرسے، جلسے، سوسائٹیز، تقاریر اور تعمیرات وغیرہ ہیں، جو کہ انھوں نے اس افراتفری کے دور میں انجام دی تھیں کہ جب حکمراں قوم مسلمانوں کو اپنا سب سے بڑا اور خطرناک دشمن وباغی قرار دے رہی تھی۔ لیکن سرسید نے اس وقتی ہنگامہ آرائی میں اپنا وقت ضائع نہ کر کے اسی حکمراں قوم کی سرپرستی میں ہندوستانی عوام کے لیے ایسے ایسے اقدامات اُٹھائے کہ جس کی وجہ سے ہمارے رہبرانِ آزادی ملک کو آزاد کرانے میں کامیاب ہوئے۔ سرسید کے یہ تمام اقدامات اس بات کی شہادت دیتے ہیں کہ سرسید ۱۸۵۷ء کے ہنگامہ سے پہلے ہی بیدار ہو چکے تھے اور انھیں یہ بھی یقین ہو گیا تھا کہ ہندوستان کو آزاد کرانے میں ہتھیار کی نہیں قلم کی ضرورت ہے۔

غرض یہ کہ سرسید نے اپنی چالیس سالہ ملازمت کے دوران جو خدمات انجام دی ہیں اس باب میں ہم انھیں پر ایک مختصر سی روشنی ڈالیں گے۔ اس مختصر جائزے میں یہ معلوم ہو جائے گا کہ سرسید نے پہلے ملازمت کہاں کی، پھر کہاں تبدیل ہو کر گئے وغیرہ وغیرہ۔

(۱) دلّی ۱۸۳۸ء عہدہ سررشتہ دار: مدت قیام ایک سال۔ والد کے انتقال کے بعد سرسید دلّی کچہری میں اپنے خالو خلیل اللہ (جو کچہری میں صدر امین تھے) کی مدد سے سررشتہ دار کے عہدے پر مقرر ہوئے۔ یہاں پر انھوں نے اپنے فرائض بہ خوبی انجام دیے۔ یہاں سے بعد میں مسٹر ہملٹن کے بلانے پر آگرہ چلے گئے۔

(۲) ملازمت آگرہ ۱۸۳۹ء عہدہ نائب منشی: مدتِ قیام دو سال۔

تصنیفی خدمات:

(۱) جام جم

(۲) انتخاب الاخوین

(۳) ملازمتِ مین پوری ۱۸۴۱ء عہدہ منصف، مدتِ قیام ایک سال۔

(۴) ملازمتِ فتح پور سیکری ۱۸۴۲ء عہدہ منصف، مدتِ قیام چار سال۔

مذہبی خدمات:

(۱) جلاء القلوب بذکر المحبوب (۲) تحفۂ حسن

(۳) تسہیل فی جر الثقیل

(۵) ملازمتِ دلّی ۱۸۴۶ء عہدہ منصف، مدتِ قیام آٹھ سال۔

تصنیفی خدمات:

(۱) آثار الصنادید (پہلا ایڈیشن ۱۸۴۷ء، دوسرا ایڈیشن ۱۸۵۴ء)

(۲) فوائد الافکار فی اعمال الفرجار (۳) قول متین در ابطال حرکت زمین

(۴) کلمۃ الحق (۵) راہِ سنت در بدعت

(۶) نمیقہ در بیان مسئلۂ شیخ (۷) سلسلۃ الملوک

(۸) آغاز کیمیائے سعادت کے چند اوراق کا ترجمہ

(۶) ملازمتِ بجنور ۱۸۵۵ء عہدہ صدر امین، مدتِ قیام دو سال چار مہینے۔

تصنیفی خدمات:

(۱) تاریخِ بجنور

(۲) تصحیح آئینِ اکبری

تعمیری خدمات:

(۱) پل

(۲) سڑک (بجنور سے درانگر تک) اخلاقی وانسانی خدمت

(۳) یوروپین مردوں، عورتوں اور بچوں کی جان بچانا

(۴) مسلمانانِ بجنور کو ''باغی'' لفظ کے الزام سے بری کرانا۔

(۷) ملازمتِ مرادآباد ۱۸۵۸ء، عہدہ صدرالصدور، مدت قیام پانچ سال۔

تصنیفی خدمات:

(۱) تاریخ سرکشی بجنور

(۲) رسالہ اسبابِ بغاوت ہند

(۳) رسالہ لائل محمدنز آف انڈیا

(۴) رسالہ تحقیق لفظ نصاریٰ

(۵) تصحیح تاریخ فیروز شاہی

قومی خدمت:

(۶) جائداد ضبط کرنے کا مسئلہ

(۷) فارسی مدرسہ قائم کرنا

(۸) تعلیم کے باب میں رائے (انگریزی زبان میں تعلیم کی مانگ)

(۹) تقریریں کرنا

(۱۰) قحط میں ہندوستانیوں کی دیکھ بھال

(۱۱) تبیین الکلام کی شروعات (بعد میں غازی پور جا کر مکمل کرنا)

(۸) ملازمتِ غازی پور ۱۸۶۲ء، عہدہ اسمال کاز کورٹ، مدت قیام دو سال۔

تصنیفی خدمات:

(۱) تبیین الکلام

(۲) اشتہار، التماس بہ خدمت ساکنانِ ہندوستان در باب ترقی تعلیم اہلِ ہند (اس کا خلاصہ یہ تھا کہ ہندوستان میں علم پھیلانے اور ترقی دینے کے لیے ایک مجلس مقرر کرنی چاہیے جو اپنے قدیم مصنفوں کی عمدہ کتابیں اور انگریزی کی مفید کتابیں اردو میں ترجمہ کرا کے چھاپے۔

(۳) سائنٹفک سوسائٹی (۱۸۶۳ء)

(۴) مدرسہ (۱۸۶۴ء) وکٹوریہ ہائی اسکول

(۹) ملازمتِ علی گڑھ ۱۹۶۴ء، عہدہ اسمال کاز کورٹ، مدت قیام تین سال۔

تصنیفی خدمات:

(۱) سائنٹفک سوسائٹی کا قیام (ترقی دینا)

(۲) علی گڑھ برٹش انڈین ایسوسی ایشن (پارلیمنٹ کو ہندوستانیوں کے حالات سے واقف کرانا)

(۳) انسٹی ٹیوٹ گزٹ ۱۸۶۶ء

(۱۰) ملازمتِ بنارس ۱۸۶۷ء عہدہ اسمال کاز کورٹ، مدت قیام ایک سال ساڑھے سات مہینے۔

تصنیفی خدمات:

(۱) رسالہ احکام طعام اہلِ کتاب

(۲) شفاخانہ

(۳) ہومیو پیتھک ڈسپنسری اینڈ ہوسپٹل

(۴) لتاسیس مدرسۃ المسلمین

(۵) فارسی رسم الخط اور اردو کی حمایت

(۶) خاص مسلمانانِ ہند کی فلاح و بہبود کی فکر

(۷) کمیٹی خواست گار ترقی تعلیم مسلمانان

(۸) اشتہار، التماس بخدمت اہلِ اسلام و حکام ہند در باب ترقیِ تعلیم مسلمانانِ ہندوستان

(۱۱) دورانِ سفر ۱۸۶۹ء بنارس سے، مدتِ سفر سترہ مہینے۔

تصنیفی خدمات:

(۱) سفرنامہ

(۲) خطباتِ احمدیہ (سر ولیم میور کی کتاب The Life of Mohammad کا جواب)

(۳) 'پمفلٹ' بہ عنوان ہندوستان کے موجودہ نظامِ تعلیم اور مذہبی اوہام وغیرہ پر اعتراض

(۴) اینتھیم کلب کی ممبری

انگلستان سے واپسی ۱۸۷۰ء۔

تصنیفی خدمات:

(۱) تہذیب الاخلاق

(۲) کمیٹی خواست گار ترقی مسلمانان

(۳) کمیٹی خزینۃ البضاعت

(۴) ڈاکٹر ہنٹر کی کتاب پر ریویو

(۵) علی گڑھ میں مدرسہ قائم کرنا

(۶) کالج فانڈیشن ستون

(۷) عمارت کالج کا انتظام

(۸) چندہ وصول کرنا

(۹) تفسیر القرآن

(۱۰) اردو شعر و ادب کی اصلاح

(۱۲) سبک دوشیِ ملازمت ۱۸۷۶ء، علی گڑھ میں قیام، مدت بائیس سال۔

اخلاقی و انسانی خدمات:

(۱) چیچک کے ٹیکہ کا قانون

(۲) قاضیوں کے تقرر کا قانون

(۳) قانون وقف خاندانی

(۴) ایجوکیشن کمیشن میں شہادت

(۵) محمڈن ایسوسی ایشن علی گڑھ

(۶) پبلک سروس کمیشن کی ممبری

(۷) انڈین نیشنل کانگریس کی مخالفت

(۸) پیٹریاٹک ایسوسی ایشن

یہ تھیں سرسید کی خدمات جن کا مختصر تعارف پیش کیا گیا ہے۔ چنانچہ اب ہم ان کی تصنیفات اور علمی قابلیت پر تفصیل سے بحث کریں گے۔

سرسید کا مطالعہ بہت وسیع تھا اور لکھنے پڑھنے سے انھیں فطری مناسبت اور قدرتی لگاؤ تھا۔ چنانچہ خود ان کا بیان تھا کہ:

''جیسا تصنیف و تالیف میں میرا جی لگتا ہے ویسا کسی کام میں نہیں لگتا۔''[۱۰]

اسی شوق کی وجہ سے ان کی علمی قابلیت میں اور بھی اضافہ ہوا اور جلد ہی سرسید بے شمار گراں مایہ کتابوں کے مصنف بن گئے۔

کثرت مطالعہ کے ساتھ ساتھ سرسید میں محنت اور تحقیق و کاوش کی خاص عادت تھی، چنانچہ تحصیل علم کے بعد ہی انھوں نے تصنیف و تالیف کی طرف توجہ کی۔ ۱۸۳۶ء میں جب کہ سرسید ابھی ۱۹ سال کے ہی تھے کہ اپنے بڑے بھائی احتشام الدولہ نواب سید محمد خاں کے جاری کردہ اخبار 'سید الاخبار' میں مضامین لکھنے کا آغاز کیا۔

۱۸۴۰ء میں سرسید کے تصنیفی دور کا آغاز ہوتا ہے۔ چنانچہ انھوں نے ریاضیات، قانون، تاریخ، سیاسیات، تعلیم، حدیث، تفسیر، فقہ، کلام ایسے اہم اور مشکل موضوعات پر تقریباً چالیس کتابیں تصنیف، تالیف اور ترجمہ کیں۔ بے شمار مضامین لکھے ان کی تعداد بحیثیت مجموعی چھ ہزار صفحات سے کم نہ ہوگی۔ ان کی زندگی شروع سے آخر تک علمی زندگی تھی، اگرچہ انھوں نے نہ تو انگریزی کی اعلیٰ تعلیم حاصل کی تھی، نہ وہ کسی یونیورسٹی کے سند یافتہ تھے۔ بلکہ ان کو اس زبان کی بہت ہی معمولی واقفیت تھی۔ جو کہ نہ ہونے کے برابر ہے، نہ وہ علوم عربیہ کے منتہی تھے۔ حتیٰ کہ درس نظامیہ کی تکمیل بھی نہ کر پائے تھے اس کے باوجود انھوں نے علوم رسمی سے جو واقفیت حاصل کی تھی اور دینی علوم حدیث، فقہ، تفسیر اور فنون میں ہیئت، ریاضیات، منطق، فلسفۂ کلام وغیرہ میں جو کچھ پڑھا تھا، اس میں انھوں نے اپنی ذاتی کوشش، محنت اور کثرت مطالعہ سے اس قدر دستگاہ پیدا کر لی تھی کہ علمی و فنی معلومات کے لحاظ سے وہ علم و فضل میں اپنے معاصر اہلِ علم سے کم نہ تھے۔ جن علمی موضوعات کو سرسید نے اختیار کیا ان کو دیکھ کر حیرت ہوتی ہے۔

سرسید کے ان علمی کارناموں نے ہی ایک مردہ قوم میں بیداری کی روح پھونک دی۔ اس کو اعلیٰ تعلیم اور علوم و فنون کی تحصیل پر آمادہ کر دیا۔ سرسید کے علمی اور تصنیفی کاموں کے تین دور قائم کیے جا سکتے ہیں:

پہلا دور: ۱۸۴۰ء سے لے کر ۱۸۴۶ء تک کا ابتدائی دور جس میں انھوں نے چند علمی اور مذہبی رسالے لکھے اور ترجمہ کیے۔

دوسرا دور: ۱۸۴۷ء سے لے کر ۱۸۵۸ء تک وسطی دور جس میں تاریخی کتابوں کی تصنیف اور تدوین ہوئی۔

تیسرا دور: ۱۸۵۸ء سے لے کر ۱۸۹۷ء تک کا آخری دور جو اعلیٰ، علمی اور مذہبی تصانیف کے لحاظ سے نہایت شان دار ہے۔

سرسید کے ابتدائی تصنیفی دور میں کوئی خاص پختگی روانی نہیں ہے، ان میں زیادہ تر تالیفات اور ترجمے ہیں۔ اس لیے اس دور میں ان کا کوئی قابلِ قدر علمی کارنامہ نظر نہیں آتا۔

الطاف حسین حالی ان کی ابتدائی تصانیف کا ذکر کرتے ہوئے لکھتے ہیں کہ:

''ان کی طرز تحریر میں اس وقت تک کوئی صریح تبدیلی پیدا نہیں ہوئی جس کے لحاظ سے سرسید کو اردو لٹریچر میں کسی ممتاز حصے کا مستحق کہا جا سکے۔''[11]

اس لیے اس ابتدائی دور کو سرسید کی تصنیف و تالیف کے آغاز کار کی حیثیت سے ہی جانا جاتا ہے۔ البتہ یہی آگے چل کر ان کے علمی کارناموں کا پیش خیمہ ثابت ہوا۔

دوسرا دور:

سرسید کا صحافتی دور ہے جیسا کہ سبھی کو معلوم ہے کہ سرسید اپنے بھائی کے اخبار ''سید الاخبار'' میں مضامین لکھا کرتے تھے۔ یہیں سے ان کی مضمون نگاری کی مشق نے ان کو آئندہ کے علمی کاموں کے لیے تیار کر دیا تھا۔ ان کا دوسرا دور تاریخی تصانیف کی حیثیت سے جانا جاتا ہے، کیوں کہ آثار الصنادید اسی دور کا کارنامہ ہے۔ اس کے ساتھ انھوں نے فارسی کی چند اہم کتابوں، تاریخ فیروز شاہی، آئین اکبری اور تزک جہانگیری کی تصحیح کی۔ لہٰذا یہ دور بھی علمی اعتبار سے کچھ زیادہ نتیجہ خیز نہیں رہا۔ اگرچہ اس کے مفید اور کارآمد ہونے میں کوئی شک نہیں۔

تیسرا دور:

یہ دور سرسید کی تصنیفی زندگی کا نہایت شاندار دور تصور کیا جاتا ہے، کیوں کہ اسی میں سرسید کے ذہن وقلب کے اصل جوہر منظر عام پر آئے۔ یہ دور سرسید کی علمی زندگی کے انتہائی عروج کا دور تھا جس میں وہ ایک اعلیٰ درجہ کے مصنف اور بہترین انشا پرداز کی حیثیت سے نمودار ہوئے۔

ان کی تمام تصانیف ان کے ایک ہی مقصد عظیم کو پورا کرنے کی غرض سے معرضِ تحریر میں آئیں۔ جن میں مذہب اسلام کی حمایت اور مسلمانوں کی اصلاح کا جذبہ کارفرما ہے۔

سرسید کے آخری دور کی تصانیف زیادہ تر مذہبی ہیں۔ یہ تمام تصانیف اسلامی مسائل پر ہی لکھی گئی ہیں اور ان میں زیادہ تر علمی مباحث سے ہی بحث کی گئی ہے۔ مثلاً قرآن مجید کی تفسیر، اصول تفسیر، احادیث وواردات کی تنقید کے اصول، عدم تقلید، فقہی مذاہب کے مسلمہ مسائل سے اختلاف، منقولات کی عقلی تاویل اور اجتہاد کا انکار وغیرہ۔ لہٰذا سرسید نے ان نازک اور گہرے علمی مسائل پر بڑی جرأت اور بے باکی سے قلم اُٹھایا ہے۔

سرسید کے مذہب سے متعلق بحث ومباحثے نے ہی ملکی اور غیر ملکی علماے اسلام کو ان کے خلاف کر دیا تھا جس کے نتیجے میں ان کی مذہبی تصانیف کے رد میں کئی رسالے اور تصانیف شائع ہوئیں۔ سرسید نے ان تصانیف کے جوابات دیے لیکن زیادہ تر وہ اپنے معترضین اور نقادوں کی طرف سے لاپرواہی برتتے ہوئے نظر آتے ہیں۔ چنانچہ اسی بنا پر انھیں نیچری اور ملحد وغیرہ لکھا اور کہا گیا۔

سرسید کی تصانیف کو چار عنوانات میں تقسیم کیا جا سکتا ہے:

(۱) مذہبی (۲) تاریخی (۳) علمی (۴) متفرق

۱۸۳۸ء میں سرسید کے والد کا انتقال ہو گیا تو ان کو گورنمنٹ کی ملازمت کی طرف رجوع ہونا پڑا۔ یہاں پر وہ محکمۂ عدالت کی ملازمت پر فائز ہوئے، اس کے لیے عدالت کی کارروائی سے واقفیت حاصل کی

اور صدر امینی پر ان کا تقرر ہوا پھر ترقی کر کے دلّی کمشنری کے دفتر میں نائب منشی کے عہدہ تک پہنچ گئے۔ ۱۸۴۱ء میں منصف مقرر ہو گئے۔ ۱۸۴۲ء میں ان کا تبادلہ فتح پور سیکری ہو گیا اور ۱۸۴۶ء میں تبدیل ہو کر دہلی گئے اور ۱۸۵۵ء میں وہ بجنور کے صدر امین مقرر ہو گئے۔ یہیں پر انھیں ۱۸۵۷ء کے نا قابلِ برداشت حالات کا سامنا ہوا۔

انتخاب الاخوین:

ملازمت کے ابتدائی زمانے ۱۸۳۸ء میں انھیں زیادہ تر قانون سے ہی واسطہ رہا۔ اسی زمانے میں انھوں نے قوانین دیوانی متعلقہ منصفی کا ایک خلاصہ اس غرض سے تیار کیا کہ وہ عہدہ منصفی ملنے کا ایک اہم ذریعہ بن گیا۔ جب وہ خلاصہ تیار ہو چکا تو صاحب کمشنر نے اس کو گورنمنٹ میں پیش کیا اور سر سید کے لیے عہدہ منصفی کی سفارش کی۔ گورنمنٹ نے اس پر یہ حکم دیا کہ جہاں منصفی خالی ہو سید احمد خاں کو اس پر مقرر کیا جائے لیکن ابھی ان کو یہ عہدہ ملنے بھی نہ پایا تھا کہ عہدہ منصفی کے لیے قواعد امتحان جاری ہو گئے۔ صاحب کمشنر نے ان کو امتحان دینے کی اجازت دی، انھوں نے خود بھی امتحان کی تیاری کی اور اپنے بڑے بھائی سید محمد خاں اور ماموں زاد بھائی حاتم علی خاں کو بھی امتحان دینے پر آمادہ کیا۔ سید محمد خاں نے قانون کی طرف پہلی مرتبہ کم توجہ کی تھی، اس لیے وہ دوسرے سال امتحان میں پاس ہوئے۔ لیکن سر سید احمد خاں اور ماموں زاد بھائی حاتم علی خاں نے پہلی ہی مرتبہ امتحان پاس کر کے ڈپلوما حاصل کر لیا۔

امتحان کے بعد سر سید نے یہ خلاصہ چھاپ دیا اور اپنے بھائی کا نام بھی اس میں شامل کر کے اس کا نام ''انتخاب الاخوین'' تجویز کیا جس کو اس زمانے کے بعض حریف دونوں بھائیوں کے اتحاد کی وجہ سے ''دم اخوین'' کہتے تھے۔ چنانچہ تصنیف و تالیف کے میدان میں یہ ان کا پہلا قدم تھا۔

خان بہادر منشی غلام نبی خاں اور میرے بھائی مرحومین کہتے تھے کہ:

> ''یہ انتخاب منصفی کے امیدواروں کے لیے ایسا مفید نکلا کہ چند روز میں تمام صوبے میں شائع ہو گیا۔ لوگوں کو اس سے بہت فائدہ پہنچا اور بہت سے امیدوار اسی کی بدولت منصف ہو گئے۔''[۱۲]

جامِ جم:

اسی زمانہ میں انھوں نے فارسی زبان میں ایک فہرست نقشہ کے طور پر مرتب کی اور اس کا نام ''جامِ جم'' رکھا۔ اس میں امیر تیمور سے لے کر ابوظفر بہادر شاہ تک ۴۳ بادشاہوں کا حال مختصر طور پر سترہ سترہ خانوں میں قلم بند کیا۔ یہ فہرست ۱۸۴۰ء میں چھپ کر شائع ہوگئی تھی، لیکن یہ بھی دوسری تالیفات کی طرح ناپید ہے۔ اس کا ایک قلمی نسخہ برٹش میوزیم کے کتب خانے میں موجود ہے۔ ڈاکٹر ریو نے اس کا ذکر کیا ہے اور اس کی تاریخ تصنیف ۱۲۵۵ھ بتائی ہے۔ اسی زمانے میں سرسید نے کئی مذہبی رسالے تالیف و ترجمہ کیے جو شائع بھی ہوئے۔

جلاء القلوب بہ ذکر المحبوب (مولفہ ۱۲۵۵ھ/ ۱۸۳۹ء):

یہ رسالہ آں حضرت کی ولادت اور وفات، معجزات اور دیگر حالات کے بیان میں ہے۔ چوں کہ مولود کی مجلسوں میں جتنے رسالے پڑھے جاتے تھے ان میں صحیح روایتیں بہت کم تھیں۔ اس لیے سرسید نے اس زمانے کے خیالات کے مطابق صرف صحیح روایتیں اس میں جمع کر دیں اور عام عقائد اور مشکوک روایتوں کو چھوڑ دیا۔

تحفۂ حسن (مولفہ ۱۲۶۰ھ/ ۱۸۴۴ء):

سرسید نے اہلِ تشیع کے رد میں شاہ عبدالعزیز صاحب کی مشہور فارسی کتاب تحفۂ اثنا عشریہ کے دسویں اور بارہویں باب کا اردو میں ترجمہ کیا۔ دسویں باب میں حضرت صدیقؓ پر شیعی مطاعن کے جوابات ہیں، اور بارہویں باب میں تولا اور تبرا کا بیان ہے۔ یہ ترجمہ انھوں نے اپنے استاد مولوی نورالحسن صاحب کی مدد سے کیا۔

تسہیل فی جرالثقیل (مطبوعہ ۱۸۴۴ء):

یہ ایک فارسی رسالہ کا اردو ترجمہ ہے جس کو مصنف بوعلی نامی نے، ابوذر یمنی عالم کے عربی رسالے کو 'معیار العقول' کے نام سے ترجمہ کیا تھا۔ اس میں جرالثقیل کے پانچ اصول بیان کیے گئے ہیں اور

بھاری چیزوں کو اُٹھانے، سخت چیزوں کو چیرنے اور جن چیزوں کا دبانا یا نچوڑنا دشوار ہے ان کے دبانے یا نچوڑنے کے لیے پانچ آلے ان کے استعمال کا طریقہ اور مختلف ترکیبیں بتائی ہیں۔ اس کے ۳۸ صفحات میں شروع میں فہرست مضامین، انجینئری آلات کے کئی نقشے اور تصویریں بھی دی گئی ہیں۔

آثارالصنادید:

یہ سرسید کے دورِ اوّل کی نہایت اہم تصنیف ہے جو ان کی آئندہ ترقیوں کا پیش خیمہ ثابت ہوئی۔ فروری ۱۸۴۶ء میں جب سرسید فتح پور سیکری سے تبدیل ہو کر دہلی آ گئے تھے اور ۱۸۴۶ء سے لے کر ۱۸۵۴ء تک دلّی میں صدر امین کی حیثیت سے رہے۔ اسی دوران ان کو دہلی کی عمارات اور آثار قدیمہ کی تحقیق کا خیال پیدا ہوا۔ لہٰذا وہ چھٹیوں کے دوران شہر کی عمارتوں کی تحقیقات کرتے، ان کے ساتھ اکثر ان کے دوست مولانا امام بخش صہبائی ہوتے تھے۔ انھوں نے ان عمارتوں اور کھنڈروں کی تاریخی اور اثری تحقیق کی، ان کے کتبے پڑھے اور ان کے چربے اتارنے میں کافی محنت و کاوش سے کام لیا۔ ہر عمارت کا نقشہ مصور سے کھنچوایا اور اس طرح کوئی سوا سو عمارتوں کی تحقیق کی۔ خصوصاً قطب کی لاٹ کے کتبے پڑھنے میں انھوں نے اس قدر زحمت اُٹھائی کہ موجودہ زمانے کے محققین آثار قدیمہ میں بھی اس کی نظیر ملنی دشوار ہے۔ مولانا حالی نے سرسید کا یہ بیان نقل کیا ہے کہ:

> ''ان (کتبات) کو پڑھنے کو ایک چھینکا دو بلیوں کے بیچ میں ہر ایک کتبے کے محاذ میں بندھوا لیا جاتا تھا اور میں خود اُوپر چڑھ کر اور چھینکے میں بیٹھ کر ہر کتبے کا چربہ اُتارتا تھا..... جس وقت چھینکے میں بیٹھتا تھا تو مولانا صہبائی فرطِ محبت سے بہت گھبراتے تھے اور خوف کے مارے ان کا رنگ متغیر ہو جاتا تھا۔''[۱۳]

سرسید کی آئندہ ترقیات کی گویا یہ پہلی سیڑھی تھی اور ان کی یہ حالت بالکل ابوتمام کے اس شعر کی مصداق تھی:

وَ یَصْعَدُ حَتّیٰ یظنُّ الْوَریٰ　　بَان لهٗ حَاجَةً فِیْ السَّماءِ

(یعنی وہ ایسے شوق سے اوپر چڑھ رہا ہے کہ لوگ سمجھتے ہیں اس کو آسمان پر کچھ کام ہے۔'')[۱۴]

آخر کار سر سید نے ۱۸۴۷ء میں تقریباً ڈیڑھ سال کے اندر اس کا پہلا ایڈیشن چھاپ کر تیار کرایا لیکن سال ڈیڑھ سال میں اس کا پہلا ایڈیشن ختم ہو گیا۔ اس کے بعد سر سید کو خیال ہوا کہ جو خامیاں یا کمیاں اس پہلے ایڈیشن میں رہ گئی ہیں ان کی اصلاح کی جائے۔ چنانچہ کتاب پر نظر ثانی کر کے اس کو از سر نو مرتب کیا۔ اس نئے ایڈیشن میں اس کی عبارت کو جو پہلے مقفیٰ اور مسجع تھی، بدل کر سادہ عبارت میں لکھا اور نقشے بھی از سر نو عمدہ تیار کرائے مگر ابھی چھپنے بھی نہ پایا تھا کہ غدر کا آغاز ہو گیا اور وہ سب نقشے غدر میں تلف ہو گئے۔ اس ایڈیشن کا چوتھا باب جس میں دلّی کے مشاہیر کا حال لکھا گیا تھا، وہ بھی اس ایڈیشن میں ہے۔

آثار الصنادید کے چار باب تھے:

۱۔ عمارات بیرون شہر کے بیان میں

۲۔ لال قلعہ اور اس کی عمارتوں کے بیان میں

۳۔ خاص شہر شاہ جہاں آباد کی عمارتوں وغیرہ کے بیان میں

۴۔ دلّی کے مشہور اور نامور لوگوں کے ذکر میں

۱۔ عمارات بیرون شہر کے بیان میں:

اس میں ۱۳۰ عمارتوں کا بیان ہے جس میں ہندو مسلم دونوں کی عمارتیں شامل ہیں اور چند کے سوا باقی ہر عمارت کا کتبہ اور نقشہ اس کے ساتھ دیا گیا ہے۔

۲۔ لال قلعہ اور اس کی عمارتوں کے بیان میں:

اس میں ۳۲ عمارتوں کا بیان اور اس کے نقشے اور کتبے مندرج ہیں۔

۳۔ شہر شاہ جہاں آباد کی عمارتوں وغیرہ کے بیان میں:

اس میں تقریباً ۷۰ حویلیوں، مسجدوں، مندروں، بازاروں، باولیوں اور کتوں وغیرہ کا بیان ہے۔

۴۔ دلّی کے مشہور اور نامور لوگوں کے ذکر میں:

اس میں کسی قدر ان شہروں، قلعوں اور محلوں وغیرہ کا بیان ہے جو ۴۰۴ بکرمی سے لے کر آخر تک وقتاً فوقتاً اس سرزمین میں آباد ہوئے۔ اس کے بعد یہاں کی آب و ہوا اور زبان اردو کا ذکر ہے، پھر مشاہیر اہلِ دہلی کا حال لکھا ہے جس میں مشائخ، علما، فقرا، مجاذیب، اطبا، قرا، شعرا، خوش نویس، مصور، موسیقی داں وغیرہ کا بیان ہے۔

اوّل کے تین باب دیکھ کر سرزمین دہلی کی قدیم شان و شوکت اور عظمت کی تصویر آنکھوں کے آگے پھر جاتی ہے اور تھوڑی دیر کو دنیا سے دل سرد ہو جاتا ہے اور پچھلے باب سے دلی کا اخیر جھگڑا آنکھوں کے روبرو آ جاتا ہے اور تعجب ہوتا ہے کہ جس شہر میں پچاس ساٹھ برس پہلے قوم کے اس قدر اہلِ اللہ، اہلِ علم اور اہلِ ہنر موجود تھے آج وہاں چاروں طرف سناٹا نظر آتا ہے۔

سرسید کی اس تصنیف کی انگریزوں نے بھی کافی تعریف کی، یہاں تک کہ مزید برٹش نے تو اسے اتنی مقبولیت دی کہ انھوں نے ولایت جا کر رائل ایشیاٹک سوسائٹی میں پیش کیا۔ سوسائٹی کے ممبر بھی اس سے متاثر ہوتے اور اس کو انگریزی میں چھپوانے کی خواہش ظاہر کی لیکن سرسید نے اس کو اور بھی آسان اور صاف زبان میں لکھنے کے بعد اس کو انگریزی میں ترجمہ کرنے کو کہا (یہی اس کا دوسرا ایڈیشن تھا)۔ لیکن اسی دوران ہنگامہ میں یہ دوسرا ایڈیشن چھپنے سے پہلے ہی تباہ ہو گیا، لہٰذا اب اس کا کچھ بچا ہوا حصہ محمڈن اینگلو اورینٹل کالج کی لائبریری میں موجود ہے۔

چنانچہ اس کا ترجمہ انگریزی میں نہ ہو کر ۱۸۶۱ء میں گارساں دتاسی کی کوششوں سے فرانسیسی میں ہوا۔ اسی ترجمہ کو دیکھ لندن کی رائل ایشیاٹک سوسائٹی نے سرسید کو سوسائٹی مذکور کا آنریری فیلو مقرر کیا تھا۔

فوائدالافکارفی اعمال الفرجار(۱۸۴۶ء):

یہ سرسید کے موروثی علم ریاضی کے شوق کا نتیجہ ہے۔ دراصل یہ ان فارسی مسودات کا ترجمہ ہے جو سرسید کے نانا نواب فریدالدین خاں نے پرکار تناسبہ کے اعمال پر (جو خود انہی کے نتائج فکر تھے) فارسی میں قلم بند کیے تھے۔ یہ مسودات سرسید کے ہاتھ آ گئے تھے۔ انھوں نے دو انگریز عالموں کے کہنے سے ان مسودات کا اردو میں ترجمہ کیا اور اس میں مثالیں اپنی طرف سے اضافہ کر کے شامل کیں۔ انہی رسائل میں سے ایک رسالہ فوائدالافکار ہے۔ سرسید نے اپنے نانا کے حالات میں سیرت فریدیہ کے نام سے جو رسالہ لکھا ہے اس میں اس رسالہ کا دیباچہ بھی نقل کیا ہے۔ ان کی دیگر ابتدائی تصانیف کی طرح یہ رسالہ بھی مفقود ہے۔

قولِ متین در ابطال حرکت زمین (۱۸۴۸ء):

اس رسالہ میں قدیم خیالات کے مطابق زمین کی حرکت کو انھوں نے غلط ثابت کرنے کی کوشش کی ہے، چوں کہ حرکت زمین کا مسئلہ تمام یورپ کے سائنس دانوں کے نزدیک مسلم ہے۔ اپنے ایک مضمون جس کا عنوان ہے ''ہم بھی کبھی اس رنگ میں تھے'' لکھتے ہیں کہ:

> ''جناب سید فرخند علی صاحب قرآن مجید کی بعض آیات کے استدلال سے زمین کا ساکن ہونا اور آفتاب کا زمین کے گرد متحرک ہونا ثابت فرماتے ہیں۔ اس پر کہتے ہیں کہ ہم بھی کبھی اس رنگ میں تھے۔ بہت مدت ہوئی کہ ہم نے ایک رسالہ لکھا تھا جس کا نام ہے ''قول متین فی ابطال حرکت زمین'' اور فخر کرتے تھے کہ نہایت خوبی سے ہم نے حرکت زمین کا ابطال کیا ہے، مگر جب غور کیا تو سمجھے کہ ع خود غلط بود آنچہ ما پنداشتیم''[۱۵]

کلمۃ الحق (۱۸۴۹ء):

انھوں نے یہ رسالہ پیری مریدی اور بیعت کے مروجہ طریقہ کی اصلاح پر مرتب کیا۔

راہ سنت ورد بدعت (۱۸۵۰ء):

یہ رسالہ فرقۂ اہلِ حدیث کی تائید اور اہلِ بدعت کے رد میں لکھا۔

نمیقہ در بیان مسئلہ تصور شیخ (۱۸۵۲ء):

اس میں انھوں نے مشائخ آفتش ہندیہ کے مصطلحہ تصور شیخ کی تائید کی ہے، اس کو خدا اور رسول کی محبت کا وسیلہ اور رحمت الٰہی کا ذریعہ بتایا ہے۔ یہ مختصر تحریر فارسی زبان میں ایک مکتوب کی شکل میں ہے۔

سلسلۃ الملوک (۱۸۵۲ء):

یہ ایک مختصر فہرست ان راجاؤں اور بادشاہوں کی ہے جو دہلی میں پانچ سال سے ایک کے بعد ایک فرماں روا ہوتے چلے آئے۔ اس میں راجہ یودھشٹر سے لے کر ملکہ وکٹوریہ قیصرۂ ہند تک دو سو دو فرماں رواؤں کا نام، باپ کا نام، سنہ جلوس، دارالسلطنت اور زمانۂ عہد حکومت نہایت تحقیق سے لکھا ہے۔ دراصل یہ وہی فہرست ہے جو آثار الصنادید کے دوسرے ایڈیشن میں پہلے باپ کے ساتھ اضافہ کی گئی ہے، اس کو سیر الملوک کے نام سے تھوڑی سی اصلاح کے بعد چھاپا گیا ہے۔

آغاز کیمیائے سعادت (۱۸۵۳ء):

یہ امام غزالیؒ کی مشہور فارسی کتاب کیمیائے سعادت کا ترجمہ ہے۔ اس میں اخلاق و تصوف پر روشنی ڈالی گئی ہے۔ یہ ان کے دورِ اوّل کی آخری کتاب ہے۔ حالاں کہ دور اوّل کی تحریروں اور ترجموں میں آثار الصنادید کو چھوڑ کر کوئی ایسا علمی کارنامہ نہیں ہے جو خاص طور سے قابلِ قدر اور سرسید کی اعلیٰ علمی قابلیت کا مظہر ہو۔ اس ابتدائی دور کی کتابوں کے متعلق ایک مضمون نگار کی رائے ہے کہ:

> ''ان میں کوئی اختراعی مادہ اور فکری ارتقا نمایاں نہ ہوا جو تنقیدی یا تحقیقی کہا جا سکے، یا جن میں مسلمہ عقائد سے کسی طرح کا انحراف پایا جاتا ہو۔ اس قسم کی تحریریں ان دنوں میں ایک تیسرے درجہ کا مولوی بھی لکھ سکتا تھا۔ جن

موضوعات پر قلم اُٹھائے اور جس انداز سے ان پر بحث کی گئی ہے ان سے یہ ظاہر نہیں ہوتا کہ یہ تہذیب الاخلاق والے سید احمد خاں کے آزادانہ اور دل میں اتر جانے والے خیالات ہیں۔"[۱۶]

تاریخ ضلع بجنور (۱۸۵۵ء):

یہاں سے سرسید کا دوسرا وسطی دور شروع ہوتا ہے۔ اس دور میں تاریخی تصانیف کا آغاز ہوا۔ ان کا یہ دور تقریباً دس سال کی مدت کا ہے لیکن اتنے مختصر سے وقت میں بھی سرسید کے تاریخی مطالعہ، ہندوستان کی فارسی تاریخوں سے ان کی دلچسپی اور شوق کا اظہار بخوبی ہو جاتا ہے۔

تاریخ ضلع بجنور کو سرسید نے بجنور میں اس وقت لکھا جب وہ یہاں پر صدر امینی کے عہدے پر فائز تھے۔ یہ کتاب کافی تحقیق و تدقیق کے بعد لکھی گئی، لیکن یہ بھی آگرہ دفتر میں ۱۸۵۷ء کے غدر کی وجہ سے ضائع ہوگئی۔ اس کا صرف ایک حصہ سبحان اللہ اورینٹل لائبریری علی گڑھ میں موجود ہے۔ اس کو سرسید نے بڑی محنت سے لکھا تھا۔ وہ خود بیان کرتے ہیں کہ:

"گو اس تاریخ میں ضلع کے حالات کے سوا کوئی عام دلچسپی کی بات نہ تھی۔ مگر اثنائے تحقیقات میں بعض قانون گویوں کے پاس اکبر اور عالم گیر کے زمانہ کے ایسے کاغذات ملے جن سے نہایت عمدہ نتیجے نکلتے تھے۔"[۱۷]

آئین اکبری (تصحیح و ترتیب):

یہ کتاب سرسید کے علمی کارناموں میں بڑی اہمیت کی حامل ہے کیوں کہ یہ قدیم قلمی کتابوں کو جدید طریقہ پر مختلف نسخوں سے مقابلہ کر کے تصحیح کرنے اور ان کو حواشی اور مقدمہ کے ساتھ مدوّن کرنے کی ہندوستان میں پہلی کوشش ہے۔ اس کتاب کے قلمی نسخے عموماً غلط اور اکثر مسخ صورت میں پائے جاتے تھے۔ سرسید نے اس کتاب کے متعدد نسخے فراہم کیے اور نہایت کاوش اور تحقیق سے ان کا مقابلہ کر کے ان کی

غلطیوں کو درست کیا اور ان کے اختلافات دور کیے اور اس طرح مقابلہ اور تصحیح سے انھوں نے ایک صحیح متن مرتب کیا۔ کتاب میں عربی، فارسی، ترکی، سنسکرت اور ہندی کے جو الفاظ اور مصطلحات تھے ان کی تشریح کی، اصل کتاب میں اس وقت کے مروجہ اوزان اور نقود کا ذکر آیا ہے۔ ان کے اپنے زمانے کے مروجہ نقود اور اوزان سے مطابقت کی۔ جن جن سکوں کا کتاب میں ذکر آیا ہے ان کے دونوں رُخ کی تصویر اپنے مصحح نسخہ میں درج کی اور ان پر بعض مفید حواشی لکھے۔ اصل متن میں جو خانے خالی چھوڑ دیے گئے تھے ان کو دوسری کتابوں سے تحقیق کر کے پُر کیا۔ اصل کتاب کی تصویروں پر بھی اضافہ کیا اور بے شمار تصویریں بہترین مصوروں سے تیار کرا کے اس میں شامل کیں۔ آلات ظروف اوزار اور زیوروں کی تصویروں کے علاوہ درختوں، پھلوں اور پھولوں کی تصویریں، جیل خانہ، ہاتھیوں کی کشتی، طبل خانہ وغیرہ شکوہ سلطنت کی تصاویر سے اپنے متن کو مزین کیا۔

اس کی پہلی اور تیسری جلدیں ۱۲۷۲ھ میں چھپوائیں۔ دوسری جلد جس کے ساتھ ایک طویل مقدمہ میں آئین اکبری پر مفصل تبصرہ کیا گیا تھا، وہ طباعت کے لیے دہلی بھیجی مگر چھپنے سے پہلے غدر ہو گیا اور اس کے تمام مطبوعہ، فرمے اور مسودے مع مقدمے کے تلف ہو گئے۔

تاریخ سرکشی بجنور (۱۸۵۸ء):

جب سرسید الہ آباد میں صدر الصدور کی حیثیت سے فائز ہوئے تو اس وقت انھوں نے ''تاریخ سرکشی بجنور'' لکھی۔ اس میں مئی ۱۸۵۷ء سے لے کر اپریل ۱۸۵۸ء تک کے حالات و واقعات (جو غدر کے زمانے میں ضلع بجنور میں باغیوں نے ظلم و ستم کیے تھے) نہایت تفصیل سے قلم بند کیے ہیں۔

اسباب بغاوت ہند (۱۸۵۹ء):

یہ کتاب سرسید نے انگریزی حکومت کو ان کی کوتاہی و لاپرواہی پر نظر ثانی کرنے کے لیے لکھی، کیوں کہ اس میں ان اسباب پر روشنی ڈالی گئی ہے کہ جن کی وجہ سے یہ ۱۸۵۷ء کا ہنگامہ ہوا تھا۔ لیکن انگریز

حکومت نے سارا الزام مسلمانوں کے سر ڈال دیا کہ مسلمان ہی سب سے بڑے باغی تھے۔ لہٰذا سرسید نے ان حالات میں اس کو لکھنے کی جرأت کی جب کسی کو بھی اپنے خیالات ظاہر کرنے کی آزادی نہیں تھی۔ مارشل لا کا دور دورہ تھا اور حاکموں کی زبان ہی قانون تھی اور سرسید تو اپنی وفاداری کے سبب گورنمنٹ کے وفاداروں میں شمار ہوتے تھے، لیکن اس وفاداری اور خیر خواہی کے بعد ایسی کتاب لکھنا کہ جس میں گورنمنٹ کو ہی غدر کا اصل محرک قرار دیا ہو، یہ کام اور بھی مشکل و دشوار تھا، لیکن سرسید نے اپنی جان کی پرواہ نہ کرتے ہوئے اس کو لکھنے کا پکا ارادہ کر لیا تھا۔ جب کہ ان کے عزیز دوستوں نے اس کو چھپنے یا گورنمنٹ میں پیش نہ کرنے کے مشورے دیے۔ ماسٹر رام چند کے چھوٹے بھائی رائے شنکر داس جو اس وقت مراد آباد میں منصف اور سرسید کے دوست تھے اس بارے میں انھوں نے کہا کہ:

''ان تمام کتابوں کو جلا دو اور ہرگز اپنی جان کو معرضِ خطر میں نہ ڈالو۔''[۱۸]

لیکن سرسید نے کہا کہ:

''میں ان باتوں کو گورنمنٹ پر ظاہر کرنا ملک اور قوم اور خود گورنمنٹ کی خیر خواہی سمجھتا ہوں۔ پس اگر ایک ایسے کام پر جو سلطنت اور رعایا دونوں کے لیے مفید ہو مجھ کو کچھ گزند پہنچ جائے تو گوارہ ہے۔''[۱۹]

چنانچہ جب رائے شنکر داس نے دیکھا کہ سرسید اب پیچھے ہٹنے والے نہیں ہیں تو وہ آبدیدہ ہو کر خاموش ہو گئے۔

سرسید نے پہلے دو رکعت نفل ادا کی اور پھر پانچ سو جلدوں کا کچھ کم ایک پارسل ولایت روانہ کر دیا اور ایک جلد گورنمنٹ انڈیا میں بھیجی اور کچھ جلدیں اپنے پاس رکھ لیں۔

جب انڈیا گورنمنٹ نے اس کتاب کو دیکھا اور پڑھا تو لارڈ کیننگ گورنمنٹ جنرل اور سر بارٹر فریر نے جو کونسل میں ممبر تھے اس کو خیر خواہی پر محمول کیا مگر مسٹر سسل بیڈن نے جو اس وقت فورن

سکریٹری تھے، اس کے خلاف بہت بڑی اسپیچ دی اور یہ رائے ظاہر کی کہ:

''اس شخص نے نہایت باغیانہ مضمون لکھا ہے۔ اس سے حسب ضابطہ باز پرس ہونی چاہیے اور جواب لینا چاہیے اور اگر کوئی معقول جواب نہ دے سکے تو سخت سزا دینی چاہیے۔''[۲۰]

لیکن ان کے ساتھ کوئی اور ممبر شامل نہ تھا اس لیے ان کی اسپیچ کا کچھ اثر نہ ہوا اور جب فرخ آباد میں سرسید سے ان کی ملاقات ہوئی تو انھوں نے کہا کہ:

''اگر تم گورنمنٹ کی خیر خواہی کے لیے یہ مضمون لکھتے تو ہرگز اس کو چھپوا کر ملک میں شائع نہ کرتے۔ بلکہ صرف گورنمنٹ پر اپنے یا رعایا کے خیالات ظاہر کرتے۔''[۲۱]

سرسید نے کہا کہ:

''میں نے اس کتاب کی کل پانسو جلدیں چھپوائی تھیں جن میں سے چند جلدیں میرے پاس موجود ہیں اور ایک گورنمنٹ میں بھیجی ہے اور کچھ کم پانسو جلدیں ولایت روانہ کی ہیں جن کی رسید میرے پاس موجود ہے۔ میں جانتا تھا کہ آج کل بہ سبب غیظ و غضب کے حاکموں کی رائے صائب نہیں رہی اور اسی لیے وہ سیدھی باتوں کو بھی الٹی سمجھتے ہیں اس لیے جس طرح سے میں نے اس کو ہندوستان میں شائع نہیں کیا اسی طرح انگریزوں کو بھی نہیں دکھایا۔ صرف ایک کتاب گورنمنٹ میں بھیجی ہے، اگر اس کے سوا ایک جلد بھی کہیں ہندوستان میں مل جائے تو میں فی جلد ایک ہزار روپیہ دوں گا۔''[۲۲]

چنانچہ مسٹر بیڈن نے اس بات کی تصدیق کی اور جب سرسید اپنی بات پر کھرے اُترے تو انھیں اطمینان آ گیا اور پھر وہ سرسید کے حامی و مددگار ہو گئے۔ اس رسالے کا گورنمنٹ پر کافی اثر ا ہوا اور اس نے اپنی

کوتاہی کا مطالعہ کرتے ہوئے نہایت ٹھنڈے دل سے شکایتوں کو سنا، ان پر غور کیا اور جو شکایتیں واعتراض صحیح معلوم ہوئے ان کا فوراً تدارک کیا۔

اسباب بغاوت ہند کا حکومت برطانیہ پر بہت جلد اثر ہوا، کیوں کہ ملکہ معظّمہ نے معافی نامہ کے طور پر ایک اشتہار جاری کرادیا۔

اس اشتہار کو دیکھ کر سرسید بہت خوش ہوئے اور انھوں نے الٰہ آباد کے تمام مسلمانوں کو اس کا شکریہ ادا کرنے پر آمادہ کیا۔ لہٰذا ۲۸ر جولائی ۱۸۵۹ء کو تقریباً پندرہ ہزار مسلمان ''درگاہ بلاقی شاہ صاحب'' پر جمع ہوئے۔ یہاں پر پہلے غریبوں اور مسکینوں کو کھانا کھلایا، پھر سرسید نے نماز کے بعد نہایت سادہ وسلیس زبان میں ایک مناجات پڑھی۔ اس مناجات سے سرسید کے دل میں قوم کا درد بخوبی عیاں ہوجاتا ہے۔ اس مناجات میں انھوں نے کہا کہ:

> ''اے خدا تو ہمارا حقیقی پروردگار ہے۔ اے خدا اصلی بادشاہت اور حقیقی سلطنت تجھی کو سزاوار ہے۔ اے خدا مالک والملک تو ہی ہے جس کو تو چاہتا ہے عزت دیتا ہے جس کو تو چاہتا ہے ذلت دیتا ہے۔ اے خدا سارا عالم اور تمام مخلوقات کی جانیں اور سب آدمیوں کے دل تیرے ہاتھ میں ہیں۔ جس طرف تو چاہتا ہے ان کو پھیرتا ہے اور جو چاہتا ہے سو کرتا ہے۔ تیرا کوئی کام حکمت اور رحمت سے خالی نہیں۔ تیرے کام میں کسی کو چوں وچرا کی قدرت نہیں۔ اے خدا ہم تیرے عاجز بندے، سراسر تیرے گنہ گار ہیں۔ اے خدا ہماری شامت اعمال نے ہم کو گناہ کے دریا میں سر تک ڈبو دیا ہے۔ اے خدا ہم تیرے ہر وقت تقصیروار ہیں، جب تک تیری مدد نہ ہو ایک دم گناہ سے پاک نہیں رہ سکتے۔ اے خدا تیرے سوا کوئی ہمارے گناہ بخشنے والا نہیں۔ اے خدا

تیرے سوا ہم گناہ کے دریا میں ڈوبے ہوؤں کا کوئی ترانے والا نہیں، ہم نہایت عاجزی اور کمال انکسار سے اپنے گناہوں کی معافی محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے وسیلہ سے تجھ سے چاہتے ہیں۔ اے خدا تیرے غضب سے تیری رحمت سبقت لے گئی ہے، اپنی رحمت کاملہ سے ہمارے گناہ معاف کر۔ اے خدا جس طرح تیری حکمت سے میلا کپڑا میل سے پاک ہوتا ہے، اسی طرح ہم کو ہمارے گناہوں کی ناپاکی سے پاک کر۔ اے خدا اپنی بے انتہا رحمت سے ہمارے دل کو تمام برائیوں اور تمام ناپاک چیزوں سے جو دل کو ناپاک کرتی ہیں صاف کر۔ اے خدا ہمارے دل کے گناہوں کو مٹا اور ہماری روح کو روح القدوس کی تائید سے قوی کر، تیرے سوا ہمارا حقیقی ماویٰ اور اصلی ملجا اور کوئی نہیں۔ آمین!

الٰہی ہمارے گناہ حد سے زیادہ ہو گئے تھے، الٰہی ہماری شامت اعمال کی کچھ انتہا نہیں رہی تھی، اگرچہ ہم یقین کرتے ہیں کہ ہر ایک کے اعمال کی سزا اور جزا کا ایک دن بے شک آنے والا ہے، جس کا تو نے اپنے سچے نبیوں کی کتابوں میں وعدہ کیا ہے اور اس دن تیری رحمت اور تیرے فضل کے سوا کسی کا چھٹکارا نہیں۔ کیوں کہ تیرے آگے سب گنہ گار ہیں، مگر ان پچھلے دو برسوں میں جو تیری نگاہِ قہر آلود تیرے عاجز بندوں کی طرف ہوئی وہ بے شک ہماری شامت اعمال کا ظاہری نتیجہ تھا۔ الٰہی ہم اپنے گناہوں سے توبہ کرتے ہیں۔ الٰہی ہم اپنے گناہوں کی تجھ سے معافی چاہتے ہیں۔ الٰہی تو ہمارے گناہ سب معاف کر۔ آمین!

الٰہی یہ پچھلا زمانہ تیری مخلوقات پر ایسا گزرا کہ انسان اور حیوان تمام چرند و پرند بلکہ شجر و حجر کسی کو چین اور آرام نہ تھا۔ کوئی شخص اپنی جان و مال و آبرو پر مطمئن نہ تھا۔ ان پچھلے فسادوں نے زمین و آسمان کو گویا اُلٹ پلٹ کر دیا تھا۔ الٰہی تو نے اپنے فضل و کرم سے ان تمام فسادوں اور آفتوں کو دور کیا۔ الٰہی پھر تو نے اپنے عاجز بندوں پر رحم کیا اور جو امن و آسائش ان بد بخت برسوں سے پہلے تو نے اپنے بندوں کو دی تھی پھر وہی امن و آسائش تو نے اپنے بندوں کو نصیب کی۔ الٰہی تیرے اس رحم کا ہم دل سے شکریہ ادا کرتے ہیں۔ الٰہی تو ہمارے اس شکرانہ کو جو تیری درگاہ کے لائق نہیں ہے اپنے فضل و کرم سے قبول کر۔ آمین!

الٰہی تیرا ایک بہت بڑا احسان اپنے بندوں پر یہ ہے کہ اپنے بندوں کو عادل اور منصف حاکموں کے سپرد کر۔ سو برس تک تو نے اپنے ان بندوں کو جن کو تو نے خطۂ ہندوستان میں جگہ دی ہے اسی طرح عادل اور منصف حاکموں کے ہاتھ میں ڈالا۔ پچھلے کم بخت برسوں میں جو بہ سبب نہ ہونے ان حاکموں کے ہماری شامتِ اعمال ہمارے پیش آئی، اب تو نے اس کا عوض کیا اور پھر وہی عادل اور منصف حاکم ہم پر مسلط کیے۔ تیرے اس احسان کا ہم دل سے شکر ادا کرتے ہیں۔ تو اپنے فضل و کرم سے اس کو قبول کر۔ آمین!

الٰہی جو بھلائی کہ تیرے بندے کو کسی تیرے بندے سے پہنچتی ہے وہ درحقیقت تیری ہی طرف سے ہے اور اس تیرے بندے کا شکر ادا کرنا درحقیقت تیرا ہی شکر ادا کرنا ہے۔ سب کے دلوں کا حال تجھ پر روشن ہے

کیوں کہ تو دانائے نہاں و آشکارا ہے۔ اہلِ ہند جو اس اتفاقیہ آفت میں گرفتار ہو گئے تھے ان پر رحم کرنا تو نے ہی ہمارے حکام کے دل میں ڈالا۔ تیرے ہی القا سے کوئین وکٹوریہ دام سلطنت ہا نے پُر رحم اشتہار معافی جاری کیا۔ ہم دل سے شکر ادا کرتے ہیں اور اپنی جان سے ملکہ کو دعا دیتے ہیں۔ الٰہی تو ہماری اس دعا کو قبول کر۔ آمین! الٰہی ہماری ملکہ وکٹوریہ ہو اور جہان ہو، تمام اہلِ ہند ناظم، کشور ہند وائسرائے لارڈ کیننگ دام اقبالہٗ کا یہ رحم اور احسان کبھی دل سے نہ بھولیں گے۔ جس نے تمام حالات فساد پر غور کر کے اس پُر رحم اشتہار کے جاری ہونے کی صلاح دی۔ اس کی مستحکم رائے کسی طرح اس معاملے میں نہیں ڈگمگائی جس سے تمام رعایا نے امن پایا۔ تمام اہلِ ہند اس کے اس احسان کے بندے اور دل و جان سے اس کو دعا دیتے ہیں۔ الٰہی تو ہماری دعا قبول کر۔ آمین! الٰہی دنیا ہو اور ہمارا وائسرائے لارڈ کیننگ ہو۔

الٰہی اہلِ ہند رحم کے اس سے بہت زیادہ خواہش مند ہیں، جتنا ایک پیاسا نہایت گرمی کی شدت اور آفتاب کی تیزی اور دھوپ کی تپش اور ریتے کے چنگل میں پانی کی آرزو رکھتا ہے۔ جس حاکم کو دیکھتے ہیں کہ اس کی رحم کی نظر ہے، اس کو دل سے پیار کرتے ہیں اور اس کا دل سے شکر ادا کرتے ہیں۔ تمام اہلِ ہند چاہتے ہیں کہ اصل حالات فساد پر غور کر کے نہایت رحم کی نگاہ سے اہلِ ہند کو مسٹر ریڈ ممبر صدر بورڈ نے دیکھا ہے، اس لیے ان کا شکریہ ادا کرتے ہیں اور دل سے ان کو دعا دیتے ہیں۔ الٰہی تو ہماری اس دعا کو قبول کر۔ ہمارا مسٹر ریڈ ہمیشہ سلامت رہے۔

اب ہماری یہ دعا ہے کہ اللہ تعالیٰ ہمیشہ اپنے فضل و کرم سے امن و امان اور چین جان اور تمام رعایائے ہند کو اطاعتِ گورنمنٹ سے سرخروئی دے، اور ہمارے حکام اپنی رعایا اور خدا کے بندوں پر مہربان رہیں۔ آمین! صلی اللہ تعالیٰ علیٰ خیر خلقہِ محمد و آلہِ و اصحابہِ اجمعین و آخر دعوانا انِ الحمد للہ رب العالمین۔''[۲۳]

لغت زبان اردو:

سرسید نے ''اردو لٹریچر کی تاریخ'' اور ''اردو ڈکشنری'' لکھنے کی طرف بھی توجہ مبذول کی۔ وہ اردو لٹریچر کی تاریخ تو نہیں لکھ پائے البتہ اردو ڈکشنری لکھی۔ اس ڈکشنری کا نمونہ سوسائٹی کے اخبار میں شائع ہوا تھا اور اس پر گارساں دتاسی اور ایس۔ ہاول نے ریمارکس بھی دیے۔ چنانچہ گارساں دتاسی اپنے خطبات میں اس کا ذکر کرتے ہوئے لکھتے ہیں کہ:

''سرسید احمد خاں کی اردو لغت کے چار صفحات نمونتاً بھیجے گئے ہیں۔ موصوف نے ایس۔ ہاول اور میری رائے کے مطابق اس لغت کا نام (پرانا یوروپین نام ترک کر کے) ''لغت زبان اردو'' رکھا ہے۔ مسٹر ہاول نے میری رائے بھی سید صاحب موصوف کو پہنچا دی ہے۔ اس لغت میں وہی ٹائپ استعمال کیا گیا ہے جو سید صاحب کے مطبع میں ہے اور جس میں موصوف نے انجیل مقدس کی تفسیر شائع کی ہے۔ اس ٹائپ کا بڑا عیب یہ ہے کہ اس کے حروف بہت چھوٹے ہیں۔

مسٹر ولیم ہنڈفورڈ نے افسوس ظاہر کیا ہے اور میں بھی ان کے ساتھ متفق ہوں کہ اس لغت میں الفاظ کی اصل نہیں بتائی گئی، اگرچہ اس سے انکار نہیں کہ

الفاظ کے معنی اور مطلب صاف زبان میں بیان کیے گئے ہیں اور ہر لفظ کے بعد اس کے مشتقات لکھے گئے ہیں۔''

سرسید کی اس لغت پر کچھ اعتراضات بھی ہوئے جن کا دتاسی نے بخوبی جواب دیا۔ دتاسی لکھتے ہیں کہ:

''علی گڑھ کے اخبار مورخہ ۵ر فروری ۱۸۶۹ء میں اس لغت پر جو تنقید ہوئی ہے، میں اس سے متفق نہیں۔ مثلاً یہ اعتراض معقولیت پر مبنی نہیں کہ چوں کہ اردو زبان سنسکرت، عربی اور فارسی سے بنی ہے۔ اس لیے دیسی لوگوں کے لیے ان زبانوں کی علیٰحدہ علیٰحدہ لغتیں تیار کرنی چاہئیں۔ رہے خالص ہندوستانی الفاظ ان کے لیے لغت کی کیا ضرورت ہے۔ اس لیے کہ ہر کس و ناکس انھیں سمجھتا ہے اور روزمرہ میں استعمال کرتا ہے۔ یہ بات ایسی ہوئی کہ کوئی یہ کہے کہ بھلا فرانسیسی زبان کی لغت کی کیا ضرورت ہے۔ لاطینی کی لغت کافی ہے۔ اس لیے کہ فرانسیسی زبان اسی سے نکلی ہے، الفاظ کے لیے جو عام طور پر استعمال کیے جاتے ہیں اور جن کے معنی ہر شخص جانتا ہے علیٰحدہ لغت کی کیا ضرورت ہے۔ اسی طرح انگریزی لغت کی بھی ضرورت نہیں اس لیے کہ سلیس زبان اور فرانسیسی کی لغت سے کام نکل سکتا ہے۔ بڑے افسوس کی بات ہے کہ ایسے مفید کام پر اس طرح غیر ذمہ داری کے ساتھ تنقید کی جائے، لوگوں کی عادت ہے کہ وہ دوسروں کی آنکھ کے تنکے کو دیکھ لیتے ہیں، لیکن اپنی آنکھ کا شہتیر نہیں نظر آتا۔ بوالو نے ٹھیک کہا ہے: تنقید آسان ہے لیکن صناعی (آرٹ) مشکل ہے۔

سید صاحب جیسے جلیل القدر مسلمان کے حوصلے کو پست کرنے کی کوشش کرنا جو تعلیم و تمدن کے سچے دل سے حامی اور قدر دان ہیں، کہاں کی انسانیت ہے۔ موصوف کے نکتہ چین جو خود علم و فضل میں زیادہ ممتاز درجہ نہیں رکھتے۔ انھیں سبق دینے چلے ہیں۔ سچے محققوں کا یہ شیوہ ہے کہ وہ ایسی تصنیف کے عیوب سے چشم پوشی کرتے ہیں جو مجموعی طور پر اطمینان بخش ہو اور جس سے لوگوں کو فائدہ پہنچنے کی توقع ہو۔''[۲۴]

دی لائل محمڈنس آف انڈیا (۱۸۶۰ء):

سرسید نے یہ اخبار ہندوستان کے وفادار مسلمان کے نام سے جاری کیا۔ اس میں انھوں نے ان خاندانوں اور شخصیتوں کا ذکر کیا ہے جو غدر کے زمانے میں وفادار رہے۔

اس کے علاوہ انھوں نے ڈاکٹر ہنٹر کی کتاب ''آور انڈین مسلمانز'' میں جو مسلمانوں پر بے وفائی اور غداری کے الزامات لگائے گئے تھے اور فرقہ اہلِ حدیث کو ''وہابی تحریک'' کے نام سے موسوم کیا تھا، سرسید نے اس کی تنقید کرتے ہوئے ایک رسالہ ''اے ریویو آن ڈاکٹر ہنٹرس انڈین مسلمانس'' کے نام سے لکھا اور انگریزی میں بھی اس کا ترجمہ ہوا۔

تبیین الکلام:

غدر سے پہلے عیسائیوں نے عیسائی مذہب پھیلانے اور اس کو ہندوستان میں عام کرنے کی نئی نئی ترکیبیں اور تجویزیں شروع کر دی تھیں اور جگہ جگہ ان عیسائی مبلغین کے جا بہ جا مسلمانوں سے مباحثے اور مناظرے ہونے لگے تھے۔ اس وقت سرسید بھی پوری طرح سے ان کے اعتراضات کا جواب دینے کے لیے تیار ہو گئے اور اس سلسلے میں انھوں نے عیسائی مذہب کے سلسلے میں تین کتابیں لکھیں۔

لہٰذا غدر سے پہلے انھوں نے بجنور میں یادداشت کے طور پر کچھ لکھا تھا اور اپنے بھتیجے ''سید محمد احمد خاں'' کو جو اس وقت صغیر السن تھے۔ جو کچھ لکھتے تھے بہ طور سبق پڑھاتے تھے، لیکن غدر میں یہ سب یادداشتیں ضائع ہو گئیں۔ غدر کے بعد جب اطمینان ہوا تو یہ خیال ایک دوسری صورت میں ظاہر ہوا۔ چنانچہ پہلے انھوں نے عیسائی مذہب اور انجیل کی حقیقت اور اس کی تاریخ پر جو کچھ انجیل کے موافق اور مخالف لکھا گیا اس سے واقفیت حاصل کرنے کا ارادہ کیا لیکن اس کے لیے کافی روپیہ کی ضرورت تھی۔ سرسید اسی فکر میں تھے کہ انھیں غدر کے زمانے کی روکی ہوئی تنخواہ اور مال واسباب سے بھاری رقم ہاتھ لگ گئی۔ اب سرسید نے اس رقم سے عیسائی مذہب کی تمام ضروری کتابیں خرید لیں اور ان کے ترجموں کے لیے انھوں نے ایک انگریزی داں نوکر اور ایک عربی داں عالم رکھا اور اس طرح انھوں نے بائبل کی تفسیر لکھنے کا تہیا کیا جو تبیین الکلام کے نام سے دو ضخیم جلدوں میں شائع ہوئی۔

سرسید نے اس تفسیر کو چھاپنے کے لیے کئی ہزار روپے کا پریس رُڑکی سے منگوایا اور اردو ٹائپ کے علاوہ عبرانی اور انگریزی ٹائپ کے حروف منگوائے۔ ابھی کام شروع بھی نہ ہونے پایا تھا کہ ان کا تبادلہ غازی پور ہو گیا، اس لیے وہ تمام سامان بھی غازی پور لے گئے۔ غازی پور میں انھوں نے سالم نامی یہودی کو نوکر رکھا اور اس سے عبرانی پڑھنی شروع کی۔ جو کچھ سرسید لکھتے تھے اس کا ترجمہ انگریزی میں ایک یوروپین کرتا تھا جس کو سو روپیہ ماہوار تنخواہ دیتے تھے۔ یہ ترجمہ بھی اردو میں چھپتا تھا۔ ایک کالم میں عبرانی توریت کی عبارت عربی خط میں اس کا ترجمہ اور انگریزی ترجمہ اس کے نیچے لکھا جاتا تھا۔ دوسرے کالم میں اسی مضمون کی کوئی آیت قرآنی یا حدیث اور اس کا ترجمہ اردو اور انگریزی اس کے نیچے لکھا جاتا تھا اس کے بعد تفسیر لکھی جاتی تھی۔

اس کتاب کے آغاز میں سرسید نے دس مقدمے لکھے ہیں جن میں اکثر بہت طول وطویل ہیں اور بڑے غور وفکر اور تلاش ومحنت سے لکھے ہیں۔

تاریخ فیروز شاہی (ترتیب وتدوین):

اس کتاب کو سرسید نے مرادآباد کے زمانۂ قیام میں لکھا۔ تاریخ فیروز شاہی ضیاءالدین برنی کی مشہور تاریخ ہے۔ کلکتہ کی ایشیاٹک سوسائٹی اس کتاب کو شائع کرنا چاہتی تھی۔ چنانچہ سوسائٹی نے سرسید سے اس تاریخ کا ایک صحیح نسخہ نقل کے لیے طلب کیا۔ انھوں نے بہت جستجو سے اس کا ایک نسخہ خریدا اور سوسائٹی سے وعدہ کرلیا کہ وہ اپنا نسخہ صحیح کر کے بھیجیں گے۔ چنانچہ اس کی تصحیح کے لیے ایک نسخہ کتب خانۂ شاہ دہلی کا اور دوسرا نسخہ سر ہنری ایلیٹ نے تاریخ ہندوستان لکھتے وقت حاصل کیا تھا۔ تیسرا نسخہ مسٹر ایڈورڈ طامس کا اور چوتھا نسخہ بنارس سے بڑی تلاش سے بہم پہنچا۔ اس طرح ان چار نسخوں کا مقابلہ کر کے انھوں نے کتاب کی تصحیح کی اور یہ تاریخ ۱۸۶۲ء میں سوسائٹی نے شائع کی۔ سرسید نے اس پر ایک دیباچہ بھی لکھا جس میں سلاطین دہلی کی تاریخ پر اس سے پہلے اور خاص کر فیروز شاہ کے حالات میں جو کتابیں لکھی گئی ہیں ان کا ذکر کیا ہے۔ مئی ۱۸۶۲ء میں سرسید کا تبادلہ مرادآباد سے غازی پوری ہوگیا وہاں انھوں نے ۱۸۶۳ء میں سائنٹفک سوسائٹی قائم کی اور اس کی طرف سے ایک اخبار جاری کیا۔

سائنٹفک سوسائٹی اور علی گڑھ انسٹی ٹیوٹ گزٹ:

سرسید نے اپنی ملازمت کے دوران جو خدمات انجام دی تھیں، وہ تو تعریف کے قابل ہیں ہی، لیکن یہ سوسائٹی ان کی تمام خدمات میں ایک اہم خدمت کا درجہ رکھتی ہے۔ اس کو قائم کرنا سرسید کے نزدیک جدید تعلیم عام کرنے سے بھی زیادہ ضروری تھا۔ اس کی اہمیت اس خط سے ظاہر ہوتی ہے جو انھوں نے انگلستان سے محسن الملک کو لکھا تھا۔ جس سے معلوم ہوتا ہے کہ انھیں سوسائٹی کی کتنی فکر تھی۔ لکھتے ہیں:

> ''مجھ کو علاوہ مفارقت احباب کے یہ رنج پڑا ہے کہ میرے پیچھے لوگ عقل کے دشمن سائنٹفک سوسائٹی کو باقی نہ رکھیں گے۔ پس میں چاہتا ہوں کہ آپ

سوسائٹی کی طرف متوجہ ہوں اور سنبھالنے اور ممبروں کے بڑھانے میں زیادہ کوشش فرمائیں۔''[۲۵]

غرض یہ کہ سوسائٹی نے سرسید کے تمام مقاصد کو پورا کیا۔ مسلمانوں میں سائنس اور علمی رجحان پیدا کرنے کے لیے سرسید نے ۱۸۶۳ء میں غازی پور میں یہ سوسائٹی قائم کی تھی۔ ۱۸۶۴ء میں اس کا دفتر علی گڑھ منتقل ہوا تھا۔ اس نے جدید علوم کو عام کرنے میں بڑی مدد کی۔ کیوں کہ اس نے صرف تراجم کا کام ہی نہیں کیا، بلکہ مختلف موضوعات مثلاً تہذیب، مذہب، اخلاق، علمی تاریخ اور رسم و رواج وغیرہ پر لکچرز کا اہتمام بھی سائنٹفک سوسائٹی کے ذریعہ کیا گیا۔ یہ ایک ایسا ادارہ تھا کہ جس نے سرسید کی خواہش کے مطابق تینوں قوموں ہندو، مسلم اور عیسائی کو ایک ہی پلیٹ فارم پر لا کر کھڑا کر دیا تھا۔ جہاں تعصب اور نفرت کی کوئی گنجائش نہیں تھی بلکہ تینوں قومیں سرگرم ہو کر اپنی اپنی خدمات انجام دے رہی تھیں۔

سوسائٹی کے ممبران کی تعداد:

(۱) عیسائی ممبران ۴۴

(۲) ہندو ممبران ۸۳

(۳) مسلم ممبران ۱۱۰

اس طرح کل ممبران کی تعداد دو سو سینتیس (۲۳۷) تھی۔ اس تعداد کو دیکھ کر یہ معلوم ہوتا ہے کہ اس سوسائٹی نے سرسید کے اس قومی تصور کو ترقی دی جس پر کہ وہ شروع سے ہی زور دیتے تھے۔ سرسید کا قومی تصور یہ تھا کہ:

''یوروپین مختلف خیالات اور مختلف مذاہب کے ہیں مگر سب ایک قوم میں شمار ہوتے ہیں۔ گو ان میں دوسرے ملکوں کے بھی لوگ آ کر بس جاتے ہیں، مگر وہ آپس میں مل جل کر ایک ہی قوم کہلاتے ہیں۔ غرض کہ قدیم سے قوم کا

لفظ ملک کے باشندوں پر بولا جاتا ہے۔ گو ان میں بعض خصوصیتیں بھی ہوتی ہیں۔ اے ہندو اور مسلمانو! کیا تم ہندوستان کے سوا اور ملک کے رہنے والے ہو؟ کیا اس زمین پر تم دونوں نہیں بستے؟ کیا اسی زمین میں تم دفن نہیں ہوتے ہو یا اسی زمین کے گھاٹ پر جلائے نہیں جاتے۔ اسی پر مرتے ہو اسی پر جیتے ہو، تو یاد رکھو کہ ہندو، مسلمان اور عیسائی جو اسی ملک میں رہتے ہیں اس اعتبار سے سب ایک ہی قوم ہیں۔ جب یہ سب گروہ ایک ہی قوم کہے جاتے ہیں، تو ان سب کو ملکی فائدے میں جو ان سب کا ملک کہلاتا ہے ایک ہونا چاہیے۔''[۲۶]

اس طرح قوموں کے سنگم سے مغربی نظریات اور علمی و ادبی کاوشوں کے وسیلے سے ہندوستانیوں کو فائدہ پہنچانے کی کوشش کی گئی۔ سوسائٹی کا خاص مقصد بھی یہی تھا کہ ہندوستانیوں کو جدید سائنس وٹکنالوجی علوم سے واقفیت حاصل کرائی جائے۔ بقول سرسید:

''جب تک ہمارے ہم وطن اپنے علم کے موجودہ ذخیرے میں اور کچھ نہ بڑھا دیں گے...ان کو کسی طرح ترقی کرنے کی توقع نہیں ہوسکتی۔ پس آؤ ہم مستعد ہوں اور کوشش کریں اور قوموں کے مختلف فنون اور علوم کو لینے اور ان کو بہ خوبی حاصل کرنے سے اپنے علم کو بڑھاویں۔''[۲۷]

سرسید نے سوسائٹی کو تمام ہندوستانیوں کی فلاح و بہبود کے لیے ہی قائم کیا تھا۔ یہ سرسید کے ان مقاصد کی عملی صورت تھی جو دہلی کالج (۱۸۲۵ء) کے بعد سامنے آئی۔ جس کا منصوبہ انھوں نے مرادآباد میں یتیم بچوں کے لیے ایک یتیم خانہ کھولتے وقت بنایا تھا، لیکن جلد ہی انھوں نے اس ارادے سے فرار حاصل کر کے قوم کے لیے جدید تعلیم کا منصوبہ بنایا۔

سرسید کا خیال تھا کہ:

''سماج کی اصلاح اور ترقی کی کوئی تدبیر اس وقت تک بارآور نہیں ہوسکتی جب تک عوام کے خیالات میں تبدیلی کے لیے مسلسل اور پُرخلوص جدوجہد نہ کی جائے۔ وہ کہا کرتے تھے کہ صرف نئے خیالات کی روشنی سے ہی تنگ نظری، تعصب اور ذہنی جمود کا کہرا چھٹ سکتا ہے۔''[۲۸]

سرسید نے جب ہندوستانیوں کی حالت کا مطالعہ کیا تو ان کے سامنے دو باتیں آئیں:

(۱) مسلمانوں کی انگریزی زبان ادب سے حد درجہ نفرت۔

(۲) ہندوؤں کی نظر میں انگریزی کی اہمیت صرف نوکری حاصل کرنے کی لالچ میں، لیکن سرسید جدید علوم سے الگ ہی فائدہ حاصل کرنا چاہتے تھے۔ جس میں نہ نفرت ہو اور نہ ہی لالچ، اس لیے انھوں نے سوسائٹی قائم کی۔ اس کے مقاصد اور لائحۂ عمل کی وضاحت وہ ان الفاظ میں کرتے ہیں:

''اس سوسائٹی کے زیر اہتمام انگریزی میں موجود علمی اور تاریخی کتابیں اردو میں ترجمہ کرا کے شائع کی جائیں گی تاکہ مغربی علوم وفنون کی طرف اہلِ وطن مائل ہوں۔ علمی موضوعات پر لکچر دیے جائیں گے، ایک اخبار بھی جاری کیا جائے گا جو حکومت اور رعایا کے درمیان افہام وتفہیم کا ایک ذریعہ ہوگا۔ یہ اخبار اردو انگریزی دونوں زبانوں میں شائع ہوگا۔ اس اخبار کے لکھنے والوں میں انگریز، مسلمان اور ہندو تینوں قوموں کے افراد شامل ہوں گے۔ اس اخبار کے ذریعہ حکومت انگریزوں اور ہندوستانی عوام کے درمیان مغائرت، علیحدگی اور عدم اعتماد اور مذہبی تعصّبات کو آہستہ آہستہ ختم کرنے کی کوشش کی جائے گی۔''[۲۹]

بنارس تبادلے کے وقت سرسید سوسائٹی کا انتظام راجہ جے کشن داس کے حوالے کر گئے، علی گڑھ میں اس کی کافی ترقی ہوئی۔ یہاں پر باقاعدہ ایک عمارت تعمیر کی گئی۔ یہ سوسائٹی سرسید کے لیے کافی اہمیت رکھتی تھی اس لیے انھوں نے اپنا وہ ذاتی پریس بھی سوسائٹی کو دے دیا۔ اس سوسائٹی میں علوم وفنون کی کتابوں کے تقریباً چالیس تراجم وجود میں آئے۔ یہاں پر تاریخ کے علاوہ علم فلاحت، سوکس، علم آلات، طبیعات، ریاضیات اور جغرافیہ وغیرہ پر کتابیں اردو میں منتقل ہوئیں۔ اس سوسائٹی نے پہلی بار اردو زبان و ادب کو فائدہ پہنچا کر اس کو علمی خزانوں سے مالا مال کر دیا۔ کیوں کہ یہاں پر مغربی علوم کے علاوہ ایشیائی علوم کے بھی تراجم کو اہمیت دی گئی تھی۔

علی گڑھ انسٹی ٹیوٹ گزٹ (۱۸۶۶ء):

علی گڑھ انسٹی ٹیوٹ گزٹ کا اجرا سوسائٹی کی خدمات کا ایک اہم حصہ ہے۔ اس کے ذریعہ سوسائٹی کے اغراض ومقاصد کو اجاگر کر کے انھیں عوام اور حکومت تک پہنچایا گیا۔ اس کا ایک کالم انگریزی میں اور ایک کالم اردو میں ہوتا تھا۔ یہ پہلے ہفتہ وار نکلتا تھا لیکن بعد میں ہفتہ میں دو بار نکلنے لگا۔ اس کا ایڈیٹوریل شروع سے آخر تک سرسید ہی لکھتے رہے۔

اس اخبار میں جدید تعلیم کے موضوعات پر مضامین شائع ہوئے تھے ان مضامین کا اہتمام بھی اردو اور انگریزی دونوں زبانوں میں ہوتا تھا۔ اس میں سوشل، اخلاقی، علمی اور پولیٹکل ہر قسم کے مضامین شائع ہوئے۔ اس لیے اس سے انگریز اور ہندوستانی برابر مستفید ہوتے رہے۔ اس اخبار کے اجرا کے مقاصد یہ تھے:

۱۔ ہندوستانیوں کو انگریزی حکومت کے طور طریقوں، تہذیب وتمدن سے آشنا کرنا، ان میں پولیٹکل خیالات اور قابلیت پیدا کرنا۔

۲۔ انگریزی حکومت کو ہندوستانیوں کے مسائل سے روشناس کرانا، صحافت کی تاریخ میں یہ

ایک ایسی خدمت ہے کہ جس نے ایک ساتھ یہ دو مقاصد پورے کیے اور حکومت کی نظر میں بھی عزت حاصل کی، سوسائٹی کی تمام تحقیقات، مضامین اور لکچر اس میں ہی شائع ہوتے تھے۔ اس طرح اس نے شمالی ہندوستان میں عام خیالات کی تبدیلی اور معلومات کی ترقی کو شائع کر کے عوام کو جدید انقلابی ترقیوں سے آشنا کرانے میں مدد کی۔ انگریزی حکومت کو ہندوستانیوں کی وفاداری کا یقین دلایا۔ یہی وجہ ہے کہ انگریزوں نے بھی اس اخبار کی تعریف کی ہے۔

کتاب ''پلیر ز آف دی انڈین المباتر'' کا مصنف اس طرح تعریف کرتا ہے کہ:

''علی گڑھ گزٹ جس کے ایڈیٹر سید احمد خاں تھے اور اب بھی وہی معلوم ہوتے ہیں۔ شمالی ہندوستان میں سب سے عمدہ اخبار ہے۔''[۳۰]

اس کی مقبولیت کی ایک اہم وجہ یہ بھی تھی کہ اس نے کسی مذہب وقوم کی دلآزاری نہیں کی، بلکہ اس نے ہمیشہ تملّق، تعصب، زبان درازی، بے ادبی اور بے اعتدالیوں سے گریز کیا۔ اپنی انھیں خوبیوں کی وجہ سے اس نے انگریزی حکام کے زمانے میں باقاعدگی کے ساتھ بتیس (۳۲) سال تک ملک وقوم کی خدمات انجام دیں اور کافی بعد تک اس دشمنی کو ختم کرنے میں کامیاب رہا جو ۱۸۵۷ء کے واقعہ نے پیدا کر دی تھی۔

چنانچہ سائنٹفک سوسائٹی اور علی گڑھ انسٹی ٹیوٹ گزٹ نے ملکی اتحاد کو مضبوط کرنے میں قابلِ قدر خدمات انجام دیں۔

خطباتِ احمدیہ:

یہ سر ولیم میور کی سیرت رسول صلعم کے جواب میں لکھی گئی تھی۔ میور نے اسلام اور پیغمبر اسلام پر جو مفسدانہ اور عامیانہ اعتراض کیے تھے اور جس طرح لوگوں کو گمراہ کرنا چاہتا تھا اس سے سر سید کا دل

بے چین ہو گیا اور انھوں نے اسی کے جواب کے لیے انگلستان کا سفر کیا اور وہاں کی لائبریریوں کو چھان کر یہ جواب لکھا۔ نواب محسن الملک کو ایک خط میں لکھتے ہیں کہ:

''ان دنوں میں ذرا میرے دل کو سوزش ہے، ولیم میور صاحب نے جو کتاب آں حضرت کے حال میں لکھی ہے اس کو دیکھ رہا ہوں۔ اس نے دل کو جلا دیا اور ان کی ناانصافیاں اور تعصّبات دیکھ کر دل کباب ہو گیا اور مصمّم ارادہ کیا کہ آں حضرت صلعم کی سیر میں جیسا کہ پہلے سے ارادہ تھا کتاب لکھ دی جائے۔ اگر تمام روپیہ خرچ ہو جائے اور میں فقیر بھیک مانگنے کے لائق ہو جاؤں تو بلا سے..... میں نے فرانس اور جرمن سے اور مصر سے کتاب سیر منگانی شروع کر دیں۔''[۳۱]

۱۰ر مئی ۱۸۷۰ء کو سرسید نے لندن سے محسن الملک کو خط میں خطباتِ احمدیہ کے بارے میں لکھا کہ:

''میری کتاب خطباتِ احمدیہ ایک مسلمان عالم متحیر نے پڑھی جو قسطنطنیہ سے یہاں آیا ہے جو الفاظ کہ اس نے کہے اور مجھے لکھے، اور جس طرح میرے ہاتھ چومے اس کی لذت میں جانتا ہوں۔ اس کے چند مقام ایسے ہیں جن کو دیکھ کر مسلمانانِ ہند فتویٰ کر دیں گے۔''

ایک اور خط میں محسن الملک کو اس طرح لکھتے ہیں کہ:

''قصۂ عاد و ثمود کو میں نے اپنی کتاب میں نہایت مختصر کر دیا ہے۔ مخالفین ان قصوں سے انکار کرتے ہیں اور قصۂ باغِ ارم پر ہنستے ہیں، اور رسد سکندری کو جھوٹ کہتے ہیں۔ پس آپ لوگ بڑے مولوی کہلاتے ہیں اس کا ثبوت دے دیں۔ میں نے حضرات علمائے مسلمین کی تاریخیں الٹ ڈالیں جو میرے

بزرگوار ہیں، وہ اس کے ثبوت میں قرآن مجید کی آیتیں نقل کر دیتے ہیں اور اس کے ساتھ جھوٹ، طوفان کہانیاں ملا دیتے ہیں۔ میں نے لکھا ہے کہ باغِ ارم عمارات ذات عماد غلط محض ہے اور ''ارم ذاتِ العماد اللّتی کم یخلق مثلها فی البلاد۔ ''ایک محل یا جو کھنہ یا ہزار کھنہ سمجھنا غلط ہے، وہ صرف ایک قوم کا ذکر ہے جو اولاد ارم سے تھی اور چوں کہ دراز قد تھے جیسے کہ بعض قوم کے آدمی دراز قد ہوتے ہیں صرف ان کو تشبیہاً ''ذات العماد'' کہا گیا ہے۔ جیسے کہ ایک جگہ تشبیہاً فرمایا ہے: ''کانهم اعجاز نخل خاویه '' حال یہ ہے کہ میں خدا کا اور اس کے رسول ﷺ اور اس کے کلام کا دوست ہوں، مولویوں کا دوست نہیں۔ جو مثل یہودیوں اور عیسائیوں کے ان کو ارباباً من دون اللہ سمجھو، اور جو کچھ میں نے لکھا ہے اس کو تاریخ سے اور غیر مذہب کی کتابوں سے ثابت کیا ہے۔ بس اب میں ایک برس کی مہلت دیتا ہوں کہ ان قصوں کو جس طرح کہ ہمارے مولوی صاحبان فرماتے ہیں اور ممبروں پر بیٹھ کر وعظ میں لوگوں کو پھیلاتے ہیں یا جس طرح پر کہ ہمارے مورخین یا عالم اس کو لکھتے ہیں اس کا ثبوت دیویں یا وہ یہی بتادیں کہ باغِ ارم اور سدّ سکندر کس ملک میں اور کس جگہ تھی اور اب بھی ان ستونوں میں سے کوئی ستون مل سکتا ہے۔''[۳۲]

خطبات احمدیہ کے بارے میں مزید محسن الملک کو لکھتے ہیں:

''آں حضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی بارہ برس کی عمر تک کا حال لکھ چکا اور سر ولیم میور صاحب اور مصنفوں نے یہاں تک کہ حال پر جو کچھ لکھا ہے سب کے ایک ایک حرف کا جواب لکھا ہے، مگر ایسا جواب نہیں ہے جیسا کہ تمہارے

ہاں کاملان مشرکین فی صفۃ النبوۃ دیتے ہیں۔ نہایت محققانہ جواب ہیں اور یہ شرط ہے کہ کسی شخص کے آگے ڈال دو وہ کیسا ہی بے دین کیوں نہ ہو، اگر کہے کہ ہاں نہایت سچ اور انصاف کا جواب ہے تو میرا نام، ورنہ میرا نام نہیں۔ اپنی تحریر کو آپ ہی دیکھتا ہوں اور خوش ہوتا ہوں کہ بیان سے باہر ہے۔ دوسرا خطبہ جغرافیہ عرب کا قریب الاتمام ہے۔ نہایت عمدہ طور سے ثابت ہوا ہے کہ فاران وہی میدان اور پہاڑ ہیں جہاں کعبہ واقع ہے۔ معلوم نہیں کہ آپ فاران کے لفظ سے واقف ہیں یا نہیں کیوں کہ یہ بڑا رکن مباحثہ کا ہے۔'' [۳۳]

تہذیب الاخلاق (۲۴ر دسمبر ۱۸۷۰ء):

تہذیب الاخلاق سرسید کے ان ارادوں کی تشریح ہے جو کہ انھیں بنارس میں ہندوؤں کی اردو زبان سے نفرت و انگلستان میں یوروپی عوام کی ترقی اور اسٹیل اور ایڈیسن کے رسالے اسپیکٹر اور ٹٹلر کو دیکھ کر وجود میں آئے۔ لہٰذا سرسید نے تہذیب الاخلاق جاری کرنے کا ارادہ انگلستان میں ہی کرلیا تھا جس کی وضاحت محسن الملک کو لکھے گئے اس خط سے بہ خوبی ہو جاتی ہے:

''ایک اخبار خاص مسلمانوں کے فائدے کے لیے جاری کرنا تجویز کیا ہے اور تہذیب الاخلاق اس کا نام فارسی اور انگریزی میں محمڈن سوشل رفارمر رکھ لیا ہے۔ اس کا منظر نامہ بہت خوب صورت یہاں کھدوالیا ہے۔ کاغذ بھی ایک برس کے لائق یہاں خرید لیا ہے۔'' [۳۴]

غرض یہ کہ سرسید انگلستان سے واپس آکر ہمہ تن مسلمانوں کی فلاح و بہبود اور انھیں بیدار کرنے میں پُر جوش طریقے سے لگ گئے۔ کیوں کہ اس وقت مسلمان اپنے غرور و تعصب، غفلت و بے پروائی اور افلاس کی وجہ سے جدید علوم و فنون سے روگردانی کر رہے تھے۔

سرسید نے مسلمانوں میں جدید علوم وفنون کو جاری کرنے کے لیے 'تہذیب الاخلاق' کا سہارا لیا۔ اس میں مذہب، اخلاق، تہذیب وتمدن، طرزِ معاشرت وغیرہ پر ایسے مضامین لکھے گئے جن سے لوگوں میں بے چینی، حرکت اور ہلچل پیدا ہوئی۔ توہمات اور تعصّبات پر کاری ضرب لگی اور قوم کی زندگی کے ہر شعبۂ حیات پر تنقیدی نظر ڈالی گئی۔

تہذیب الاخلاق کی اہم خدمات:

(۱) مسلمانوں کے تہذیب وتمدن کی ترقی اور مذہبی نظریے کے مطابق اصلاح کرنا

(۲) عیسائیوں کے اس نظریے کی غلط فہمی کو دور کرنا کہ 'اسلام ترقی وتمدن' کا دشمن ہے

(۳) مسلمانوں کو یوروپ کے سویلزیشن کے اصول وفروع اور ترقی کے اسباب وذرائع سے خبردار کرنا

(۴) فرسودہ رسم ورواج کی اصلاح کرنا

(۵) تعلیم کے ساتھ ساتھ تربیت کی اصلاح کرنا

(۶) اخلاق وعادات کی خرابیوں پر نظر ثانی کرا کر ان کی اصلاح کرنا

(۷) قدیم علوم وفنون کی اصلاح کرنا

(۸) جدید علوم وفنون کی عزت، وقعت واہمیت، محبت اور رغبت مسلمانوں میں پیدا کرنا

(۹) اسلام کے مخالفوں کی تصنیفات کا جائزہ ومطالعہ کر کے اسلام کو الزامات سے آزاد کرانا

(۱۰) مسلمانوں کے دلوں میں ان کے اکابروں اور اسلاف کی عظمت کا خیال پیدا کرنا اور ان کی قدیم علمی، ادبی ترقیات پر روشنی ڈالنا

(۱۱) قوم کی ذہنی تربیت کرنا

(۱۲) مسلمانوں میں علمی، ادبی اور فکری روح پیدا کرنا

(۱۳) مغربی خیالات کو مشرقی زبان و بیان میں ڈھالنا

(۱۴) مذہبی نظریات میں عقلیت کو شامل کر کے نئے اصولِ تحقیق وضع کرنا

(۱۵) ماضی پر فخر کے ساتھ ساتھ حال کے مسائل کو سمجھنے اور سلجھانے کی فضا پیدا کر کے مستقبل کی ترقی کا احساس دلانا

(۱۶) اردو ادب کو نئی جلا بخش کر اسے قومی مفاد اور اجتماعی افکار کا وسیلہ اور زندگی کا ترجمان بنانا، جس سے اردو ادب کو نئی روشنی اور نیا ذہن حاصل ہو۔ اس طرح جدید اردو ادب کے ڈھانچے کو فروغ دینے میں تہذیب الاخلاق کا اہم کردار رہا ہے۔

بقول سر سید احمد خاں:

''تہذیب الاخلاق کا پرچہ ابتدا میں اسی واسطے جاری کیا گیا تھا کہ ہندوستانیوں کے دل جو مردہ ہو گئے ہیں ان میں کچھ تحریک لائی جاوے۔''[۳۵]

انھیں مقاصد کو مدنظر رکھ کر اس پرچے میں ادنیٰ سے اعلیٰ تک مضامین لکھے گئے۔ مثلاً عزت، تربیتِ اطفال، آزادیٔ رائے، عورتوں کے حقوق، غلامی، جدید علوم، کاہلی، تعصب، ریاکاری، خوشامد، طریقِ تناول طعام، تعلیم و تربیت، طریقۂ زندگی، اصلاحِ رسوم اور ترقی وغیرہ۔

لہٰذا تہذیب الاخلاق نے اپنے انھیں اعتراض و مقاصد کی وجہ سے کافی ترقی کی اور اس کی وجہ سے قوم میں ترقی کے نشانات ظہور پذیر ہونے لگے۔ یہی نہیں بلکہ یہ اپنے مخالفین اور موافقین دونوں کی توجہ کا مرکز بنا رہا۔ اس سے پہلے کسی بھی اخبار کی نہ تو اتنی مخالفت ہوئی اور نہ ہی موافقت ہوئی۔ چنانچہ اتنی مخالفت کے باوجود اس کی اہمیت میں کوئی کمی نہیں آئی۔ اس کی اہمیت کا اعتراف سر سید نے اس طرح کیا ہے:

''لوگ سوتے تھے ہم جھنجھوڑتے تھے۔ لوگ بہرے تھے ہم چلاتے تھے۔ وہ زمانہ گیا نہ وہ ہم رہے اور نہ وہ وہ رہے۔ لوگ جاتے ہیں اور قومی ہمدردی کا

راگ گاتے ہیں۔الاپتے ہیں،مگر ہاں بے سرے ہیں۔زمانے نے چال بدلی ہے اور نئی شطرنج بچھائی ہے پھر پرانی چالیں ناکام سی ہیں اور نہ چلی جاسکتی ہیں۔ بخار دھیما پڑ گیا ہے، پھر دوا بھی ایسی تیز نہیں چاہیے۔تکفیر کے فتوے ٹھنڈے پڑ گئے ہیں۔نفرت الفت سے بدل گئی ہے...اگر اب تہذیب الاخلاق کا کچھ کام باقی ہے تو صرف انانیت کو مٹانا اور الحق بلوانا، بند پانی بہہ نکلا ہے، مگر ٹیڑھی راہ چلا ہے اور پتلی پتلی دھاروں میں بہتا ہے۔ اب تہذیب الاخلاق کا کام اس کو راہ پر لانا اور سب دھاروں کو اکٹھا کر دریا بنانا ہے۔"[۳۶]

اس رسالہ میں سرسید کے ہم خیال رفقا بھی مضامین لکھتے تھے:

(۱) محسن الملک (۲) محمد احسان اللہ عباسی (۳) الطاف حسین حالی (۴) وقار الملک وغیرہ وغیرہ۔

اس طرح تہذیب الاخلاق نے اردو ادب میں پہلی بار مضمون نگاری کا آغاز کر کے اس کو فروغ دیا۔اس نے صرف مضمون نگاری کا آغاز ہی نہیں کیا بلکہ اس کے ذریعہ صحت مند صحافت نگاری کی بھی بنیاد ڈالی گئی۔ کیوں کہ اس کے قبل اخبار نویسی کا مطالعہ کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ ہر اخبار کا دائرہ محدود تھا۔مثلاً دہلی اردو اخبار قلعہ دہلی کی خبر رسانی اور مرزا غالب کی قمار بازی اور شراب نوشی تک محدود تھا اور سید الاخبار میں بھی چوں کہ قانونی مضامین شائع ہوتے تھے۔اس طرح یہ بھی وکیلوں کے حلقے تک محدود تھا،لیکن تہذیب الاخلاق نے اپنے دائرے کو وسیع سے وسیع تر کر کے صحافت کی دنیا میں ایک نئے باب کا آغاز کیا اور اخبار کی سماجی حیثیت کو بلند و مستحکم کر کے اپنے مطمحِ نظر سے متاثر کر کے دوسرے اخبارات کو وجود میں لانے کا اہم ذریعہ بنا۔مثلاً متاثر ہونے والے اخبار مندرجہ ذیل ہیں:

(۱) اخبار انسٹی ٹیوٹ، پٹنہ (۲) اخبار الاخبار، مظفر پور

(۳) مفید عام، آگرہ (۴) اخبار سوشل راجپوتانہ

(۵) اخبار انجمن، شاہ جہاں پور (۶) اردو گائیڈ، کلکتہ

(۷) پنجابی اخبار، لاہور (۸) پٹیالہ اخبار

تہذیب الاخلاق کا اثر صرف یہیں تک محدود نہ رہا بلکہ بیسویں صدی میں بھی کئی قابلِ قدر اخبار وجود میں آئے:

(۱) الہلال (۲) ہمدرد (۳) مخزن

(۴) زمین دار (۵) اودھ پنچ (۶) اودھ اخبار

(۷) پیسہ (۸) وطن لاہور (۹) وکیل امرتسر

(۱۰) ہمدرد لکھنؤ (۱۱) آزاد کانپور (۱۲) اتحاد پٹنہ

(۱۳) سوراجیہ الہ آباد وغیرہ۔

اس طرح ان اخبارات نے سرسید کے خیالات کو پورے ہندوستان میں عام کیا۔ بقول مہدی افادی:

''نئی نسل تمام تر تہذیب الاخلاق کی پروردہ ہے۔''[۳۷]

مدتِ عمر:

تہذیب الاخلاق سرسید کی زندگی میں تین بار نکلا اور بند ہوا، اس لیے اس کی مدتِ عمر دس سال سے آگے نہ بڑھ سکی:

(۱) پہلی بار چھ سال شائع ہونے کے بعد ۱۸۷۷ء میں بند ہوا۔

(۲) دوسری بار قارئین کے اسرار پر ایک سال ۱۸۷۹ء میں جاری رہ کر ۱۸۸۰ء میں بند ہو گیا۔

(۳) تیسری مرتبہ ۱۸۹۴ء میں شائع ہو کر ۱۸۹۷ء تک جاری رہا۔

اس کو بند کرنے کی بھی کئی وجہیں تھیں:

(۱) کالج کو ترقی دینے کی فکر (سرسید ۱۸۹۷ء میں پنشن لے کر ملازمت سے سبک دوش ہو گئے کیوں کہ ملازمت کے دوران وہ کالج کے لیے چندہ وصول کرنا معیوب سمجھتے تھے۔)

(۲) وقت اور پیسے کی کمی

(۳) تفسیر القرآن کو مکمل کرنا

(۴) مسلمان کافی حد تک بیدار ہو چکے تھے۔

تہذیب الاخلاق کے موافق گروہ کے بارے میں حالی نے لکھا ہے کہ:

''وہ اس کے مضامین پر وجد کرتے تھے اور تاریخ متعین پر اس کے انتظار میں ہمہ تن چشم رہتے تھے اور اس کے مخالفوں کو تعجب سے دیکھتے تھے۔''[۳۸]

تہذیب الاخلاق کی اہمیت یہ ہے کہ یہ مخالفت کے باوجود بھی اپنے مقصد میں کافی حد تک کامیاب رہا۔ مخالفت بھی ایسی تھی کہ جو بڑے بڑے اخبارات کی شکل اختیار کر چکی تھی۔ مثلاً:

(۱) کان پور سے نور الآفاق اور نور الآفاق میں مضامین لکھے گئے

(۲) رسالہ اشاعۃ السنۃ میں بھی مخالفت ہوئی اور یہی وہ رسالہ ہے جس نے سرسید کو کافر، مرتد اور کرستان وغیرہ القاب و آداب سے نوازا۔

باوجود مخالفت کے تہذیب الاخلاق نے کافی حد تک اپنے اغراض و مقاصد میں کامیابی حاصل کی اور قوم کو بیدار کیا اور جدید علوم و فنون سے روشناس کر دیا۔

ایم۔اے۔او کالج کا قیام اور جدید تعلیم کا تصور:

سرسید احمد خاں چوں کہ غدر کے دوران ہی اس حقیقت سے واقف ہو گئے تھے کہ مسلمانوں کو ذلت اور پستی سے باہر نکالنے کا واحد ذریعہ جدید تعلیم کے سوا اور کچھ نہیں ہے۔ اس لیے انھوں نے سفر

انگلستان کے دوران ہی مسلمانوں کو جدید تعلیم سے آشنا کرانے کے منصوبے بنانے شروع کر دیے تھے۔ ان منصوبوں میں پہلا تہذیب الاخلاق کا اجرا اور دوسرا مدرسۃ العلوم کا قیام تھا، جس کے لیے انھوں نے وقت سے پہلے ہی ۱۸۷۶ء میں پنشن لے کر نوکری سے استعفیٰ دے دیا تھا۔ ادھر تہذیب الاخلاق کے ذریعے بھی مسلمان کافی حد تک بیدار ہو چکے تھے۔ اس لیے اب سرسید کی ساری توجہ کا مرکز مدرسۃ العلوم ہی تھا۔

۲۴ رمئی ۱۸۷۵ء کو مدرسۃ العلوم مسلمانان، یعنی محمڈن اینگلو اورینٹل کالج (اے۔ایم۔او) کا قیام عمل میں آیا اور اس کا بنیادی پتھر لارڈ لٹن وائسرائے ہند کے ہاتھوں ۸ رجنوری ۱۸۷۷ء کو علی گڑھ میں رکھا گیا۔

بہ ظاہر تو یہ مسلمانوں کی تعلیم کے لیے قائم ہوا تھا لیکن اس میں تمام مذاہب کے لوگ تعلیم حاصل کرتے تھے اور کرتے ہیں۔ اس میں کسی بھی طرح کے تعصب کی کوئی گنجائش نہ تھی۔ اس کا صرف ایک ہی اہم مقصد تھا کہ سب ہندوستانیوں کی ترقی ہو اور وہ بھی یوروپی اقوام کی طرح عزت و وقعت کی نگاہ سے دیکھے جائیں۔

اس موقع پر سرسید نے لارڈ لٹن کو خطاب کرتے ہوئے کہا کہ:

> ''جس کالج کی حضور اب بنیاد رکھنے کو ہیں، وہ اکثر امور عظیم میں ان تمام مدرسوں سے مختلف ہے جو اس ملک میں قائم ہو چکے ہیں۔ سابق میں ایسے مدرسے اور کالج اس ملک میں قائم ہو چکے ہیں جن کو بادشاہوں نے بنایا تھا اور جن کی امداد سلطنت کے محاصل میں سے کی جاتی تھی۔ مگر ہندوستان کے مسلمانوں کی تاریخ میں یہ اوّل ہی موقع ہے کہ ایک کالج نہ کسی خاص شخص کی فیاضی یا علمی شوق سے اور نہ کسی بادشاہ کی شاہانہ سرپرستی سے بنا ہے بلکہ کل قوم

کی متفق خواہشوں اور مجتمع کوششوں سے قائم ہوا ہے۔ اس کالج کی بنا ان اسباب پر ہے جو سابق میں اس ملک کو پہلے کبھی دیکھنے کو نصیب نہیں ہوئے۔ یہ کالج بے تعصبی اور ترقی کے اصولوں پر مبنی ہے جس کی نظیر مشرق کی تواریخ میں نہیں پائی جاتی۔''[۳۹]

سرسید کی اس تقریر سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ انھیں قوم سے کس قدر دلی ہمدردی تھی۔ سرسید کی کوششوں کے نتیجے میں اتنا بڑا کالج وجود میں آ گیا لیکن وہ اپنا نام اُجاگر نہ کر کے اسے قوم کی کوششوں کا ثمرہ تصور کرتے ہیں۔

سرسید نے اس مدرسہ کے لیے کافی مشکلوں کا سامنا کرتے ہوئے چندہ اکٹھا کیا تھا، کیوں کہ وہ قوم جس کی وہ بھلائی کر رہے تھے وہی چندہ دینے کو تیار نہ تھی۔ ایک تو انگریزی تعلیم سے نفرت کے سبب، دوسرے تہذیب الاخلاق کے مضامین سے ناراضگی نے لوگوں کو اور بھی چندہ دینے سے باز رکھا، لیکن اس کے باوجود سرسید کسی نہ کسی طرح چندہ لینے کے بہانے نکال ہی لیتے تھے۔ چندہ لینے کے لیے انھوں نے نئی نئی تدبیروں سے کام لیا۔ مثلاً:

(۱) لاٹری ڈال کر

(۲) اپنی اور اپنے دوستوں کی کتابیں فروخت کر کے

(۳) اپنی تصویر کی کاپی بیچ کر

(۴) چراغی کے پیسے لے کر

(۵) امام ضامن کے نام پر اشرفی لے کر

(۶) نیشنل والنٹئر بن کر گلے میں جھولی ڈال کر چندہ مانگا

(۷) دینی ریڈنگ کا جلسہ کیا

(۸) اسٹیج پر کھڑے ہو کر غزلیں گا کر

(۹) طوائفوں اور سازندوں سے چندہ لے کر

(۱۰) احباب سے دعوت کا روپیہ لے کر

۱۸۷۵ء میں علی گڑھ میں مدرسۃ العلوم قائم کیا۔ ۱۸۷۶ء میں بنارس سے ملازمت سے کنارہ کشی کر کے علی گڑھ چلے آئے کیوں کہ وہ مدرسہ کو ترقی دینا چاہتے تھے لیکن نوکری کی مصروفیت اور عہدہ کی پاس داری کے سبب نہ تو وہ وقت دے سکتے تھے اور نہ چندہ کر سکتے تھے اس لیے اب مکمل طور پر وہ مدرسہ کو کامیاب بنانے میں لگ گئے۔ یہاں آ کر رہین کی ہوئی کوٹھی فروخت کر کے دوسری کوٹھی خرید لی۔ ۱۸۷۷ء میں کالج کا بنیادی پتھر شان وشوکت سے رکھا گیا۔ لارڈلٹن وائسرائے و گورنر جنرل کشور ہند کے ہاتھ ابتدا ہوئی۔''[۴۰]

اب سرسید کے سامنے ایسا مشکل کام تھا کہ جس کے کرنے سے بڑے بڑے کتراتے تھے، کیوں کہ وہ قوم جس کی وہ بھلائی کر رہے تھے وہی چندہ دینے کو تیار نہ تھی۔ مولوی اور واعظ اپنی محفلوں میں لوگوں کو چندہ دینے سے منع کرتے، وغیرہ وغیرہ۔ لیکن سرسید نے اپنی مصلحت سے یہ کام بھی آسان کر دیا۔ انھوں نے اس کی بھی نئی نئی تدبیریں نکالیں۔

(۱) بورڈنگ ہاؤس کی عمارتوں کو بنانے کے لیے قرض لیا۔ اس تدبیر سے لوگوں کے دل میں کالج کی برائی کا خیال پیدا ہوا۔ مسلمانوں کو قومیت سے روشناس ہوتے حکام کے دل میں کالج کی وقعت زیادہ ہوئی۔

(۲) کالج کی ہر عمارت کا تخمینہ کر کے متعدد حصوں میں تقسیم کر کے اشتہار دے دیا کہ فی حصہ اتنا روپیہ ہوتا ہے جو اتنا روپیہ دے گا اس کا نام عمارت پر کندہ کیا جائے گا۔ اس طرح احاطہ کا ایک بڑا حصہ تیار ہو گیا۔

(۳) بورڈنگ ہاؤس کی پختہ بارک کے لیے فی کمرہ پندرہ سو روپیہ مقرر کیا اور اس طرح پختہ کمروں کی تعداد بڑھ گئی۔

(۴) احاطے کے تین دروازے مقرر کیے۔ طے ہوا کہ جو دروازہ بنوائے گا اس پر اسی کا نام لکھا جائے گا۔

(۵) تیس ہزار کی لاٹری ڈالی۔ اس پر مخالفتیں ہوئیں مگر انھوں نے کچھ فکر نہ کی:

''جن دنوں میں لاٹری کی ضرورت درپیش تھی، دو رئیس سرسید کے پاس آئے اور لاٹری کے ناجائز ہونے کی گفتگو شروع کی۔ سرسید نے کہا یہاں ہم اپنی ذات کے لیے ہزاروں ناجائز کام کرتے ہیں وہاں قوم کی بھلائی کے لیے بھی ایک ناجائز کام سہی، سرسید کے ایک دوست وہاں موجود تھے۔ انھوں نے کہا ''لاٹری کا گناہ درحقیقت رئیسوں اور دولت مندوں پر ہوگا۔ اگر وہ مدرسے کی مدد کرتے تو کیوں لاٹری کی ضرورت ہوتی۔''[۴۱]

(۶) اپنی اور اپنے دوستوں کی کتابیں فروخت کیں۔

(۷) اپنی تصویر کی کاپیاں بیچیں۔

(۸) چراغی اور امام ضامن کے پیسے لیے، نمائش میں کتابیں بیچیں، نیشنل والنٹیر بن کر گلے میں جھولی ڈالی، مینی ریڈنگ کا جلسہ کیا اور اسٹیج پر کھڑے ہو کر غزلیں گائیں۔ جب وہ مینی ریڈنگ کا جلسہ کرنے جا رہے تھے تو ان کے مخلص دوستوں نے سمجھایا کہ لوگ آپ پر ہنسیں گے۔ اسٹیج پر انھوں نے ایک موثر تقریر کی کہ:

''کون ہے جو آج مجھ کو اسٹیج پر دیکھ کر حیران ہوتا ہوگا؟ وہی جن کے دل میں قوم کا درد نہیں، وہی جن کا دل جھوٹی شیخی اور جھوٹی مشیخیت سے بھرا ہوا ہے۔ آہ اس تصویر پر جو شرم ناک باتوں کو اپنی شیخی اور افتخار کا باعث سمجھیں اور جو کام

قوم اور انسان کی بھلائی کے لیے نیک نیتی سے لیے جائیں، ان کو بے عزتی کے کام سمجھیں۔ آہ اس قوم پر جو لوگوں کو دھوکا دینے کے لیے مکر و پندار کے کالے سوت سے بنے ہوئے تقدس کے برقع کو اپنے منھ پر ڈالے ہوئے ہوں، مگر اپنی بدصورتی اور دل کی برائی کا کچھ علاج نہ سوچیں۔ آہ اس پر جو اپنی قوم کو ذلت اور نکبت کے سمندر میں ڈوبتا ہوا دیکھے، اور خود کنارے پر بیٹھا ہنستا رہے۔ اپنے گھر میں کھلے خزانے سے ایسی بے شرمی اور بے حیائی کے کام کرے جن سے بے شرمی و بے حیائی بھی شرما جائے، لیکن قوم کی بھلائی کے کام کو شرم اور نفریں کا کام سمجھے۔'' [۴۲]

(۹) چندہ کے نام پر انھوں نے دو دو آنہ اور چار چار آنہ لینے میں بھی شرم محسوس نہیں کی۔

(۱۰) طوائفوں کی طرف سے بھیجا ہوا چندہ بھی قبول کیا۔

(۱۱) احباب کی طرف سے کی گئی دعوت کو وہ اس طرح قبول کرتے کہ وہ اس دعوت کا پیسہ لے لیتے اور چندہ میں جمع کر دیتے۔

(۱۲) سید محمود کے ولیمہ کے روپیہ بھی چندہ میں دے دیے۔ ۱۸۹۳ء میں پوتے کی بسم اللہ کے پیسے بھی چندہ میں دے دیے۔

(۱۳) انھوں نے چندہ اپنے اوپر اس قدر لازم کر لیا تھا کہ اب وہ ہر قسم کی داد و دہش سے اپنے آپ کو باز رکھتے اور دوسرے رفاہی کاموں میں چندہ نہیں دیتے تھے۔ شادی و غم کی رسموں میں روپیہ خرچ نہیں کرتے تھے، اپنے خاندان کے غریبوں، مسکینوں کے علاوہ کسی بھی غریب و غربا کی مدد نہیں کرتے تھے۔ جو دوست مدرسہ کی حمایت میں سرگرم نہ ہوتے ان سے دوستی ختم کر دیتے تھے اور غیر لوگ جو مدرسے کی حمایت کرتے انھیں اپنا سچا دوست کہتے تھے۔

(۱۴) انھوں نے چندہ کی خاطر لحاظ کرنا بھی چھوڑ دیا تھا جب کہ یہ ان کی اچھی عادتوں میں سے ایک اچھی عادت تھی۔ کبھی کبھی تو ان کے دوست بھی ان سے کترا جاتے تھے لیکن سرسید یہ

جانتے ہوئے بھی ان سے چندہ لینے میں لحاظ نہ کرتے تھے۔ایک آرٹیکل میں لکھتے ہیں کہ:

''ہمارا تو اب یہ حال ہوگیا ہے کہ ہمارے دوست بھی ہم سے ملتے ہوئے ڈرتے ہیں کہ کچھ سوال نہ کر بیٹھیں۔ ہماری صورت ہی اب سوال ہوگئی ہے۔'' [۴۳]

ایک بار مسٹر تھیوڈر بک کے والد سیاحت کے لیے ہندوستان میں آئے ہوئے تھے۔ایک خاص سکہ کی اشرفی دوستانہ طور پر مولوی زین العابدین خاں کو دینی چاہتے تھے اور وہ اس کے لینے سے انکار کرتے تھے۔آخر دونوں صاحب سرسید کے پاس آئے اور واقعہ بیان کیا۔سرسید نے بہت بدمزہ ہوکر مولوی صاحب سے کہا کہ دوستوں کے ہدیہ کو رد کرنا نہایت بداخلاقی کی بات ہے۔انھوں نے وہ اشرفی لے لی۔سرسید نے کہا دیکھوں کس سکہ کی اشرفی ہے اور ان سے لے کر مدرسہ کے کھاتے میں جمع کردی:

''اسی طرح ایک دن سید محمود نے قاضی رضا حسین مرحوم سے کسی بات پر پچاس روپیہ کی شرط لیں اور یہ ٹھہرا کہ جو ہارے پچاس روپے مدرسہ میں دے۔اتفاق سے سید محمود ہار گئے۔وہ سو روپے کا نوٹ لے کر آئے اور قاضی صاحب سے کہا کہ پچاس روپے دیجیے اور نوٹ لیجیے۔انھوں نے کہا وہ تو ہنسی کی بات تھی، کیسی شرط اور کیسا روپیہ؟ دوسرے شرط یہ ناجائز بھی نہیں ہے۔ سرسید بھی وہیں موجود تھے، جب انھوں نے دیکھا کہ روپیہ مدرسہ میں آتا ہے، فرمایا کہ جس شرط میں اپنا فائدہ ملحوظ نہ ہو وہ جائز ہے اور فوراً بکس میں سے پچاس روپئے نکال کر سید محمود کو دے دیے اور نوٹ لے لیا۔'' [۴۴]

غرض یہ کہ انھیں ایک لگن تھی کہ کسی نہ کسی طرح قوم جدید تعلیم سے روشناس ہو جائے اس لیے انھوں نے مدرسہ کے لیے چندہ لیتے وقت اپنی ذات کو بالکل بھلا دیا تھا۔ یہاں تک کہ انھوں نے اپنے آپ کو قلی چمار تک کہہ دیا۔صرف وہ اپنے آپ کو ایک انسان تصور کرتے تھے اور کہتے تھے کہ انسانوں کی بھلائی کے لیے ہی یہ سب کچھ کر رہا ہوں۔اس طرح چندہ مانگنے سے ان کے دوست انھیں روکتے، منع کرتے ہیں۔

وہ کہتے تھے کہ:

''اگر میں لوگوں کے کہنے کا خیال کرتا، تو جو کچھ اب تک کیا ہے اس میں کچھ نہ کرسکتا۔ لوگوں کے کہنے کا کچھ خیال نہ کرو بلکہ یہ دیکھو کہ اس سے .... درحقیقت قوم کو فائدہ پہنچے گا یا نہیں۔''[۴۵]

انھوں نے چندہ کے نام پر دو آنے چار آنے تک جمع کیے۔ چندہ کی خاطر انھوں نے دور دراز کا سفر بھی کیا۔ مثلاً پٹنہ، گورکھ پور، الٰہ آباد، مرزا پور، لاہور، امرت سر، پٹیالہ، حیدر آباد، نیل گری، بھوپال، جبل پور وغیرہ۔ لیکن وہ سفر کا خرچ خود برداشت کرتے تھے۔ انھوں نے اپنے ان دوستوں سے جو چندہ نہیں دیتے تھے، قطع تعلق کرلیا تھا۔

ان تمام باتوں سے یہ نتیجہ نکلتا ہے کہ سرسید نے مدرسۃ العلوم کی خاطر بڑی بڑی قربانیاں دی تھیں۔ کیوں کہ انھوں نے ایسے وقت میں قدم بڑھایا تھا کہ جب قوم بالکل جاہل تھی۔ اسے تعلیم کی قدر و قیمت معلوم نہ تھی۔ ہر کام صرف ذاتی اغراض و مقاصد پر مبنی تھا۔ قومی ترقی سے لوگ ناواقف تھے۔ امیر، شرفا، امرا سب اپنی اپنی دولت کے نشے میں اور عیش و آرام میں مصروف تھے۔ علما صرف وعظ و نصیحت سے ہی لوگوں کو ڈراتے اور آخرت کی زندگی کو ہی سب کچھ مانتے تھے اور لوگوں کو بہکا کر صرف اپنا پیٹ بھرتے تھے۔ قوم کی زندگی کا کوئی معیار نہ تھا، عجیب سی غفلت تھی کہ نہ پوری طرح سوئے ہوئے تھے اور نہ ہی پوری طرح بیدار تھے۔ لیکن سرسید کے اس مدرسے نے قوم میں نئی اُمنگیں پیدا کیں۔ انھیں جدید تعلیم سے واقف کرایا، یہی نہیں کہ اس مدرسہ نے صرف جدید تعلیم پر زور دیا ہو، بلکہ یہ مدرسہ تین حصوں پر مشتمل تھا:

(۱) انگریزی مدرسہ (۲) اردو مدرسہ (۳) عربی و فارسی مدرسہ

اسے تین حصوں میں اس لیے تقسیم کیا گیا تا کہ یہاں پر جو طالب علم تعلیم حاصل کریں انھیں کسی طرح کی دقت و پریشانی نہ ہو۔ یعنی کہ وہ انگریزی پڑھ کر اعلیٰ عہدے اور عزتیں پائیں اور مغربی علوم کو

اردو میں منتقل کریں۔ انگریزی پڑھ کر اپنا معیار انگلستان کے کالجوں کے برابر لے جائیں، لیکن صرف انگریزی میں ہی مہارت حاصل نہ کریں بلکہ عربی و فارسی میں بھی تعلیم پا کر مسلمانوں کے قدیم سرمائے کو موجودہ نسلوں کے لیے حفاظت کے ساتھ قائم رکھ سکیں۔

اس طرح اس مدرسہ نے مسلمانوں کی علمی، سیاسی، تہذیبی اور ادبی تحریکوں کو کافی فروغ بخشا۔

مسلم ایجوکیشنل کانفرنس اور تعلیمی تحریک:

۱۸۸۶ء میں اس کانفرنس کی بنیاد رکھی گئی۔ اس نے اتنی ترقی کی کہ ۱۸۸۶ء سے لے کر ۱۹۴۵ء تک اس کے ۵۴ سالانہ اجلاس ہوئے۔ اس کو اتنی ترقی اس لیے ملی تھی کہ اس کا خاص مقصد مسلمانوں میں اتحاد اور یک جہتی کے جذبات پیدا کرنا تھا۔ اپنی قومی ضروریات اور اجتماعی خامیوں کا احساس دلانا تھا اور اس میں ایسی نظمیں پڑھنے کا اہتمام کیا گیا تھا جو قومی دردمندی، علی گڑھ تحریک کی حمایت اور مسلمانوں کے بڑھتے ہوئے شعور کی عکاس ہوتی تھیں۔

۱۸۸۶ء کے گزٹ میں اس کی تجویز اس طرح ہے کہ:

> ''اس بات کو ہر کوئی تسلیم کرے گا کہ ہماری قوم کی حالت اور خصوصاً اس کی تعلیم کا معاملہ نہایت توجہ کے قابل ہے۔ اسی لیے مناسب معلوم ہوتا ہے کہ مختلف اضلاع کے لوگوں کو جو قومی ترقی کے خواہاں اور قوم کی بھلائی اور ترقی میں کوشش کرنا چاہتے ہیں۔ ایک سالانہ جلسہ ہوا کرے اور اسی نام سے موسوم ہو جو اس آرٹیکل کے نام پر لکھا گیا ہے۔''[۴۶]

اس لیے اس کا اجلاس سال میں ایک مرتبہ کسی اہم شہر میں ہوتا تھا۔ اس کی ضرورت اس لیے پیش آئی کہ جب سرسید نے دیکھا کہ یہ کالج چھ کروڑ افراد کی تعلیمی ضرورت کو پورا نہیں کر سکتا۔ اس لیے وہ قوم جو ملک کے دور دراز علاقوں میں پھیلی ہوئی ہے اور جو آپس میں ایک دوسرے کے حالات سے بے خبر

ہے اور کوئی ایسا ذریعہ نہیں ہے کہ جس کی وجہ سے وہ لوگ آپس میں ایک جگہ جمع ہوں اور اپنے اپنے خیالات قومی تعلیم اور قومی ترقی کی نسبت ایک دوسرے پر ظاہر کرسکیں اور آپس کے میل جول سے ہندوستان کو تعلیمی میدان میں آگے بڑھا سکیں۔ غرض یہ کہ انھیں تمام وجوہات کی بنا پر اس کانفرنس کو قائم کیا گیا۔ اس کے اہم مقاصد یہ ہیں:

۱۔ مسلمانوں میں یوروپین سائنس لٹریچر کی اشاعت اور اعلیٰ تعلیم کے فروغ کی کوشش کرنا

۲۔ مسلمانوں کے قدیم علوم کے متعلق تحقیقات کرنا

۳۔ اردو انگریزی میں رسالے لکھوا کر دونوں زبانوں کو فروغ دینا

۴۔ مشہور علما اور مصنّفین اسلام کی سوانح حیات اردو انگریزی میں مرتب کروانا

۵۔ زمانۂ قدیم کے تاریخی واقعات کی تحقیق و اشاعت

۶۔ دنیاوی علوم کے مسائل کی تحقیق و اشاعت

۷۔ شاہی فرامین کو اکٹھا کر کے ایک کتاب انشا مرتب کرنا

۸۔ مسلمانوں کی انگریزی تعلیم کی درس گاہوں میں مذہبی تعلیم کا انتظام کرنا

۹۔ علوم کی ترقی اور دینیات کے علما سے ربط قائم کرنا اور ان کی تعلیم میں ترقی کی کوشش کرنا

۱۰۔ قدیم مکاتیب کی اصلاح و ترقی

چنانچہ اس کانفرنس کی اہم خدمات یہ ہیں کہ:

۱۔ مسلمانوں میں بیداری پیدا ہوئی

۲۔ تعلیم اور طریقۂ تعلیم پر غور و خوض ہوا

۳۔ تعلیم کے مفید ذرائع پر توجہ دی گئی

۴۔ کالج کے لیے میدان ہموار کیا

۵۔ انگریزی تعلیم سے رغبت پیدا ہوئی

۶۔ مذہبی تعلیم کو فروغ دیا

۷۔ تعلیم نسواں کے لیے کوشش کا جذبہ پیدا ہوا

۸۔ قدیم اور مستند کتابوں کی کھوج کی گئی

۹۔ اردو میں اخلاقی کتابوں اور رسالوں کی اشاعت ہوئی

۱۰۔ مسلمان بادشاہوں کے فرامین وغیرہ کو محفوظ رکھ کر انھیں شائع کیا گیا۔

خلاصہ یہ ہے کہ اس کانفرنس نے مسلمانوں میں تعلیمی رجحان، حال سے لگاؤ کا جذبہ اور مستقبل کی فکر پیدا کردی۔ سرسید کی یہ تمام خدمات اس بات کی شہادت دیتی ہیں کہ انھوں نے کبھی اپنا وقت ضائع نہیں کیا بلکہ کسی نہ کسی مفید کام میں لگے رہے۔ یہاں تک کہ انھوں نے اپنی زندگی کے تمام حسین وخوش گوار لمحات ملک وقوم کے حوالے کردیے۔ قوم سے محبت ہی نے انھیں اس قدر مشغول رکھا کہ اپنی ہستی اس کی محبت میں غرق کردی۔ اس کی مثال یہ ہے کہ مرادآباد میں اپنی شریکِ حیات (پاکیزہ بیگم عرف مبارک بیگم) کے انتقال (۱۸۶۱ء) کے بعد عزیزوں کے کہنے کے باوجود اپنے صغیر سن بچوں، سید حامد، سید محمود اور بیٹی آمنہ بیگم کی خاطر بھی دوسری شادی نہیں کی، بلکہ قوم کو ہی اولاد سمجھ کر اس کو تاریکی سے روشنی کی طرف لانے میں مصروف رہے۔

سرسید نے اپنی تمام خدمات میں جس پہلو پر زور دیا وہ جدید تعلیم ہے۔ کیوں کہ سرسید نے اپنی اکیاسی (۸۱) سالہ زندگی میں ہندوستان کی پستی کا جو مطالعہ کیا تھا اس میں انھیں قوم کی اصلاح کا بہتر علاج صرف جدید سائنسی تعلیم میں ہی نظر آیا، لیکن یہ بات نہیں ہے کہ انھوں نے اپنے قدیم ادب کو اہمیت کا حامل نہ سمجھا ہو، بلکہ سرسید نے اردو شعر وادب کی بھی ایسی اصلاح کی کہ ذرّے کو آفتاب بنادیا۔ بقول خلیق احمد نظامی:

''سرسید نے علم کے پرانے تصور کو بالکل ردّ کر دیا تھا۔ ان کے ذہن میں علم قومی ترقی کا راستہ اور معاشی بہبود کا ایک ذریعہ تھا۔ وہ چاہتے تھے کہ علم ایک 'ذہنی عیاشی' نہ ہو، بلکہ سماج کی بہتری اس کا نصب العین اور مطمحِ نظر ہو۔''[۴۷]

سرسید نے اردو ادب کے ہر گوشے میں اصلاح کی۔ انھوں نے اردو ادب میں محققوں، مورخوں، شاعروں اور نقادوں کی ایک نئی دنیا آباد کر دی۔ ادب میں نئے نئے شگوفے کھلائے اور اپنے رفقا مثلاً نواب محسن الملک (مقالہ نگار)، مولوی چراغ علی (انشا پرداز)، نذیر احمد (ناول نگار)، مولانا شبلی نعمانی (تنقید نگار)، مولانا الطاف حسین حالی (نظم نگار، تنقید نگار، سوانح نگار)، وقار الملک، سرشار، عبدالحلیم شرر اور محمد حسین آزاد (حالاں کہ محمد حسین آزاد نے علی گڑھ تحریک یا سرسید سے براہِ راست تعلق پیدا نہیں کیا تھا لیکن بالواسطہ طور پر وہ سرسید کے خیالات سے زیادہ متاثر ہوئے تھے) وغیرہ کو اس طرف راغب کیا اور اس طرح انھوں نے اپنے ہم خیال رفقا کی ایک جماعت تیار کر کے اردو شعر و ادب کو نیچرل رنگ عطا کیا۔

سرسید نے پہلی بار شمالی ہند میں نثر اور نظم دونوں کو ایک ساتھ ترقی دلائی کیوں کہ اس سے پہلے کے ادب پر اگر غور کیا جائے تو شاعری اور نثر دو حصوں میں تقسیم ہوتی ہوئی نظر آتی ہے۔ شاعری نے دکن میں ترقی کی اور نثر نے کلکتہ میں، لیکن سرسید نے دونوں کو ساتھ ساتھ ترقی دی۔ انھوں نے ادب کے ذریعے قوم کو خوابِ غفلت سے بیدار کیا۔ ادب کے ذریعے اجتماعی مقاصد کو اُجاگر کر کے اسے اجتماعی زندگی کا ترجمان اور علمی مطالب کے اظہار کا ذریعہ بنایا۔ انھوں نے مضمون و معنی کو اوّلیت دے کر طرزِ بیان کو ثانوی حیثیت دی۔

حالاں کہ سرسید نے پہلے بھی اردو ادب کی طرف انگریزوں کے قائم کردہ فورٹ ولیم کالج (۱۸۰۰ء) کے ذریعے آسان زبان کی داغ بیل ڈالی جا چکی تھی، لیکن وہاں کا ادب قصے کہانی تک ہی

محدود تھا۔ ادھر مرزا غالب بھی اپنے خطوط کے ذریعے اس کو ترقی دے رہے تھے، لیکن ان کے یہاں ذاتی واردات پر زور دیا گیا تھا۔ اس لیے اس سے بھی ادب کو خاطر خواہ فائدہ نہ ہوا۔ سرسید کا اہم کارنامہ یہ ہے کہ انھوں نے ادب کو جدید مضامین، تاریخ، سوانح، انشا، تحقیق، مقالہ اور تنقید وغیرہ سے نواز کر اردو ادب کا دائرہ وسیع کر دیا اور اس طرح ادب کو تصوراتی زندگی سے آزاد کرا کر اس کا رشتہ زندہ و متحرک دنیا سے جوڑ دیا۔

سرسید اردو شاعری سے بھی مطمئن نہیں تھے، چنانچہ جب آزاد نے ۱۸۷۴ء میں لاہور مشاعرہ کی بنیاد ڈالی تو سرسید اس رجحان سے کافی خوش ہوئے۔ لہٰذا انھوں نے اپنے ایک خط میں آزاد کو ۱۹/ اکتوبر ۱۸۷۴ء کو لکھا:

> ''حالات مندرجہ سے اطلاع ہوئی۔ افسوس صد افسوس کہ کبھی مسلمانوں میں باہم اتفاق نہ ہوا۔ شعر و سخن پر رد و قدح دوسری چیز ہے اور آپس کا نفاق دوسری چیز ہے۔ میری نہایت قدیم تمنا اس مجلسِ مشاعرہ سے برآئی ہے۔ میں مدت سے چاہتا تھا کہ ہمارے شعرا نیچر کے حالات کے بیان پر متوجہ ہوں۔ آپ کی مثنوی 'خوابِ امن' پہنچی، دل بہت خوش ہوا۔ دراصل شاعری اور زور سخن وری کی وادی ہے، اب بھی اس میں خیالی باتیں بہت ہیں۔ اپنے کلام کو اور زیادہ نیچر کی طرف مائل کرو۔ جس قدر کلام نیچر کی طرف مائل ہوگا اتنا ہی مزہ دے گا۔ اب لوگوں کے طعنوں سے مت ڈرو، یہ ضرور ہے کہ انگریزی شاعروں کے خیالات لے کر اردو زبان میں ادا کیے جائیں، یہ کام ہی ایسا مشکل ہے کہ کوئی کر تو دے۔ اب تک ہم میں خیالات نیچر کے ہیں ہی نہیں، ہم بیان کیا کر سکتے ہیں۔ بعد رمضان انشاء اللہ تعالیٰ ایک مضمون طویل اس باب میں لکھوں گا۔ ان دنوں بہ سبب صوم کچھ کام نہیں ہو سکتا۔''[۴۸]

سرسید نے علی گڑھ تحریک کے ذریعے نیچر کو اہمیت دی تھی۔ اس لیے وہ ادب کو بھی نیچر سے قریب ہی نہیں بلکہ اس کو پورا پورا نیچر میں ڈھالنے کے قائل تھے۔ قدیم ادب پر ان کی رائے یہ تھی کہ:

''شاعر کے ذہن میں وہی چند محدود خیالات جمع ہیں جن کو اگلے شعرا باندھ گئے ہیں یا صرف وہی معمولی باتیں اس کو بھی معلوم ہیں جیسی کہ عام لوگوں کو معلوم ہوتی ہیں اور اس نے شاعری کی تکمیل کے لیے اپنی معلومات کو وسعت نہیں دی اور مطالعۂ فطرت کی عادت نہیں ڈالی۔''[۴۹]

سرسید کے زمانہ میں شاعری کا دور دورہ تھا اس لیے انھوں نے بھی اپنی توجہ اس طرف مرکوز کی اور آہی تخلص رکھا، لیکن جلد ہی انھوں نے شاعری کے میدان کو چھوڑ کر نثر کی طرف توجہ کی۔

اس سلسلے میں مولانا شبلی فرماتے ہیں کہ:

''اوّل وہ رواج عام کے اقتضا سے شاعری کے میدان میں آئے، آہی تخلص اختیار کیا اور اردو میں ایک چھوٹی سی مثنوی لکھی جس کا مصرعہ انہی کی زبانی سنا ہوا مجھے یاد ہے:

نام میرا تھا کام ان کا تھا

لیکن حقیقت یہ ہے کہ شاعری سے ان کو مناسبت نہ تھی اس لیے بہت جلد اس کوچہ سے نکل آئے اور نثر کی طرف توجہ کی۔''[۵۰]

سرسید کی مثنوی کے اشعار کی تعداد کے بارے میں صحیح معلوم نہیں ہے کیوں کہ نہ تو انھوں نے اشعار جمع کیے اور نہ ان کو چھپوایا۔ ''خم خانۂ جاوید'' میں ان کا صرف ایک شعر منقول ہے:

ہزار حیف کہ عمر اپنی مفت صرف ہوئی
نہ کچھ خدا کی عبادت نہ کچھ بتوں کی چاہ

اردو نثر نگاری کے عیب گناتے ہوئے سرسید ایک خط میں لکھتے ہیں کہ:

''علم وادب وانشا کی خوبی صرف لفظوں کے جمع کرنے اور ہم وزن اور قریب التلفظ کلموں کے تک ملانے اور دور از کار خیالات بیان کرنے اور مبالغہ آمیز باتوں کے لکھنے پر منحصر ہے۔ یہاں تک کہ دوستانہ خط وکتابت اور روزمرہ کے چھوٹے چھوٹے رقعوں میں بھی یہ سب برائیاں بھری ہوئی ہیں۔ کوئی خط یا کوئی رقعہ ایسا نہ ہوگا جس میں جھوٹ اور وہ بات جو درحقیقت دل میں نہیں ہے مندرج نہ ہو۔ خطوط رسمیہ کے پڑھنے سے ہرگز تمیز نہیں ہوسکتی کہ حقیقت میں اس خط کا لکھنے والا ایسا ہی ہمارا دوست ہے۔ جیسا کہ اس میں لکھا ہے، یا صرف معمولی مضمون ہے جس کے لکھنے کا عموماً رواج پڑ گیا ہے۔ بس ایسی طرز تحریر نے تحریر کا اثر ہمارے دل سے کھو دیا ہے اور ہم کو جھوٹی تحریر کا عادی کر دیا ہے۔''[۵۱]

ایک اور مضمون میں لکھتے ہیں کہ:

''زمانہ اور زمانہ کی طبیعت اور علوم اور علوم کے نتائج سب تبدیل ہو گئے ہیں۔ ہمارے ہاں کی قدیم کتابیں اور ان کا طرز بیان اور ان کے الفاظ مستعملہ ہم کو آزادی اور راستی اور صفائی اور سادہ پن اور بے تکلفی اور بات کی اصلیت تک پہنچنا ذرا بھی تعلیم نہیں کرتے، بلکہ برخلاف اس کے دھوکے میں پڑنا اور پیچیدہ بات کہنا اور ہر بات کو نون مرچ لگا دینا اور ہر امر کی نسبت غلط اور خلاف واقع الفاظ شامل کر دینا اور جھوٹی تعریف کرنا سکھاتے ہیں۔''

شاعری کی حالت نثر سے بھی زیادہ خراب تھی۔ سرسید ذکر کرتے ہوئے کہتے ہیں کہ:

''فن شاعری جیسا ہمارے زمانے میں خراب اور ناقص ہے اس سے زیادہ کوئی

چیز بری نہ ہوگی۔ مضمون تو بجز عاشقانہ کے اور کچھ نہیں ہے، وہ بھی نیک جذبات انسانی کو ظاہر کرتا بلکہ ان جذبات کی طرف اشارہ کرتا ہے جو ضد حقیقی تہذیب الاخلاق کے ہیں۔ خیال بندی کا طریقہ اور تشبیہ واستعارے کا قاعدہ ایسا خراب و ناقص پڑ گیا ہے جس سے تعجب تو طبیعت پر آتا ہے، مگر اس کا اثر مطلق دل میں یا خصلت میں یا اس انسانی جذبے میں ہے جس سے وہ متعلق ہے کچھ بھی نہیں ہوتا۔ شاعر کو یہ خیال ہی نہیں ہے کہ فطری جذبات اور احساس قدرتی تحریک اور ان کی جبلی حالت کا کسی پیرایے یا کنایے یا اشارے یا تشبیہ واستعارے میں بیان کرنا کیا کچھ دل پر اثر کرتا ہے۔''[۵۲]

مبالغہ کی مذمت کرتے ہوئے کہتے ہیں کہ:

''جس طرح کے لائق شاعر دوسروں کی تعریف کرتے ہیں کہ ان اشعار سے ان لوگوں کا نام باقی رہتا ہے جن کی وہ تعریف کرتے ہیں اور شاعری کی خوبی سے خود ان شاعروں کا نام بھی دنیا میں باقی رہتا ہے۔ دونوں شخص خوش ہوتے ہیں۔ ایک اپنی لیاقت کے سبب اور دوسرا اس لیاقت کو تمیز کرنے کے سبب سے، مگر لیاقت شاعری کی یہ ہے کہ وہ نہایت بڑے استادِ مصدر کی مانند ہو کہ وہ اصل صورت اور رنگ اور خال و خط کو بھی قائم رکھتا ہے اور پھر بھی تصویر ایسی بناتا ہے کہ خوش نما معلوم ہو۔ ایشیا کے شاعروں میں ایک بڑا نقص یہی ہے کہ وہ اس بات کا خیال نہیں رکھتے، بلکہ جس کی تعریف کرتے ہیں اس کے اوصاف ایسے جھوٹے اور ناممکن بیان کرتے ہیں جن کے سبب سے وہ تعریف نہیں رہتی بلکہ فرضی خیالات ہو جاتے ہیں۔''[۵۳]

''نیچرل شاعری سے وہ شاعری مراد ہے جو معنی اور انتخابِ الفاظ دونوں کے لحاظ سے نیچرل یعنی فطرت یا عادت کے مطابق ہو۔ بہ اعتبار معنی شاعری کے نیچرل ہونے کا مطلب یہ ہے کہ کوئی بات امر واقعہ کے خلاف نہ بیان کی جائے۔ جس قسم کے واقعات درحقیقت دنیا میں رونما ہوتے ہیں اور جس طرح کے تجربات واقعتاً پیش آتے رہتے ہیں انھیں کو موضوعِ شاعری بنایا جائے۔ بیان کے لحاظ سے شاعری کے نیچرل ہونے سے مراد یہ ہے کہ جہاں تک ہو سکے شعر کے الفاظ اور ان کی تراکیب و بندش اس زبان کی معمولی بول چال اور روزمرہ کے موافق ہو، جس میں وہ شعر کہا گیا ہے کیوں کہ ہر زبان کی معمولی بول چال اور روزمرہ اس ملک والوں کے حق میں جہاں وہ زبان بولی جاتی ہے نیچر یا سکنڈ نیچر کا حکم رکھتے ہیں۔ شعر کا بیان جس قدر کہ بے ضرورت معمولی بول چال اور روزمرہ سے بعید ہوگا اسی قدر ان کو نیچرل سمجھا جائے گا۔'' [۵۴]

اپنے اسلوب بیان کی خصوصیات سے بحث کرتے ہوئے لکھا ہے کہ:

''جہاں تک ہم سے ہو سکا ہم نے اردو زبان کے علم و ادب کی ترقی میں اپنے ناچیز پرچوں (یعنی تہذیب الاخلاق) کے ذریعہ کوشش کی۔ مضمون کی ادا کا ایک صاف اور سیدھا طریقہ اختیار کیا۔ یہاں تک ہماری کچ مچ صفائی پر کوشش کی رنگینیٔ عبارت سے (جو تشبیہات و استعارات خیال سے بھری ہوئی ہے اور جس کی شوکت صرف لفظوں ہی لفظوں میں رہتی ہے اور دل پر کچھ اثر نہیں ہوتا) پرہیز کیا۔ تک بندی سے جو اس زمانے میں مقفیٰ عبارت کہلاتی تھی ہاتھ اُٹھایا۔ جہاں تک ہو سکا سادگیٔ عبارت پر توجہ کی۔ اس میں کوشش کی

کہ جو لطف ہو مضمون کے ادا میں ہو، جو اپنے دل میں ہو، وہی دوسرے کے
دل میں پڑے تا کہ دل سے نکلے اور دل ہی میں بیٹھے۔''[۵۵]

علی گڑھ تحریک کا ادبی زاویہ سب سے موقر تھا اس نے ادب اور ادیب دونوں کو متاثر کیا۔ شبلی لکھتے ہیں کہ:

''سرسید کے جس قدر کارنامے ہیں، اگر چہ ریفارمیشن اور اصلاح کی حیثیت ہر جگہ نظر آتی ہے لیکن جو چیزیں خصوصیت سے ان کی اصلاح کی بدولت ذرّہ سے آفتاب بن گئیں ان میں ایک اردو لٹریچر بھی ہے۔..... ملک میں آج بڑے بڑے انشا پرداز موجود ہیں جو اپنے اپنے مخصوص دائرۂ مضمون کے حکمراں ہیں لیکن ان میں سے ایک شخص بھی ایسا نہیں جو سرسید کے بارِ احسان سے گردن اُٹھا سکتا ہو۔ بعض بالکل ان کے دامن تربیت میں پلے ہیں بعضوں نے دور سے فیض اٹھایا ہے۔ بعضوں نے مدعیانہ اپنا الگ راستہ نکالا۔ تاہم سرسید کی فیض پذیری سے بالکل آزاد کیوں کر رہ سکتے تھے۔''[۵۶]

غرض یہ کہ شاعری کے سلسلے میں ان کا نقطۂ نظر یہ تھا کہ خیالات نیچرل ہوں۔ شاعری کے ذریعے جو بات کہی جائے اس کا حقیقت پر مبنی ہونا لازم ہو۔ خیالی باتیں نہ ہوں بلکہ خارجی واقعات کو اس طرح بیان کیا جائے کہ وہ بھی داخلی واقعات معلوم ہونے لگیں تا کہ جو کیفیت اپنے اندر ہو وہی دوسرے کے اندر پیدا ہو جائے۔ اس طرح انھوں نے شعر میں سادگی، حقیقت یا اصلیت اور خیال کی پاکیزگی پر زور دیا۔ ان کی اس کسوٹی پر ان کے تمام رفقا کھرے اُترے، لیکن حالی نے 'مقدمہ شعر و شاعری' اور 'مسدس مدوجزر اسلام' لکھ کر سرسید کے مقاصد کی تکمیل کی۔ سرسید نے مولانا حالی کی ان خدمات کو کافی سراہا اور 'مسدس' کے بارے میں یہاں تک کہہ دیا کہ:

''بے شک میں اس کا محرک ہوا اور اس کو میں نے اپنے ان اعمالِ حسنہ میں سمجھتا ہوں کہ جب خدا پوچھے گا کہ تو کیا لایا ہے تو میں کہوں گا کہ حالی سے مسدس لکھوالایا ہوں۔''[۵۷]

سرسید نے اردو ادب کو وقت کی رفتار کے مطابق ڈھالا اور اس کے ذریعے زمانے کے تقاضوں پر غور وخوض اور مسائلِ حاضرہ کو حل کرنے کا کام کیا۔ سرسید نے اپنے رسالوں، تقریروں، تحریروں اور مضامین کے ذریعے جہاں تک ہوسکا عبارت آرائی سے گریز کیا۔ اس طرح انھوں نے اردو ادب کے موضوعات میں تنوع پیدا کر کے علم وادب، تاریخ وتنقید، سوانح، مذہب، سیاست، تہذیب ومعاشرت، عقل وحکمت، مادیت وروحانیت، مغرب ومشرق اور قدیم وجدید ہر موضوع کو ادب میں نہایت سلیقے سے داخل کیا۔

یہ تھیں علی گڑھ تحریک اور سرسید کی ۸۱ سالہ خدمات جو کہ کسی عجوبے سے کم نہیں۔ سرسید نے اپنی خدمات سے ایک ایسے کالج کی بنیاد ڈالی جو کہ اپنی مثال آپ ہے اور یہ ان کے عشق کی ایک ایسی داستان ہے جو واقعی میں عشق کی اصل تعلیم سے واقف کراتا ہے۔ سرسید کو اقبال کی شاعری کا اگر ایک اہم کردار کہا جائے تو بے جا نہ ہوگا۔ ○○○

حواشی:

۱۔ حیاتِ جاوید۔ خواجہ الطاف حسین حالی، ص:۷۱، ۱۹۷۹ء

۲۔ حیات جاوید۔ ص:۸۲

۳۔ ایضاً۔ ص:۸۵

۴۔ ایضاً۔

۵۔ ایضاً۔ ص:۸۷

۵۔ ایضاً۔ ص:۹۱

۷۔ ایضاً۔

۸۔ حیات جاوید۔ ج:۱،ص:۴۰۸، بحوالہ: سرسید کا علمی کارنامہ۔ قاضی احمد میاں اختر جوناگڑھی مرحوم، اکیڈمی آف ایجوکیشنل ریسرچ، آل پاکستان ایجوکیشنل کانفرنس کراچی، طبع اوّل ۱۹۶۴ء،ص:۲۵

۹۔ تہذیب الاخلاق جلد دوم،ص:۵۲۸، بحوالہ: سرسید کا علمی کارنامہ۔ قاضی احمد میاں اختر جوناگڑھی مرحوم، اکیڈمی آف ایجوکیشنل ریسرچ، آل پاکستان ایجوکیشنل کانفرنس کراچی، طبع اوّل ۱۹۶۴ء،ص:۲۷

۱۰۔ حیات جاوید۔ الطاف حسین حالی،ص:۳۵۰

۱۱۔ حیات جاوید۔ الطاف حسین حالی، دوسرا ایڈیشن،ص:۳۵۶

۱۲۔ حیات جاوید۔ الطاف حسین حالی، پہلا ایڈیشن، ۱۹۷۹ء،ص:۶۲

۱۳۔ ایضاً۔ص:۶۵۔۶۶

۱۴۔ ایضاً۔ص:۶۶

۱۵۔ سرسید کا علمی کارنامہ۔ قاضی احمد میاں اختر جوناگڑھی، اکیڈمی آف ایجوکیشنل ریسرچ، پاکستان ایجوکیشنل کانفرنس، کراچی، طبع اوّل، ۱۹۶۴ء

۱۶۔ جسٹس شاہ دین کا لکچر انگریزی ''سرسید بحیثیت مذہبی مصلح''،ص:۸، انڈین پریس، الٰہ آباد۔ بحوالہ: ''سرسید کا علمی کارنامہ قاضی احمد میاں اختر جوناگڑھی، اکیڈمی آف ایجوکیشنل ریسرچ آل پاکستان ایجوکیشنل کانفرنس، کراچی، طبع اوّل ۱۹۶۴ء،ص:۵۳

۱۷۔ سرسید کا علمی کارنامہ۔ قاضی احمد میاں اختر جوناگڑھی، اکیڈمی آف ایجوکیشنل ریسرچ، پاکستان ایجوکیشنل کانفرنس، کراچی، طبع اوّل، ۱۹۶۴ء،ص:۵۵

۱۸۔ حیاتِ جاوید۔ الطاف حسین حالی، پہلا ایڈیشن ۱۹۷۹ء،ص:۹۵

۱۹۔ حیاتِ جاوید۔ الطاف حسین حالی، پہلا ایڈیشن ۱۹۷۹ء،

۲۰۔ ایضاً۔ص:۹۶

۲۱۔ ایضاً۔ص:۹۶

۲۲۔ ایضاً۔ص:۹۷

۲۳۔ ایضاً۔ص:۱۰۱

۲۴۔ خطبات گارساں دتاسی ص:۷۸۵۔۷۸۷۔ بحوالہ: سرسید کا علمی کارنامہ، قاضی احمد میاں اختر جوناگڑھی، اکیڈمی آف ایجوکیشنل ریسرچ، آل پاکستان ایجوکیشنل کانفرنس کراچی، طبع اوّل ۱۹۶۴ء،ص:۶۸

۲۵۔ مکتوبات سرسید۔ مرتبہ مولوی محمد اسمٰعیل پانی پتی، ص:۲۴۔ بحوالہ ''سرسید کی ادبی خدمات اور ہندوستانی نشاۃ ثانیہ'' قدسیہ خاتون، ص:۳۶۲

۲۶۔ سرسید اور علی گڑھ تحریک۔ پروفیسر خلیق احمد نظامی، ص:۶۹ (لکچرس ۱۷۶)

۲۷۔ بحوالہ: رسالہ سائنٹفک سوسائٹی نشاۃ ثانیہ، بہ موقع یوم آزادی، ۱۵/اگست ۱۹۶۹ء، قدسیہ خاتون، ص:۲۶۱

۲۸۔ سرسید اور علی گڑھ تحریک۔ پروفیسر خلیق احمد نظامی، ص:۱۴۵

۲۹۔ مضمون ''سائنٹفک سوسائٹی'' از پروفیسر عصمت اسد خاں، شمولہ مجلّہ 'علم و آگہی'، کراچی خصوصی شمارہ ۷۴۔۱۹۷۳ء، ص:۱۴۹، بحوالہ: اردو ادب کے ارتقا میں ''ادبی تحریکوں اور رجحانوں کا حصہ'' منظر اعظمی، ص:۱۱۲۔۱۱۳

۳۰۔ 'حیاتِ جاوید'۔ الطاف حسین حالی، ص:۱۸۵، ۱۸۵۷ء

۳۱۔ خطوط سرسید، ص:۳۸۔ بحوالہ علی گڑھ کی علمی خدمات۔ پروفیسر خلیق احمد نظامی، انجمن ترقی اردو (ہند) نئی دہلی، ص:۲۱۔۲۲

۳۲۔ خطوط سرسید، ص:۵۹۔ بحوالہ: سرسید کا علمی کارنامہ، قاضی احمد میاں اختر جونا گڑھی، اکیڈمی آف ایجوکیشنل ریسرچ، آل پاکستان ایجوکیشنل کانفرنس کراچی، طبع اوّل ۱۹۶۴ء، ص:۷۶۔۷۷

۳۳۔ ایضاً۔ ص:۴۶، نمبر ۱۱

۳۴۔ 'سید احمد خاں۔ سفرنامہ مسافرانِ لندن'۔ مرتبہ شیخ اسمٰعیل پانی پتی، مجلس ترقی ادب، کلب روڈ، لاہور ۱۹۶۱ء، ص:۲۶۳، بحوالہ: ثریا حسین سرسید اور ان کا عہد

۳۵۔ سرسید اور علی گڑھ تحریک۔ پروفیسر خلیق احمد نظامی، ص:۲۳۴

۳۶۔ سرسید تمہید و مقاصد، تہذیب اخلاق، مشمولہ تہذیب الاخلاق، یکم شوال ۱۳۱۱ء ج:۱، ش:۱، ص:۱، بحوالہ نفیس بانو، ص:۱۱۰

۳۷۔ اردو ادب کے ارتقا میں ادبی تحریکوں اور رجحانوں کا حصہ۔ منظر اعظمی، ص:۲۴۰

۳۸۔ 'حیاتِ جاوید'۔ الطاف حسین حالی، ص:۲۲۰، ۱۹۵۰ء، شائع کردہ: اکادمی پنجاب، لاہور

۳۹۔ ایڈریس اور اسپیچیں متعلق محمڈن اینگلو اورینٹل کالج علی گڑھ۔ ص:۳۰۔۳۱۔ بحوالہ: اردو ادب کے ارتقا میں ادبی تحریکوں اور رجحانوں کا حصہ۔ منظر اعظمی، ص:۲۲۸

۴۰۔ حیات جاوید۔ ص:۱۹۵

۴۱۔ ایضاً۔ ص:۱۹۵

۴۲۔ ایضاً۔ ص:۱۹۵

۴۳۔ ایضاً۔ ص:۲۰۲

۴۴۔ ایضاً۔ ص:۲۰۳ تا ۲۰۴

۴۵۔ 'حیاتِ جاوید'۔الطاف حسین حالی،ص:۱۹۵

۴۶۔ علی گڑھ انسٹی ٹیوٹ گزٹ،جلد۲۱،شمارہ۳۶،مئی ۱۸۸۶ء،ص:۵۱،بحوالہ ثریا حسین،''سرسید اوران کا عہد''۔

۴۷۔ سرسید اور علی گڑھ تحریک۔خلیق احمد نظامی،ص:۶۶

۴۸۔ محمد حسین آزاد''حیات اور تصانیف''حصہ اوّل،از ڈاکٹر اسلم عرفی،ص:۲۶۳۔بحوالہ:اردو ادب کے ارتقا میں ادبی تحریکوں اور رجحانوں کا حصہ۔منظر اعظمی،ص:۱۵۵

۴۹۔ علی گڑھ تحریک اور قومی نظمیں۔مرتبہ سید الطاف حسین بریلوی،ص:۳۰۔بحوالہ''اردو ادب کا ارتقا میں میں ادبی تحریکوں اور رجحانوں کا حصہ''،ص:۲۲۴

۵۰۔ مقالات شبلی،حصہ سوم،ص:۵۱۔سرسید کا علمی کارنامہ،قاضی احمد میاں اختر جوناگڑھی،اکیڈمی آف ایجوکیشنل ریسرچ، آل پاکستان ایجوکیشنل کانفرنس کراچی،طبع اوّل ۱۹۶۴،ص:۲۸

۵۱۔ تہذیب الاخلاق،یکم محرم ۱۲۸۹ھ(۱۱رمارچ ۱۸۷۲ء)مشمولہ مضامین تہذیب الاخلاق،جلد دوم،ص:۴۵۱

۵۲۔ ایضاً۔ص:۴۵۱۔۴۵۲

۵۳۔ تہذیب الاخلاق،یکم ذی الحجہ ۱۲۸۹ھ۔مشمولہ مضامین تہذیب الاخلاق دوم،ص:۱۰۱

۵۴۔ مقدمہ شعر و شاعری۔الطاف حسین حالی،ص:۹۵۔۹۶

۵۵۔ سرسید اوران کے نامور رفقا۔سید عبداللہ،ص:۶۸

۵۶۔ اردو ادب کی تحریکیں۔انور سدید،ص:۳۶۴

۵۷۔ حالی کے نام ایک خط،ارمغان علی گڑھ۔از پروفیسر خلیق احمد نظامی،ص:۲۷۔بحوالہ''اردو ادب کا ارتقا میں میں ادبی تحریکوں اور رجحانوں کا حصہ''،ص:۳۲۳

●●●

اردو شعر و ادب پر علی گڑھ تحریک کے اثرات

علی گڑھ تحریک نشاۃ الثانیہ کی تحریک تھی۔ اس کا مقصد ایک طرف تو ہندوستانی مسلمانوں کو زندگی کے تمام میدانوں میں ترقی کی اعلا منزل تک پہنچانا تھا تو دوسری طرف قدیم روایتی اور جھوٹے بناوٹی عہد کو مسمار کر کے جدید دور کا آغاز کرنا تھا۔ اس کا اہم اور بنیادی نظریہ یہ تھا کہ حقیقت کی تلاش جذبہ و تقلید کے ذریعہ نہیں بلکہ تحقیق کے ذریعہ کی جانی چاہیے۔ اسی نظریہ کے تحت اس نے ہندوستانیوں کے ہر شعبۂ حیات کو متاثر کرنے کے ساتھ ساتھ اردو زبان و ادب کی اصلاح کو بھی مدنظر رکھا۔

چوں کہ علی گڑھ تحریک سے قبل اردو ادب موضوع و اسلوب کے لحاظ سے کم مایہ تھا۔ نثر کے بجائے شاعری کو اہمیت دی جاتی تھی۔ سرسید غزل سے اس لیے نالاں تھے کہ:

> ''مضمون تو بجز عاشقانہ کے اور کچھ نہیں ہے، وہ بھی نیک جذبات انسانی کو ظاہر نہیں کرتا بلکہ ان جذبات کی طرف اشارہ کرتا ہے جو ضد حقیقی تہذیب الاخلاق کے ہیں۔ خیال بندی کا طریقہ اور تشبیہ و استعارہ کا قاعدہ ایسا خراب و ناقص پڑ گیا ہے کہ جس سے ایک تعجب تو طبیعت پر آتا ہے، مگر اس کا اثر مطلق دل میں یا انسان کے جذبے میں جس سے وہ متعلق ہے، کچھ بھی نہیں ہوتا۔ شاعروں کو یہ خیال ہی نہیں ہے کہ فطری جذبات اور ان کی قدرتی تحریک اور

ان کی جبلی حالت کا کسی پیرایے یا کنایے یا اشارے یا تشبیہ واستعارے میں
بیان کرنا کیا کچھ دل پر اثر کرتا ہے۔''[1]

سرسید کہتے ہیں کہ:

''شاعری جو مدت سے ہندوستان میں جاری ہے وہ سب لوگ یقین
کریں گے کہ ان کے مضامین کے بیان کرنے سے کوئی خوشی شاید کانوں کو
ہوتی ہو مگر دل پر اثر کرنے والی نہیں ہے۔''[2]

کہا جاتا ہے کہ سرسید نے کالج میں غزل کا داخلہ ممنوع کر دیا تھا۔[3]

سرسید خود غزل کا رچا ہوا مذاق رکھتے تھے۔ مومنؔ، غالبؔ، صہبائیؔ کی دلّی میں جس نے صحبت پائی ہو اس کے رگ وریشہ میں ذوق شاعری پیوست ہو جانا کوئی تعجب کی بات نہیں:

''لیکن انھوں نے یہ محسوس کیا کہ قوم کو جن مسائل کا سامنا ہے اس میں غزل
کی ''خیالی دنیا'' سے نکال کر حقائق کی دنیا میں لانے کی ضرورت ہے۔ اس بنا
پر وہ طلبا میں غزل کے ذوق کو بڑھنے دینا نہیں چاہتے تھے۔ مبادا ان کی عملی
صلاحیتیں مضمحل ہو جائیں۔''[4]

نثر میں بھی مقفیٰ و مسجع جملوں کے ساتھ ساتھ عربی و فارسی الفاظ کی کثرت اور دور از کار تشبیہات واستعارات کا استعمال عام تھا۔ پیچیدہ اندازِ بیان ہی اس زمانے کی روایت اور چلن بن چکا تھا۔ نثر سے متعلق نہ تو واضح خیالات پائے جاتے تھے اور نہ ہی اسے علمی حیثیت سے کام میں لایا گیا تھا۔ سرسید کہتے ہیں کہ:

''ہماری زبان کے علم وادب میں بہت بڑا نقصان یہ تھا کہ نظم پوری نہ تھی۔
شاعروں نے اپنی ہمت عاشقانہ غزلوں اور واسوختوں اور مدحیہ قصیدوں اور

ہجر کے مطعون اور قصہ و کہانی کی مثنویوں میں صرف کی تھی۔ ہم یہ نہیں کہتے کہ ان مضامین کو چھونا نہیں چاہیے تھا۔ نہیں، وہ بھی نہایت عمدہ مضامین ہیں..... مگر نقصان یہ تھا کہ ہماری زبان میں صرف یہی تھے دوسری قسم کے مضامین جو درحقیقت وہی اصلی مضامین ہیں اور نیچر سے علاقہ رکھتے ہیں، نہ تھے۔ نظم کے اوزان بھی وہی معمولی تھے۔ ردیف، قافیہ کی پابندی گویا ذات شعر میں داخل تھی۔ رجز اور بے قافیہ شعر گوئی کا رواج ہی نہیں تھا اور اب بھی شروع نہیں ہوا۔''[۵]

سرسید قدیم ادب کے بارے میں کہتے ہیں کہ:

''ہمارے ہاں کی قدیم کتابیں اور ان کا طرز بیان اور ان کے الفاظ مستعملہ ہم کو آزادی اور راستی اور صفائی اور سادہ پن اور بے تکلفی اور بات کی اصلیت تک پہنچنا ذرا بھی تعلیم نہیں کرتے، بلکہ برخلاف اس کے دھوکے میں پڑنا اور پیچیدہ بات کہنا اور ہر بات کہ نون مرچ لگا دینا اور ہر امر کی نسبت غلط اور خلاف واقع الفاظ شامل کر دینا اور جھوٹی تعریف کرنا سکھاتے ہیں۔''[۶]

سرسید نے نثر کی خامیوں پر اس طرح روشنی ڈالی کہ:

''نثر میں شعری عناصر کے دخل در معقولات سے ابلاغ خیال میں جو دشواریاں پیش آتی تھیں ان کی نظر میں یہ ایک بڑا عیب تھا۔ انھوں نے مقفیٰ و مسجع عبارت کو آورد بتاتے ہوئے کہا کہ اس کی مثال ایسی ہے جیسے کوئی وزنی لٹھے کو رسی سے باندھ کر زوردار آواز کے ساتھ گھسیٹتا لے جا رہا ہو۔ جب کہ اس کے مقابلے میں سادہ نثر برجستہ تھی، جیسے صاف و شفاف پانی رواں دواں ہو۔

پُرتکلف جملے دو چار صفحات لکھ دینا، کچھ بڑی بات نہیں ہے۔ مشکل کام مطلب نگاری ہے۔''[۷]

قدیم اردو نثر کا بہترین نمونہ ملا وجہی کی تصنیف 'سب رس' ہے جو ۱۶۳۵ء میں لکھی گئی۔ یہ اس دور کے طرزِ تحریر کی نمائندگی کرتی ہے۔ مثلاً یہ اقتباس دیکھیے:

''عقل تی پادشاہ عقل تی وزیر
عقل تی دنیا، عقل تی دولت
عقل تی چلتی سلطاناں کی سلطنت
عقل تی رہیا ہے بو عالم کھڑیا
جس میں بھوت عقل وو بھوت بڑا
عقل سوں چلتی خدا کی خدائی
جتنی عقل اتنی بڑائی
عقل نہ ہوتی تو کچھ نہ ہوتا۔''[۸]

''سب رس'' کے بعد نثر کے نام پر صرف بزرگانِ دین کے ملفوظات شاہ رفیع الدین اور شاہ عبدالقادر کے قرآن مجید کے ترجمے، چند ادبی تصانیف اور قدیم داستانیں تھیں جن کا دائرہ محدود تھا۔ عربی و فارسی کی بھرمار قدیم اردو میں اپنی انتہا تک پہنچی ہوئی تھی۔ اس کی عمدہ مثال رجب علی بیگ سرور کی کتاب 'فسانۂ عجائب' ہے۔ اس کی ایک عمارت ملاحظہ ہو:

''بادیہ پیمایان مرحلہ محبت وصحرانوردان منازل مودّت رہ روانِ دشت اشتیاق وطے کنندگانِ جادہ فراق، مسافرانِ بارنا کامی بردوش، بجز راہ کوچہ یار، دین و دنیا فراموش، عشق پر سوار، خود پیادہ، زیست سے دل سیر، مرگ آمادہ لکھتے

ہیں کہ جب بایں ہیئت کذائی، بسے ہوئے شہر کو یہ نظر پریشانی دیکھ آہِ سرد کھینچی، غریب الوطنی پر کمر ہمت چست کی اور فراق یارانِ وطن میں دل کھول کے خوب رویا۔ پھر فاتحہ خیر پڑھ کر آگے بڑھ، توتے کو پنجرے سے کھول دیا۔ گھوڑوں پر شہزادہ اور وزیرزادہ، سمند صبا پر صبا مٹھو پیادہ نیا دانا کھائے، نیا پانی پیتے روانہ ہوتے۔''

سرسید فارسی زدہ اردو کو بھی پسند نہیں کرتے تھے۔ اس بارے میں ان کا خیال تھا کہ:

''اس زمانے میں اور شہر کے لوگوں نے یہ طریقہ اختیار کیا ہے کہ اردو زبان میں یا تو فارسی کی لغت بہت ملا دیتے ہیں اور یا فارسی کی ترکیب پر لکھنے لگتے ہیں۔ یہ دونوں باتیں اچھی نہیں۔ ان سے اردو پن نہیں رہتا، اور ظاہر ہے کہ اس بات کے لیے کہ کس قدر فارسی کی ترکیب دی جائے اور کون کون سی لغت اور زبانوں کی نہ بولی جاویں کوئی قاعدہ مقرر نہیں ہوسکتا۔ یہ بات صرف اہل زبانوں کی صحت پر منحصر ہے۔''[9]

حالاں کہ علی گڑھ تحریک سے قبل فورٹ ولیم کالج جو ایسٹ انڈیا کمپنی کے گورنر جنرل کوئس ویلزلی کے حکم سے کلکتہ میں ۱۸۰۰ء میں قائم ہو چکا تھا، کافی حد تک قدیم اردو کی روایت کو توڑنے کی کوشش کر رہا تھا۔ لیکن چوں کہ یہاں پر زیادہ تر قدیم داستانوں کے تراجم کو ہی مدنظر رکھا گیا جس سے اردو میں علمی نثر کی روایت آگے نہ بڑھ سکی۔ کالج کا مقصد صرف اور صرف ہندوستان میں متعین انگریز ملازمین کو ہندوستان کی دیسی زبان سے واقف کرانا تھا۔ اسی مقصد کے تحت یہاں پر بڑے بڑے مصنّفین کو مامور کیا گیا۔ مثلاً حیدر بخش حیدری، شیر علی افسوس، میر امن، مرزا مظہر علی خاں ولا، کاظم علی جوان، خلیل علی خاں اشک، میر بہادر علی حسینی، نہال چند لاہوری اور للولال جی وغیرہ کی محنت و کاوش سے آسان زبان میں قصے کہانی

کے ترجمے کی ایک نئی روایت کی داغ بیل پڑی۔ کالج کے مصنّفین نے عربی و فارسی کی قدیم داستانوں کو آسان اردو میں منتقل کر دیا۔ مثلاً توتا کہانی، آرائش محفل، بیتال پچیسی، سنگھاسن بتیسی، داستان امیر حمزہ، داستانِ نگار خانۂ چین یا گلزار چین، نثر بے نظیر، اخلاقِ ہندی، مذہب عشق اور مشہور قصہ باغ و بہار وغیرہ۔

میر امن کی باغ و بہار جو میر محمد حسین عطا خاں تحسین کی نوطرز مرصع کی آسان شکل ہے، فورٹ ولیم کالج کی تمام تصانیف میں امتیازی اہمیت کی حامل ہے۔ اس کے اسلوب میں سادگی کے ساتھ ساتھ دل کشی بھی ہے۔ مثلاً یہ اقتباس دیکھیے:

> ''ایک دن وہ بہن (جو بجائے والدہ کے میری خاطر رکھتی تھی) کہنے لگی۔ اے بیرن تو میری آنکھوں کی پتلی اور ماں باپ کی موئی مٹی کی نشانی ہے۔ تیرے آنے سے میرا کلیجہ ٹھنڈا ہوا، جب تجھے دیکھتی ہوں باغ باغ ہوتی ہوں تو نے مجھے نہال کیا، لیکن مردوں کو خدا نے کمانے کے لیے بنایا ہے گھر میں بیٹھے رہنا ان کو لازم نہیں، جو مرد نکھٹو ہو کر گھر سیتا رہتا ہے اس کو دنیا کے لوگ طعنہ مہنا دیتے ہیں۔''[۱۰]

میر امن کی نثر اردو ادب میں مقفیٰ و مسجع تحریر سے نجات حاصل کرنے کی پہلی کوشش تھی، لیکن اس کا دائرہ بھی قصہ کہانی تک ہی محدود تھا۔ سر سید نے میر امن کی کتاب باغ و بہار کے بارے میں اظہار خیال کیا ہے کہ:

> ''میر امن دہلوی نے کوئی کہانی شستہ بول چال میں کہہ دی ہے جو اس سے زیادہ فصیح و دلچسپ و بامحاورہ نہ ہوگی جو ایک پوپلی بڑھیا بچوں کو سلاتے وقت ان کو کہانی سناتی ہے۔ مضمون نگاری دوسری چیز ہے جو آج تک اردو زبان میں نہ تھی۔ یہ اسی زمانے میں پیدا ہوئی اور ابھی نہایت بچپن کی حالت میں ہے،

اگر ہماری قوم اس پر متوجہ رہے گی اور ایشیائی خیالات کو نہ ملائے گی جواب
حد سے زیادہ اجیرن ہو گئے ہیں تو چند روز میں ہماری ملکی تحریریں بھی میکالے
اور ایڈیسن کی سی ہو جائیں گی۔''[۱۱]

اس کے بعد دلّی کالج کی نثر اور غالب کے خطوط میں قدیم انداز نثر کو یکسر ترک کر دینے کا رجحان پایا جاتا ہے۔ غالب نے قدیم القاب و آداب کی پابندی نہ کرتے ہوئے اپنی راہ الگ نکالی۔ مثلاً:

''سید صاحب! نہ تم مجرم نہ میں گناہ گار، تم مجبور میں ناچار۔ لو اب کہانی سنو،
میر سرگذشت میری زبانی سنو۔ نواب مصطفےٰ خاں بہ میعاد سات برس کے قید
ہو گئے تھے، سو ان کی تقصیر معاف ہوئی اور ان کو رہائی ملی۔ صرف رہائی کا حکم
آیا ہے۔ جہاں گیر آباد کی زمین داری اور دلّی کی املاک اور پنشن کے بارے
میں ہنوز کچھ حکم نہیں ہوا۔ ناچار وہ رہا ہو کر میرٹھ ہی میں ایک دوست کے مکان
میں ٹھہرے ہیں۔''[۱۲]

غالب کے یہ خطوط کسی حد تک وارداتِ قلبی، ذہنی افکار اور اس وقت کے حالات کی تصویر کشی کرتے ہیں، اس لیے غالب کی نثر کو مقصدی نثر کے زمرے میں شامل کیا جا سکتا ہے۔

دلّی کالج جو ۱۸۲۵ء میں فارسی اور انگریزی کے علاوہ عربی اور سنسکرت کی کتابوں کے تراجم کے لیے قائم ہوا، لیکن اس کا اہم مقصد ہندوستانیوں کو جدید سائنس اور ٹکنالوجی سے آشنا کرانا تھا۔ اس لیے یہاں ریاضی، ہیئت، جغرافیہ اور سائنس کی تعلیم اردو زبان میں ہی دی جاتی تھی۔ یہاں پر رامائن، مہابھارت، دھرم شاستر، لیلاوتی، شکنتلا اور رگھوونش وغیرہ اہم کتابوں کے ترجمے کیے گئے۔ اس کالج نے بھی زبان و ادب کی بیش قیمت خدمت انجام دی، لیکن چوں کہ اس کا دائرہ بھی تراجم کی حد تک محدود تھا اس لیے اس نے بھی اردو زبان و ادب کا معیار علمی حیثیت سے قائم نہیں کیا۔

فورٹ ولیم یا دلّی کالج نے اس قدیم انداز کو تو ترک کر دیا، لیکن یہاں خالص تجربات، وارداتِ قلبی، مدعا نویسی، ادب میں فکر و ذہن، طرزِ ادا، اسلوب و بیان، قومی مفاد اور اجتماعی افکار زندگی کے مسائل، شخصی مسائل، زمانے کی پیچیدگیاں اور حقیقت نگاری وغیرہ کو موضوعِ بحث نہیں بنایا گیا۔ ان دونوں اداروں اور ان سے وابستہ مصنّفین کا کارنامہ صرف یہ ہے کہ انھوں نے قدیم موضوع کو نئے طرز بیان سے روشناس کرایا اور پر تکلف اسالیب فارسی سے اردو نثر کو آزاد کراتے ہوئے اسلوب میں جدید رجحانات کے لیے راہ ہموار کر دی۔

لیکن با قاعدہ اور منظّم طریقے پر قدیم روایت سے اجتناب کرتے ہوئے ایک ایسی سادہ اور عام فہم زبان کی ضرورت تھی جس میں ہر قسم کے خیالات اور مضامین آسانی سے ادا کیے جا سکیں۔ اس مقصد کو کامیاب بنانے میں علی گڑھ تحریک نے اہم رول ادا کیا۔ اس نے اردو نثر کا سنجیدہ اور متوازن معیار قائم کر کے اسے شاعری کے مقفیٰ و مسجع اسلوب سے نجات دلا کر سادگی اور متانت کی روش پر آمادہ کیا۔ ادب میں ایسے جدید رجحانات پیدا کیے جنھوں نے ماورائی تصورات، تقلید اور نقل و روایات کے بجائے، مادیت، افادیت، عقلیت، زندگی کا اجتماعی تصور، زمانے کے تقاضوں پر غور و فکر، مسائل حاضری کو حل کرنے کے طور طریق، ادب میں فکر و ذہن، طرزِ ادا اور اسلوب ہر لحاظ سے جدت اور وسعت پیدا کی۔ اس طرح اردو ادب قومی مفاد اور اجتماعی افکار کا وسیلہ اور زندگی کا ترجمان بن گیا۔

علی گڑھ تحریک کے انھیں اہم رجحانات نے اردو ادب میں پہلی بار مقصدی و افادی ادب کو فروغ دے کر اجتماعی تصورات سے آشنا کیا۔ اس تحریک کے ذریعہ اردو ادب کا دائرہ موضوع اور اسلوب دونوں کے لحاظ سے وسیع ہوتا گیا۔ تحقیق، تنقید، صحافت، تاریخ، ناول، افسانہ، مکالمہ نگاری، مضمون نگاری، انشائیہ نگاری، مذہب و سیاست، تہذیب و معاشرت، عقل و حکمت، مادیت و روحانیت اور سیر و سوانح جیسے گوناگوں موضوعات اور اصناف کی ترویج اور ان کے فروغ کے امکانات علی گڑھ تحریک کے ذریعہ ہی

پیدا ہوئے۔ اسلوب کی سطح پر سادگی، سلاست، صفائی، روانی اور تاثیر کی کیفیت نمایاں ہوئی۔ اس تحریک نے ادب کو تصورات کی دنیا سے نکال کر اس کا رشتہ براہِ راست زندگی سے جوڑ دیا۔ بقول پروفیسر خلیق احمد نظامی:

''سرسید نے علم کے پرانے تصور کو بالکل رد کر دیا تھا ان کے ذہن میں علم قومی ترقی کا راستہ اور معاشی بہبود کا ایک ذریعہ تھا۔ وہ چاہتے تھے کہ علم ایک ''ذہنی عیاشی'' نہ ہو، بلکہ سماج کی بہتری اس کا نصب العین اور مطمح نظر ہو۔'' [۱۳]

سرسید کے نزدیک اردو ملک کی بول چال کی زبان تھی۔ سرسید اردو کے سب سے بڑے محسن، خیر خواہ اور دل دادہ تھے۔ انھوں نے ہمیشہ اس کو ترقی دینے کی کوشش و ترویج کی۔ انھیں یقین تھا کہ:

''تمام ہندوستان میں اردو زبان اسی طرح سمجھی اور بولی جاتی ہے جیسے تمام یورپ میں فرنچ، بلکہ اس سے بھی زیادہ مروج ہے۔'' [۱۴]

سرسید نے ۲۰ ستمبر ۱۸۶۷ء کو بنارس میں فتح نرائن سنگھ بہادر کے مکان پر خطاب کرتے ہوئے کہا کہ:

''میں اپنی زبان سے وہ مراد لیتا ہوں جو کسی ملک میں اس طرح پر مستعمل ہو کہ ہر شخص اس کو سمجھتا ہو اور وہ اس میں بات چیت کرتا ہو۔ خواہ وہ اس ملک کی اصلی زبان ہو یا نہ ہو، اور اپنی زبان پر میں ورنیکلر کے لفظ کا استعمال کرتا ہوں۔'' [۱۵]

اردو زبان سرسید کو بہت عزیز تھی، اتنی عزیز کہ جب انگریزوں کے دورِ حکومت میں برادرانِ وطن کی جانب سے اس کی جگہ ہندی کو عدالتی زبان بنانے کی مانگ کی گئی تو سرسید نے اس مطالبہ پر سخت ناپسندیدگی کا اظہار کیا اور اردو کے دفاع میں سارا زورِ قلم صَرف کر دیا۔ ان کا آخری مضمون جو ان کی وفات سے نو دن قبل ۱۹ مارچ ۱۸۹۸ء کو علی گڑھ انسٹی ٹیوٹ گزٹ میں شائع ہوا، اسی نوعیت کا تھا۔ ان دنوں وہ

خاصے پریشان تھے، ان کی نجی زندگی تلخ ہوکر رہ گئی تھی لیکن اس عالم میں بھی وہ اپنی زبان کے خیال سے غافل نہ تھے۔ انھوں نے موضوع زیر بحث پر مخصوص انداز میں روشنی ڈالتے ہوئے لکھا تھا کہ:

''نہایت آسان طریقہ اس بات کے دریافت کرنے کا کہ کون سی زبان اور کون سے حروف عام طور سے رائج ہیں، یہ ہے کہ دریافت کیا جائے کہ ملک میں کتنے اخبار ہیں جو اردو زبان اور اردو حروف میں چھپتے ہیں اور کتنے اخبار ایسے ہیں جو ہندی زبان اور ناگری حروف میں چھپتے ہیں اور اردو کی کس قدر کتابیں اور رسالے ہر سال اردو میں چھاپے جاتے ہیں اور کس قدر رسالے اور کتابیں ہندی اور ناگری حرفوں میں چھاپی جاتی ہیں۔ پس اگر یہ معلوم ہو کہ اردو زبان میں اخبار اور کتابیں اور رسالے کثرت سے چھپتے ہیں تو یہ کافی ثبوت اس بات کا ہے کہ عام زبان اور عام حروف جو ملک میں رائج ہیں وہ اردو زبان اور اردو حروف ہیں۔ ایک اور ذریعہ اس بات کے دریافت کرنے کا کہ کون سی زبان اور کون سے حروف ملک میں عام طور پر رائج ہیں۔ سرکاری ڈاک خانہ ہے جس سے معلوم ہوسکتا ہے کہ جس قدر خطوط ڈاک میں پڑتے ہیں ان میں کس قدر اردو کے ہوتے ہیں اور کس قدر ناگری کے۔''[۱۶]

سرسید کی تحریروں سے اندازہ لگایا جاسکتا ہے کہ وہ اردو کے کس قدر حامی تھے۔ انسٹی ٹیوٹ گزٹ کے قارئین کو مسرت کے ساتھ یہ اطلاع دیتے ہیں کہ:

''بندہ نے الہ آباد سے بمبئی تک کہا گاؤں میں کہا جو کہا میں اور کہا ریل پر اور کہا گورنمنٹ کے اہلِ کاروں اور ہر ایک محکمہ کے چپراسیوں اور ہر ایک جگہ کے قلیوں سے اردو میں گفتگو کی، سب لوگ ہر جگہ بہ خوبی سمجھتے تھے اور اردو ہی میں جواب دیتے تھے۔''[۱۷]

اپنے ایک مراسلہ میں لکھتے ہیں کہ:

''الحمدللہ کہ عدن تک تو اردو زبان کی شہنشاہی قائم ہے۔''[۱۸]

''ان کی محبت اندھی نہیں تھی، تعقل کی ڈور سے بندھی ہوئی تھی۔ انھوں نے اس کے شعری و ادبی سرمائے کا ایک محتسب کی نظر سے جائزہ لیا۔ کھرے اور کھوٹے کو پرکھا، اور بے باکی سے اپنے تاثرات کا اظہار کیا۔ زبان کی ترقی میں حائل رُکاوٹوں کو محسوس کیا اور ان کا حل ڈھونڈا، خامیوں پر روشنی ڈالی اور ان کا مداوا چاہا، ضرورتوں کو محسوس کیا اور انھیں پورا کرنے کی حتی المقدور کوشش کی، خود بھی کام کیا دوسروں سے بھی کام لیے۔''[۱۹]

سرسید کا خیال تھا کہ دیسی زبان میں تعلیم کا حصول زیادہ آسان ہے۔ انھوں نے سوسائٹی کے ایک جلسے میں اپنے نقطۂ نظر کی وضاحت کرتے ہوئے کہا کہ:

''مناسب ہے کہ علم کو ایسی شے ٹھہراؤ جس سے ہر روز فائدہ حاصل ہو اور اس کی تحصیل میں جہاں تک ممکن ہو آسانی ہو۔ یہ سب میری خواہش ہیں اور اس لیے میں ملکی زبان کے ذریعہ علم پہنچانے کے لیے حد سے زیادہ ترجیح دیتا ہوں، کیوں کہ وہ آسان ہے اور جو علم اس کے ذریعہ سے پہنچتا ہے وہ عملی طور پر بہت موثر ہوتا ہے اور اس کے وسیلے سے علم کثرت سے پھیلتا ہے۔''[۲۰]

انگلستان سے واپس آکر سرسید کا سب سے پہلا مشن تہذیب الاخلاق کے ذریعہ معاشرتی اصلاح اور نئی اردو نثر کی بنیاد ڈالنا تھا۔ تہذیب الاخلاق کے ذریعہ آسان زبان کو فروغ ملا۔ ہر طرح کے موضوعات پر طبع آزمائی کا رجحان عام ہوا اور سب سے اہم بات یہ کہ اس نے نثر لکھنے والوں کی ایک بڑی جماعت تیار کردی۔ بقول محی الدین قادری زور:

''تہذیب الاخلاق کا جاری ہونا اردو نثر اور اس کے اسالیب بیان کے سمند ترقی کے لیے ایک تازیانہ تھا۔''[۲۱]

سرسید کہا کرتے ہیں کہ:

''تہذیب الاخلاق کا پرچہ ابتدا میں اسی واسطہ جاری کیا گیا تھا کہ ہندوستانیوں کے دل جو مردہ ہو گئے ہیں، ان میں کچھ تحریک لائی جاوے۔''[۲۲]

سرسید لکھتے ہیں کہ:

''جہاں تک ہم سے ہوسکا ہم نے اردو زبان کے علم ادب کی ترقی میں اپنے ان ناچیز پرچوں کے ذریعے سے کوشش کی۔ مضمون کے ادا کا ایک سیدھا اور صاف طریقہ اختیار کیا۔ جہاں تک ہماری کچ مچ زبان نے یاری دی، الفاظ کی درستی، بول چال کی صفائی پر کوشش کی۔ رنگینیٔ عمارت سے جو تشبیہات اور استعارات خیالی سے بھری ہوئی ہے اور جس کی شوکت صرف لفظوں ہی لفظوں میں رہتی ہے اور دل پر اس کا کچھ اثر نہیں ہوتا پرہیز کیا۔ تک بندی سے جو اس زمانے میں مقفیٰ عبارت کہلاتی تھی، ہاتھ اٹھایا۔ جہاں تک ہوسکا سادگیٔ عبارت پر توجہ کی۔ اس میں کوشش کی کہ جو کچھ لطف ہو وہ صرف مضمون کے ادا میں ہو جو اپنے دل میں ہو وہی دوسرے کے دل میں پڑے تا کہ دل سے نکلے اور دل میں بیٹھے۔ ہم کچھ نہیں کہہ سکتے کہ ہماری کوشش کہاں تک کارگر ہوئی اور ہمارے ہم وطنوں نے اس کو کس قدر پسند کیا۔ مگر اتنی بات ضرور دیکھتے ہیں کہ لوگوں کے خیالات میں ضرور تبدیلی آ گئی ہے اور اس کی طرف لوگ متوجہ بھی معلوم ہوتے ہیں۔ اخباروں کی عبارتیں نہایت عمدہ اور صاف ہوتی

جاتی ہیں۔ وہ پہلا ناپسند طریقہ ادا سے مضمون کا بالکل چھوٹتا جاتا ہے۔ بھاری بھاری لفظوں اور موٹے موٹے لغتوں سے اردو زبان کا خون نہیں کیا جاتا۔ صفائی اور سادگی روز بروز عبارتوں میں پڑھی جاتی ہے۔ خیالات بھی بالکل بدلے ہوئے ہیں۔ نہایت کم اخبار ایسے ہوں گے جن میں ہر ہفتہ کوئی نہ کوئی آرٹیکل عمدہ و سلیس عبارت میں کسی نہ کسی مضمون پر نہ لکھا جاتا ہو۔'' [۲۳]

حالاں کہ اس سے پہلے سرسید کی ابتدائی تصنیفات کا مطالعہ کرنے سے ہی یہ بات واضح ہوجاتی ہے کہ سرسید شروع سے ہی قدیم ادب کے روایتی نظام کو تبدیل کرنے کی کوشش کررہے تھے۔ آثارالصنادید کے پہلے ایڈیشن میں انھوں نے روایتی انداز اختیار کیا، جس کا اندازہ مندرجہ ذیل اقتباس سے لگایا جاسکتا ہے۔ پہلے ایڈیشن میں مسجد اکبرآبادی کا ذکر یوں کیا گیا ہے:

''اسی بازار میں یہ ایک مسجد ہے، دل کش و دل ربا، فرحت بخش و روح افزا، سر سے پاؤں تک سنگ سرخ کی اور گرداس کے مکانات اور حجرہ طالب علموں کے رہنے کے لیے بنے ہوتے ہیں۔ ضلع عربی سے ملحق کرسی دے کر یہ مسجد بنائی ہے جس کی رفعت وشان کے آگے گنبد خضرا پست ہے اور جس کی عظمت و جلال کے آگے ملا اعلیٰ گرد ہے۔ اس مسجد فیض بنیاد کو اعزاز النساء بیگم بیوی شہاب الدین محمد شاہ جہاں نے ۱۰۶۰ھ میں مطابق ۲۴ جلوس کے بنائی ہے۔ ان بیگم کا خطاب اکبرآبادی محل تھا۔ اس سبب سے یہ مسجد بھی اکبرآبادی مسجد مشہور ہوگئی ہے۔ اس مسجد کے تین برج اور سات در ہیں۔ مسجد کی عمارت تریسٹھ گز طول میں اور سترہ گز عرض میں نری سنگ سرخ اور اس کا پیش طاق سنگ مرمر کا پرچین کار ہے اور اس کے آگے ایک چبوترہ ہے۔ تریسٹھ گز طول

اور ستاون گز کے غرض سے ساڑھے تین گز کا اونچا اور اس پر سنگ سرخ کا کٹہرا لگا ہوا ہے اور اس کے آگے ایک حوض ہے بارہ سے بارہ گز کا کہ چشمۂ آفتاب و مہتاب پر شرف لے جاتا ہے۔'' [۲۴]

عمارت کی شان وشوکت کے اظہار کے لیے کئی مبالغہ آمیز جملے اور فقرے استعمال کیے گئے ہیں مثلاً دل کش و دل ربا، فرحت بخش و روح افزا..... چمن کی رفعت وشان کے آگے گنبد خضرا پست ہے، اور جس کی عظمت وجلال کے آگے ملا اعلیٰ گرد ہے۔ حوض کے بارے میں بتایا گیا ہے کہ چشمۂ آفتاب ومہتاب پر شرف لے جاتا ہے۔ چنانچہ اسی مسجد کا نقشہ اشاعتِ ثانی (دوسرے ایڈیشن) میں اس طرح پیش کیا ہے کہ:

''شہر شاہ جہاں آباد کے فیض بازار میں یہ مسجد واقع ہے۔ نواب اعزاز النساء بیگم عرف اکبر آبادی بیگم زوجہ شاہ جہاں بادشاہ نے ۱۰۶۰ھ مطابق ۱۶۵۰ء کے یہ مسجد بنائی اس مسجد کے تین برج اور سات در ہیں۔ مسجد کی عمارت تریسٹھ گز لمبی اور سترہ گز چوڑی نری سنگ سرخ کی ہے۔ اس کا پیش طاق نرا سنگ مرمر کا نہایت پرچین کار ہے۔ اس کے آگے ایک چبوترہ ہے سنگ سرخ کا کٹہرے دار تریسٹھ گز لمبا اور ستاون گز چوڑا، اور ساڑھے تین گز کا اونچا اس کے آگے سنگ سرخ کا ایک حوض ہے۔ مسجد کا صحن ایک سو چوّن گز لمبا اور ایک سو چار گز چوڑا ہے اور اس کے گرد طالب علموں کے رہنے کے لیے حجرے بنے ہوئے ہیں۔'' [۲۵]

لہٰذا اس اشاعت میں انھوں نے مبالغہ آمیز الفاظ، تراکیب اور جملوں سے کافی حد تک گریز کیا ہے۔ سرسید کا خیال ہے کہ:

''کلام میں جس چیز کی نہایت توصیف کی جاتی ہے وہ صرف یہی نہیں ہے کہ وہ

پیچیدہ مضامین بیان کیے جاویں اور آدمی کو پہاڑ اور پہاڑ کو آدمی بنا جاوے اور چھوٹے مبالغہ سے اصل مطلب کو بھی خبط کر دیا جاوے، بلکہ حقیقت خوبی یہ ہے کہ غم کا ذکر ہو تو بسنے والوں کے دل پر غم اور چشم پُرنم ہو جاوے۔ خوشی کا ذکر ہو تو روتے ہوئے ہنس پڑے۔ اگر میدانِ کارزار کا ذکر ہو تو نامرد بھی مرد بن جاویں اور اگر سخاوت کا ذکر ہو تو بخیل بھی دریا دل ہو جاویں۔ غرض کہ ہر مضمون کی صورت بن جاوے، کیوں کہ حقیقت میں فصاحت جس چیز سے عبارت ہے صرف ایسے مناسب اور نرم الفاظ کے استعمال کرنے کا نام ہے جو خود بخود سننے والے کے دل میں بیٹھ جاویں اور بلاغت جو چیز ہے وہ صرف مقتضائے حال کے موافق کلام کرنے کا نام ہے اور جب ان دونوں باتوں کو ایک کلام میں جمع کیا جاوے تو پھر یقیناً یہ بات میسر ہوگی کہ ذکر غم بہ صورت غم اور ذکر خوشی بہ صورت خوشی معلوم ہونے لگے گا۔''[۲۶]

لیکن جلد ہی سہل و سلیس زبان اختیار کر کے روایتی اسلوب کو خیر باد کہا۔ انھوں نے اپنی تمام تحریروں میں قدیم ادب کی خامیوں کا ذکر کیا ہے۔ ایک مضمون میں لکھتے ہیں کہ:

''زمانہ اور زمانہ کی طبیعت علوم اور علوم کے نتائج سب تبدیل ہو گئے ہیں۔ ہمارے ہاں کی قدیم کتابیں اور ان کا طرز بیان اور ان کے الفاظ مستعملہ ہم کو آزادی اور راستی اور صفائی اور سادہ پن اور بے تکلفی اور بات کی اصلیت کو پہنچنا ذرا بھی تعلیم نہیں کرتے، بلکہ برخلاف اس کے دھوکے میں پڑنا اور پیچیدہ بات کہنا اور ہر بات کو نون مرچ لگا دینا اور ہر امر کی نسبت غلط اور خلاف واقع الفاظ شامل کر دینا اور جھوٹی تعریف کرنا سکھاتے ہیں۔''[۲۷]

سرسید کا کہنا تھا کہ:

''جو کچھ لطف ہو وہ مضمون میں ہو، اگر مضمون میں لطف نہ ہوگا تو اس کے ادا کرنے میں آپ سے آپ لطف پیدا ہو جائے گا۔''[۲۸]

مبالغہ کی مذمت کرتے ہوئے وہ لکھتے ہیں:

''جس طرح کہ لائق شاعر دوسروں کی تعریف کرتے ہیں کہ ان اشعار سے ان لوگوں کا نام باقی رہتا ہے جن کی وہ تعریف کرتے ہیں، اور شاعری کی خوبی سے خود ان شاعروں کا نام بھی دنیا میں باقی رہتا ہے۔ دونوں شخص خوش ہوتے ہیں ایک انہی لیاقت کے سبب اور دوسرا اس لیاقت کو تمیز کرنے کے سبب سے، مگر لیاقت شاعری کی یہ ہے کہ وہ نہایت بڑے استاد مصور کی مانند ہو کہ وہ اصل صورت اور رنگ اور خال وخط کو بھی قائم رکھتا ہے، اور پھر یہی تصویر ایسی بناتا ہے کہ خوش نما معلوم ہو۔ ایشیا کے شاعروں میں ایک بڑا نقص یہی ہے کہ وہ اس بات کا خیال نہیں رکھتے بلکہ جس کی تعریف کرتے ہیں اس کے اوصاف ایسے جھوٹے اور ناممکن بیان کرتے ہیں جن کے سبب سے وہ تعریف نہیں رہتی بلکہ فرضی خیالات ہو جاتے ہیں۔''[۲۹]

حالؔی نے اسی خیال کو اپنے لفظوں میں یوں پیش کیا ہے:

''مدح میں اکثر نام کے سوا کوئی خصوصیت ایسی مذکور نہیں ہوتی جو ممدوح کی ذات کے ساتھ مختص ہو، بلکہ ایسے حاوی الفاظ میں مدح کی جاتی ہے کہ اگر بالفرض مداح اس علت میں کہ فلاں شخص کی مدح کیوں کی؟ عدالت میں ماخوذ ہو جائے تو قصیدہ میں کوئی لفظ ایسا نہ ملے جس سے اس کا جرم ثابت ہو سکے۔

مدح میں زیادہ تر وہی معمولی محامد بیان ہوتے ہیں جو قدیم سے شعرا باندھتے چلے آئے ہیں، اور ہر ایک خوبی کے بیان میں مبالغہ کیا جاتا ہے کہ قصیدہ کا مصداق نقش الامر میں کوئی انسان قرار نہیں پا سکتا۔''[۳۰]

اس لحاظ سے کہا جاسکتا ہے کہ سرسید نے ادب میں خلوص، دیانت داری، صداقت اور افادیت کا رنگ بھرنے کی کوشش کی۔ اس سے ان کی علمی صلاحیت، ادبی رجحانات، سیاسی نظریات اور تہذیبی و اخلاقی سرگرمیوں کا پورا پورا اندازہ ہوتا ہے:

''اردو زبان کا علم ادب جدید خیالات اور موٹے اور بھدے الفاظ کا مجمع ہو رہا ہے، اس میں بھی جہاں تک ہم سے ہوسکا ہم نے اصلاح چاہی۔ یہ ہم نہیں کہہ سکتے کہ ہم نے اس میں کچھ کیا مگر ہاں یہ کہہ سکتے ہیں کہ ہم نے اپنی دانست میں ان باتوں میں بہ قدر اپنی طاقت کے کوشش کی۔ قومی ہمدردی، قومی عزت، سلف آنر یعنی اپنے آپ عزت کا خیال اگر ہم نے اپنی قوم میں پیدا نہیں کیا تو ان لفظوں کو تو اردو کے علم ادب میں داخل کیا۔ ہم نے کچھ کیا ہو یا نہ کیا ہو مگر ہر طرف سے تہذیب و شائستگی کا غلغلہ سنا۔ قومی ہمدردی کی صداؤں کا ہمارے کانوں میں آنا، اردو زبان کے علم ادب کا ترقی پانا، یہی ہماری مرادیں تھیں جن کو ہم نے بھر پایا۔''[۳۱]

بقول شبلی:

''سرسید کی انشا پردازی کا سب سے بڑا کمال یہ ہے کہ ہر قسم کے مختلف مضامین پر کچھ نہ کچھ بلکہ بہت کچھ لکھا ہے اور جس مضمون کو لکھا ہے اس درجہ پر پہنچا دیا ہے کہ اس سے بڑھ کر ناممکن ہے۔ فارسی اور اردو میں بڑے بڑے

شعرا اور نثار گزرے ہیں لیکن ان میں ایک بھی ایسا نہ تھا جو تمام قسم کے مضامین کا حق ادا کر سکتا۔'' [۳۲]

اس حقیقت سے انکار نہیں کیا جا سکتا کہ:

''اردو میں قومی شاعری کا تصور سرسید کا فیضان ہے۔ حالی، شبلی، نذیر احمد، خوشی محمد ناظر، ظفر علی خاں، محمد علی وغیرہ کی قومی نظموں کا اصل محرک سرسید تھے۔ بعد کو اسی قومی شاعری نے آزادیٔ وطن کو اپنا مطمح نظر بنا لیا۔ نیچرل شاعری سے قومی شاعری اور قومی شاعری سے آزادیٔ وطن کی شاعری۔ ہر منزل کٹھن تھی اور دشوار گزار، لیکن سرسید نے جو نیا عزم اور حوصلہ پیدا کر دیا تھا۔ اس نے یہ سب منزلیں آسان کر دیں۔ محمد علی جوہر کا یہ شعر:

سکھایا تھا تمھیں نے قوم کو یہ شور و شر سارا　　جو اس کی انتہا ہم ہیں تو اس کی ابتدا تم ہو

سرسید کی تمام کوششوں پر صادق آتا ہے۔''

''اگر سرسید نے اردو شاعری کو گل و بلبل، لب و رخسار، ہجر و وصال کے دھندوں سے نکال کر قومی مسائل کی ترجمانی کی طرف مائل نہ کر دیا ہوتا تو اردو شاعری جنگ آزادی میں وہ گراں قدر حصہ نہ لے پاتی جو اس نے لیا۔ اردو شاعری نے افکار حریت کو عوام تک پہنچایا اور ان کے قلب و جگر کو گرما کر جنگ آزادی کے لیے تیار کیا۔'' [۳۳]

ان ہی دنوں ہالرائیڈ کے ایما پر محمد حسین آزاد نے انجمن پنجاب کے تحت ایک نئے انداز کے مشاعرہ کی بنیاد ڈالی تھی۔ جس میں مصرع طرح کے بجائے شاعروں کو طبع آزمائی کے لیے کوئی عنوان دیا جاتا تھا اور انھیں آزادی ہوتی تھی کہ جس طرح چاہیں اپنے خیالات نظم کریں۔ سرسید نے گرم جوشی سے

اس کا خیر مقدم کیا۔ انھوں نے لکھا کہ: ''اردو زبان کے ادب کی تاریخ میں ۱۸۷۴ء کا وہ دن جب لاہور میں نیچرل پوئٹری کا مشاعرہ قائم ہوا، ہمیشہ یادگار رہے گا۔''[۳۴]

سرسید لکھتے ہیں کہ:

''اگر ہماری قوم اس عہدہ مضمون نیچر کی طرف متوجہ رہے اور ملٹن اور شیکسپیئر کے خیالات کی طرف توجہ فرمائے اور مضامین عشقیہ اور مضامین خیالیہ اور مضامین واقع اور مضامین نیچر میں جو تفرقہ ہے اس کو دل میں بیٹھالے تو ان بزرگوں کے سبب ہماری قوم کی لٹریچر کیسی عمدہ ہو جائے گی، اور ضرور وہ دن آئے گا کہ ہم بھی اپنے قوم کے کسی نہ کسی شاعر پر ایسا ہی فخر کریں گے۔ جیسا کہ یورپ کے لوگ ملٹن اور شیکسپیئر پر ناز کرتے ہیں۔''[۳۵]

سرسید کی حیات میں ہی نظم جدید کا چلن ہو چلا تھا۔ یہ دیکھ کر انھیں کافی خوشی ہوئی، لہٰذا تہذب الاخلاق کے ایک شمارے میں لکھا کہ:

''ہم نے نیچر کی بہت ہائے پکار کی تو اب اس کا قافیہ کیچڑ تو نہیں رہا، بلکہ شاعروں نے اس کی طرف توجہ کی، ہماری زبان کے علم ادب میں بڑا نقصان یہ تھا کہ نظم یونہی نہ تھی۔ شاعروں نے اپنی ہمت عاشقانہ غزلوں اور واسوختوں اور مدحیہ قصیدوں اور بحر کے قطعوں اور قصہ و کہانی کی مثنویوں میں صرف کی تھی۔ ہم یہ نہیں کہتے کہ ان مضامین کو چھونا نہیں چاہتے تھے۔ وہ بھی نہایت عمدہ مضامین میں اور جودتِ طبع و تلاش مضمون کے لیے نہایت عمدہ مفید ہیں، مگر نقصان یہ تھا کہ ہماری زبان میں صرف یہی تھے۔ دوسری قسم کے مضامین جو درحقیقت وہی اصلی مضامین میں اور نیچر سے علاقہ رکھتے ہیں، نہ تھے۔ نظم

کے اوزان بھی وہی معمولی تھے۔ ردیف و قافیہ کی پابندی گویا ذات شعر میں داخل تھی۔ رجز اور بے قافیہ شعر گوئی کو رواج ہی نہیں تھا اور اب بھی شروع نہیں ہوا۔ ان باتوں کے نہ ہونے سے حقیقت میں ہماری نظم صرف ناقص ہی نہ تھی بلکہ غیر مفید بھی تھی۔ مگر نہایت خوشی کا مقام ہے کہ زمانے نے اس کو بھی رفارم کیا اور اہلِ پنجاب اس نقص کے رفع کرنے پر متوجہ ہوئے۔"[۳۶]

سرسید کے ان رجحانات سے اس دور کے جن ادبا و مصنّفین پر دوررس اثرات پڑے، ان میں سرسید کے اہم رفقا بھی پیش پیش نظر آتے ہیں۔ ان ادبا و شعرا کی خدمات سے اردو ادب قدیم اثرات سے آزاد ہو کر نئے سانچے میں ڈھل گیا۔ نئے نئے علمی ادارے قائم ہوئے، ادبی صحافت اور سیاسی ادب کا فروغ ہوا۔ سماجی بیداری سے اردو ادب زندگی کے مقاصد سے ہم کنار ہو کر نئے ولولے اور نئے جوش و خروش سے دوچار ہوا۔

علی گڑھ تحریک سے متاثر ہونے والے ادیبوں اور شاعروں کی فہرست کافی طویل ہے ان میں سے چند اہم نام مندرجہ ذیل ہیں:

(۱) مولانا الطاف حسین حالی (۲) مولانا شبلی (۳) مولوی نذیر احمد

(۴) مولوی چراغ علی (۵) مولوی ذکاءاللہ (۶) نواب محسن الملک

(۷) نواب وقار الملک (۸) مولانا وحید الدین سلیم (۹) نواب عماد الملک

(۱۰) عبدالحلیم شرر (۱۱) نواب صدر یار جنگ (۱۲) ڈاکٹر سر ضیاءالدین

(۱۳) صاحبزادہ آفتاب احمد خاں (۱۴) مولوی عبدالحق (۱۵) مولانا طفیل احمد

(۱۶) مولانا ظفر علی خاں (۱۷) سجاد حیدر یلدرم (۱۸) مولوی عزیز مرزا

(۱۹) مولوی عنایت اللہ (۲۰) مولانا حسرت موہانی (۲۱) رشید احمد صدیقی

(۲۲) عبدالماجد دریابادی (۲۳) غلام السیدین (۲۴) ڈاکٹر عابد حسین

(۲۵) سید ہاشمی فرید آبادی (۲۶) ڈاکٹر ذاکر حسین (۲۷) پروفیسر محمد مجیب

(۲۸) قاضی تلمذ حسین (۲۹) پروفیسر الیاس برنی وغیرہ۔

مولانا ابوالکلام آزاد نے سرسید کے وسیع اثرات کا جائزہ لیتے ہوئے ایک بار کہا تھا کہ:

''مرحوم سرسید اور ان کے ساتھیوں نے علی گڑھ میں صرف ایک کالج ہی قائم نہیں کیا تھا، بلکہ وقت کی تمام علمی اور ادبی سرگرمیوں کے لیے ایک ترقی پسند حلقہ پیدا کر دیا تھا۔ اس حلقہ کی مرکزی شخصیت خود ان کا وجود تھا اور ان کے گرد ملک کے بہترین دماغ جمع ہو گئے تھے۔ ہندوستان کے کسی موقت الشیوع رسالے نے شاید ہی ایسے گہرے اثرات وقت کی دماغی رفتار پر ڈالے ہوں جیسے کہ تہذیب الاخلاق سے مرتب ہوئے۔ ... فی الحقیقت جدید اردو علم و ادب کی بنیاد میں اسی رسالے نے استوار کیں اور اس قابل بنا دیا کہ آج ہر طرح کے علمی اور ادبی مطالبے ادا کرنے کی اس میں صلاحیت پیدا ہو گئی ہے۔ اس عہد کا شاید ہی کوئی قابلِ ذکر اہل قلم ایسا ہو گا جو اس مرکزی حلقے کے اثرات سے متاثر نہ ہوا ہو۔ جدید ہندوستان کے بہترین مسلمان مصنف اسی حلقہ کے زیر اثر پیدا ہوئے اور یہیں نئے قسم کی اسلامی تحقیق و تصنیف کی راہیں پہلے پہل کھولی گئیں۔ اردو کی نئی شاعری کی بنیاد اگرچہ لاہور میں پڑی تھی مگر اس کو نشو و نما یہیں کی آب و ہوا میں ملی اور محمڈن ایجوکیشنل کانفرنس کے سالانہ جلسوں میں نئی قسم کی نظمیں پڑھی جانے لگیں۔ اردو خطابت کی پہلی درس گاہ یہی تھی، اس دور کے تمام مشہور مقرروں کو اسی حلقہ نے پیدا کیا تھا اور اگر پیدا نہیں کیا تھا تو ان کے لیے پلیٹ فارم یہیں مہیا کیا تھا۔''[۳۷]

سید سلیمان ندوی نے لکھا ہے کہ:

''جب وہ (شبلی) علی گڑھ پہنچے اور سرسید کے کتب خانہ میں عربی تاریخ و جغرافیہ کی وہ نادر کتابیں ان کو نظر آئیں جو یوروپ یا مصر و شام اور قسطنطنیہ میں چھپی تھیں تو ان کی آنکھیں کھل گئیں اور یہیں سے تاریخ اسلام کے مطالعہ کا نیا دور شروع ہوا۔''[۳۸]

شبلی کا پہلا مضمون ''مسلمانوں کی گذشتہ تعلیم'' ۱۸۸۷ء میں ایجوکیشنل کانفرنس کے اجلاس منعقدہ لکھنؤ میں پیش کیا گیا تھا۔ سرسید نے اس زمانے میں اہلِ علم حضرات کو تعلیمی مسائل لکھنے کی دعوت دی تھی۔

شرر کا بیان ہے کہ:

''اب سید صاحب کی توجہ دلانے سے وہ (مولانا شبلی) تاریخی تحقیق و تنقید میں مصروف تھے۔''[۳۹]

المامون پر سید نے دیباچہ لکھا اور اپنے دوست مخدوم اور ہمارے مدرسۃ العلوم کے پروفیسر مولانا محمد شبلی نعمانی کے کام کی داد دیتے ہوئے کہا:

''مصنف کو کتنے ہزار اوراق تاریخوں کے اُلٹنے پڑے ہوں گے۔''

اور پھر ان کی زبان اور ان کے بیان کی تعریف اس طرح کی:

''ایسی صاف و شستہ اور برجستہ عبارت ہے کہ دلّی والوں کو بھی اس پر رشک آتا ہوگا۔''[۴۰]

حالی نے شبلی کے بارے میں کہا تھا کہ:

ادب اور مشرقی تاریخ کا ہو دیکھنا مخزن
تو شبلی سا وحید عصر و یکتائے زمن دیکھیں[۴۱]

شبلی کا عظیم الشان کارنامہ ''سیرت النبی'' ہے۔ مولانا سید سلیمان ندوی کا بیان ہے کہ:

''اسی زمانہ میں علی گڑھ کالج کے دینیات کے لیے سرسید نے مولانا شبلی مرحوم سے عربی میں سیرت النبی پر ایک مختصر رسالہ لکھوایا تھا جس کا نام تاریخ بدر اسلام ہے۔''[۴۲]

''مولوی عبدالحق بابائے اردو (۱۸۷۱ء۔۱۹۶۱ء) نے سرسید کی صحبت سے اردو کی محبت کا وہ جذبہ پایا تھا جس نے عمر بھر ان کے پیکر خالی کو گرمائے رکھا۔ علی گڑھ، دکن، دہلی اور کراچی ہر جگہ انھوں نے اپنے کام کے نہ مٹنے والے نقوش چھوڑے۔ اردو کے لیے جو انتھک کوششیں کیں اور جس طرح گیسوئے اردو کو سنوارنے کے لیے اپنی زندگی کا سارا آرام اور اپنی عمر کی ساری کمائی تج دی، اس کی دوسری مثال نہیں ملتی۔ انھوں نے اردو کے سلسلے میں سرسید کے ناتمام کام کی تکمیل کی اور اردو کو ایک زبان کی حیثیت سے موثر اور موقر مقام پر پہنچا دیا۔ مولوی عبدالحق نے قدیم اردو ادب کے مخطوطات کو ایڈٹ کیا، متعدد اردو اور فارسی تذکرے تلاش کر کے شائع کیے، مختلف فنون پر متعدد رسائل جاری کیے، اردو کی مستند لغتیں مرتب کیں اور اردو صرف و نحو کے قواعد منضبط کیے۔ ان کی مرقع نگاری نے اردو ادب میں معروضی کردار نگاری کی بنیاد ڈالی۔ مرہٹی زبان پر فارسی کا اثر اور اردو کے نشو و نما میں صوفیا اکرام کا کام دکھا کر تلاش و تحقیق کی نئی راہیں کھولیں۔ حقیقت میں ان کی حیثیت ایک تحریک اور ایک ادارہ کی ہو گئی تھی۔ جامعہ عثمانیہ کے قیام کے لیے جدوجہد اور پھر وہاں پر مضمون میں اردو کے بہترین اساتذہ جمع کرنے کا کام انہی کی کوشش سے انجام پایا۔''[۴۳]

''مولانا حسرت موہانی (۱۸۸۱ء۔۱۹۵۱ء) کی علمی شہرت کا بیش تر انحصار ان کے شاعرانہ کمالات پر ہے۔لیکن حقیقت یہ ہے کہ انھوں نے ادب اور تنقید کی بھی جو خدمات انجام دیں ہیں وہ نا قابلِ فراموش ہیں۔انھوں نے ''متروکاتِ سخن، معائب سخن، محاسن سخن'' لکھ کر اردو میں تنقید کے معیار اور اصول قائم کیے۔ شرح دیوان غالب میں انھوں نے مطالعہ کے لیے نئی راہیں کھولیں۔قدیم اردو شعرا مثلاً اشرف، جرأت، حاتم، سوز، شیفتہ، قائم، مصحفی، میر حسن وغیرہ کے دیوان تلاش کر کے شائع کیے۔ان کے رسالے ''اردوئے معلیٰ'' اور اخبار ''مستقل'' نے کافی شہرت حاصل کی۔''[۴۴]

مولانا محمد علی (۱۸۷۸ء۔۱۹۳۱ء) یہ انگریزی اور اردو دونوں زبانوں میں لکھتے تھے۔ انھوں نے نثر و نظم دونوں میں اپنے گراں مایہ کارنامے انجام دیے۔انگریزی میں ان کے رسالے 'کامریڈ' کی انگلستان تک میں شہرت تھی۔اردو میں ان کا اخبار ہمدرد اپنے زمانے میں بااثر اور موقر جریدہ سمجھا جاتا تھا۔ان کی غزلیں اور نظمیں پُر تاثیر اور جاندار ہیں۔

مولوی عبدالحق نے ان کی علمی خدمات کا ذکر کرتے ہوئے لکھا ہے کہ:

''وہ انگریزی کا بہت بڑا ادیب، زبردست انشا پرداز اور اعلیٰ درجہ کا مقرر تھا، لیکن جب لکھنے اور بولنے پر آجاتا تو اعتدال اور تناسب دونوں نظروں سے اوجھل ہو جاتے تھے اور انمول جواہر پاروں کے ساتھ کنکر اور روڑے بھی بے تکلف چلے آتے تھے۔''[۴۵]

سجاد حیدر یلدرم ۱۹۲۰ء میں مسلم یونیورسٹی کے پہلے رجسٹرار مقرر ہوئے۔ابتدائی زمانے میں ہی انھیں ترکی ادب سے دلچسپی پیدا ہوگئی تھی۔چنانچہ انھوں نے متعدد ترکی ناولوں مثلاً زہرا، مطلوب حسینان،

آسیب، الفت کو اردو میں منتقل کیا۔ اس کے علاوہ محمد حجازی کے ایک فارسی ناول ''ہما خانم'' کو اردو کا جامہ پہنایا۔ دوتر کی ڈرامے جلال الدین خوارزم شاہ اور جنگ و جدل اردو میں منتقل کیے۔ ان کے مضامین اور افسانے خیالستان اور حکایات و احساسات کے نام سے طبع ہو چکے ہیں۔ مولانا سید سلیمان ندوی کا بیان ہے کہ:

''سجاد حیدر یلدرم ہماری زبان و ایک نئی صنف ادب کے جس کو ادب لطیف کہتے ہیں بانی تھے، اور اس لیے ہماری ادبی تاریخ میں ان کا ایک پایہ ہے۔''[۴۶]

عبدالرحمٰن بجنوری کا عظیم الشان کارنامہ ''محاسن کلامِ غالب'' ہے۔ اس میں انھوں نے غالب کے فکر و فن کا دل کش اور عمیق مطالعہ کیا ہے۔ علامہ اقبال ان کی صلاحیتوں کی وجہ سے ان کی کافی قدر و منزلت کرتے تھے۔ ان کی اچانک انتقال کے بارے میں اقبال نے شعیب قریشی کو لکھا کہ:

''افسوس کہ گزشتہ پچاس ساٹھ سال کی تعلیمی کش مکش کے بعد ایک آدمی ہم میں پیدا ہوا تھا جو دل و دماغ و سیرت کے اعتبار سے قدیم حکما اسلام کا نمونہ تھا، مگر مشیت ایزدی نے ہم سے عین اس وقت جدا کر لیا جب کہ اس کی سخت ضرورت تھی۔ شاید مرحوم اپنے وقت سے پہلے پیدا ہوا تھا۔ جس سوسائٹی میں اللہ تعالیٰ نے اسے پیدا کیا تھا وہ اس کی قدر نہ پہچان سکتی تھی! ہندوستان کی اسلامی دنیا میں بہت کم ایسے آدمی ہوں گے جن کو بجنوری کی پوشیدہ قوتوں کا احساس ہوگا، اور کیا عجب کے مرحوم کو خود بھی ان قوتوں کا احساس نہ ہوئیں۔ اگر وہ دس سال ہم میں رہتا تو آنکھیں اس کے کمالات کی آب و تاب سے خیرہ ہو جاتیں۔''[۴۷]

مہدی حسن افادی الاقتصادی یہ بھی سرسید تحریک سے کافی متاثر تھے۔ یہ اکثر کہا کرتے تھے کہ:

''صرف اسی تہذیب الاخلاق نے مجھے آدمی بنا دیا۔''[۴۸]

مہدی حسن افادی کے بارے میں مولانا سید سلیمان ندوی کا خیال ہے کہ:

''وہ ایک سحر نگار ادیب اور ایک خاص طرز انشا کے موجد تھے اور ادب و انشا، ذوق سلیم رکھنے والے افراد مدتوں میں پیدا ہوتے ہیں۔''[۴۹]

''وہ مروجہ روش سے ہٹ کر بات کرتے تھے، سماجی یا اخلاقی قیود سے ڈر کر اپنے تاثرات کے اظہار میں ذرّہ برابر ہچکچاہٹ پیدا نہ ہونے دیتے تھے۔ ان کے یہاں عرفانِ محبت بھی ہے اور نیرنگیِ حسن کی داد دینے کی صلاحیت بھی۔ ان کے مضامین کا مجموعہ افاداتِ مہدی اور مکتوباتِ مکاتیب مہدی کے نام سے طبع ہو چکے ہیں۔''

مولانا عبدالماجد دریا آبادی ان کی علمی صلاحیتوں کا ذکر کرتے ہوئے لکھتے ہیں کہ:

''نئی نئی ترکیبیں گھڑنے اور انگریزی سے اردو میں نئے نئے لفظ ایجاد و اختراع کرنے میں مرحوم کو ایک حد تک ملکہ تھا اور کہیں علمی استعداد مولانا نذیر احمد دہلوی کی سی ہوتی یا لسانیات اور زبان دانی سے مناسبت محمد حسین آزاد کی سی تو مہدی حسن اسی میدان میں سب سے بازی لے جاتے اور اپنے معاصرین کو کہیں پیچھے چھوڑ جاتے۔ پھر جتنا کچھ وہ کر گئے وہ بہت سے پیشہ ور مستند مصنّفین کے لیے بھی باعثِ رشک ہی ہو سکتا ہے۔''[۵۰]

متاثرین میں محفوظ علی بدایونی، محمد داؤد عباسی، عزیز مرزا، خواجہ غلام الثقلین، سر رضا علی اور حبیب اللہ خاں کے نام بھی سرفہرست ہیں۔

محفوظ علی بدایونی اپنے دور کے نامور ادیب، علی گڑھ منتھلی، اولڈ بوائے، دکن ریویو، نقیب اور ہمدرد کے مشہور لکھنے والوں میں تھے۔

داؤد عباسی بذلہ سنج، شگفتہ مزاج، شاعرانہ صلاحیتوں کے مالک اور فی البدیہہ شعر کہنے والوں میں تھے۔

خواجہ غلام الثقلین نے اصلاح تمدن کے لیے ایک رسالہ عصر جدید جاری کیا اور متعدد مضامین لکھے۔ مولوی عبدالحق کا بیان ہے کہ:

''انھوں نے جگہ جگہ جا کر لکچر دیے اور تقریریں کیں اور مسلمانوں میں اصلاح معاشرت کی ہلچل پیدا کر دی۔''[۵۱]

سر رضا علی کی زندگی علمی نہیں ہے لیکن ان کی ادیبانہ صلاحیتیں ان کی آپ بیتی، اعمال نامہ سے ظاہر ہوتی ہیں۔

حبیب اللہ خاں کا آخر دم تک علی گڑھ سے گہرا تعلق رہا۔ انھوں نے علی گڑھ کے مختلف تعمیری اور تنظیمی کاموں میں حصہ لیا تھا۔ ان کی لکھی ہوئی صاحب زادہ آفتاب احمد خاں کی سوانح حیات (حیاتِ آفتاب) علی گڑھ کے ممتاز اور سرگرم کارکن کی زندگی کا مرقع ہے جو بڑی محنت سے تیار کیا گیا ہے۔

نواب احمد سعید خاں صاحب چھتاری کی خودنوشت سوانح عمری ''یادِ ایام'' یونیورسٹی کے دور اوّل کی بہت سی یادوں کو تازہ کر دیتی ہے۔

مولانا اقبال احمد خاں سہیل، ان کی سادہ زندگی اور ذہن رسا نے ان کو وہ امتیاز بخشا تھا جو معاصرین میں کسی کو حاصل نہ ہو سکا۔ اردو فارسی ادب پر وہ غیر معمولی نظر رکھتے تھے۔ ان کی نظمیں زورِ بیان اور قدرتِ زبان کا شاہکار سمجھی جاتی ہیں۔ رشید احمد صدیقی نے اپنے مضامین میں ان کی ذہانت، ادبی ذوق اور انشا کا کئی جگہ ذکر کیا ہے۔ ان کی نظموں کا مجموعہ جون پور کالج میگزین میں اور مضامین ''افکارِ سہیل' کے نام سے شائع ہو چکے ہیں۔

رشید احمد صدیقی طنز و مزاح کے میدان میں اپنا ثانی نہیں رکھتے، ابتدا میں وہ علی گڑھ کے ظاہری طمطراق، ارہر کے کھیتوں اور کچی بارکوں سے متاثر تھے۔ لیکن آخری زمانے میں ان کی توجہ اس

مقصد و مشن کی طرف ہوگئی جو علی گڑھ کا مطمح نظر رہا تھا۔ ان کا اسلوب بیان ایسا منفرد اور جاندار ہے کہ ان کی تحریر کی ہر ہر سطر پر ان کی انفرادیت کا نقش اُبھرا ہوا نظر آتا ہے۔ ان کی بیش تر تصانیف کا موضوع یا تو علی گڑھ ہے یا اس کے پس منظر میں لکھی گئی ہیں۔

گنج ہائے گراں مایہ کا اردو خاکہ نگاری میں امتیازی مقام ہے۔ اس کے علاوہ ان کی تصانیف 'ذاکر صاحب' دہلی، 'شیخ نیازی' علی گڑھ ۱۹۵۸ء، ڈاکٹر ضیاء الدین احمد، فکر و نظر جلد: ۲، شمارہ ۲، ۱۹۷۱ء، ''ایسا کہاں سے لاؤں کہ تجھ سا کہیں جسے'' اردو ادب شمارہ: ۳، ۱۹۶۹ء، ''ہم نفسانِ رفتہ'' دارالمصنّفین اعظم گڑھ وغیرہ خاکہ نگاری کی بہترین کتابیں ہیں۔

اس کے علاوہ ان کی تصانیف ''آشفتہ بیانی میری، غالب کی شخصیت اور شاعری، جدید غزل، طنزیات و مضحکات'' خاص طور پر قابلِ ذکر ہیں۔

اسی زمانے کی ایک اہم ادبی شخصیت آغا حیدر حسن ہیں جن کو قلعہ معلّٰی کی زبان اور بیگماتی محاورے لکھنے اور بولنے میں کمال حاصل تھا۔ ان کے مضامین سے دلّی کی پرانی تہذیب کی بڑی دلچسپ عکاسی ہوتی ہے۔ ان کے مضامین کا مجموعہ ''پس پردہ'' زبان اور بیان دونوں اعتبار سے دلچسپ ہے۔

ڈاکٹر عابد حسین کا تعلق علی گڑھ سے جنرل ایجوکیشن پر کتابیں مرتب کرنے کے سلسلے میں ہوگیا تھا۔ ان کی تحریروں میں فکر، مطالعہ، ترتیب اور تاثر کا بہترین امتزاج ملتا ہے۔ انگریزی سے اردو میں ترجمہ کرنے میں ان کو بڑی مہارت تھی۔ ان کی تصانیف میں ہندوستانی قومیت اور قومی تہذیب (۱۹۴۶ء)، مضامین عابد (۱۹۴۷ء) وغیرہ معروف ہیں۔

تقسیم ہند کے بعد انھوں نے ایک اخبار جاری کیا تھا جو اپنے مخصوص انداز تحریر اور انتشاری دور میں حالات کے موثر جائزہ میں بے مثال کوشش تھی۔ انتقال سے چند سال قبل ''اسلام اور عصر جدید'' کے نام سے اردو انگریزی میں ایک رسالہ جاری کیا اور ایک ادارہ کی بھی بنیاد ڈالی۔

مولانا عبدالماجد دریابادی نے آل انڈیا مسلم ایجوکیشنل کانفرنس میں صاحب زادہ آفتاب احمد خاں کی ماتحتی میں بہ طور لٹریری اسسٹنٹ کا کام کیا۔ ان کا طرزِ نگارش منفرد اور دلچسپ تھا۔ طنز وشوخی میں ڈوبے ہوئے ان کے اخبار ''صدق'' اور ''سچ'' ادبی حیثیت رکھتے تھے اور علمی حلقوں میں مقبول تھے۔ انھوں نے تفسیر ماجدی کے علاوہ فلسفۂ جذبات، فلسفۂ اجتماع، تصوف اسلام وغیرہ کتابیں شائع کیں۔ مولانا روم کے ملفوظات فیہ مافیہ کو ایڈٹ کیا اور مولانا محمد علی کی ڈائری کو ترتیب دیا۔ ان کا شمار اردو کے صفِ اوّل کے انشا پردازوں میں ہوتا ہے۔ اردو اور انگریزی میں قرآن شریف کا ترجمہ اور تفسیر بھی شائع کی۔

قاضی عبدالغفار نے صحافت کے علاوہ، افسانہ، تذکرہ نویسی اور ادبی مضامین میں شہرت حاصل کی۔ ان کی تصانیف میں لیلیٰ کے خطوط کو بڑی اہمیت حاصل ہے۔ گجراتی اور مراٹھی میں اس کے ترجمے شائع کیے گئے۔ ان کی سوانح عمریاں، آثارِ جمال الدین افغانی، آثارِ ابوالکلام آزاد اور حیاتِ اجمل وغیرہ بھی سوانحی میدان میں اپنا بلند مقام رکھتی ہیں۔ انھوں نے گالسوروی کی ایک کتاب کا ترجمہ ''سیب کا درخت'' کے نام سے کیا تھا۔

سلطان حیدر جوش: خاص کر افسانہ اور طنز ومزاح ان کی ادبی کاوشوں کے میدان تھے۔ مولانا محمد علی کے ''ہمدرد'' میں انھوں نے مضامین لکھے۔ ان کے ناول ''ابن مسلم، فسانۂ جوش'' وغیرہ کافی مقبول ہوئے۔

پروفیسر آل احمد سرور نے اردو تنقید میں نہایت اعلیٰ مقام حاصل کیا۔ ان کے تنقیدی مجموعے ''نئے اور پرانے چراغ، تنقید کیا ہے، ادب اور نظریہ'' اردو ادب کے بہترین سرمائے میں شمار ہوتے ہیں۔ ان کے شعری مجموعے سلسبیل اور ذوق جنوں بھی علمی حلقوں میں مقبول ہوئے۔

ڈاکٹر ابواللیث صدیقی نے اردو تنقید اور شاعری میں بیش بہا خدمات انجام دیں۔ ان کی کتابیں ''لکھنؤ کا دبستانِ شاعری، اور جرأت۔ اس کا عہد اور شاعری'' اردو ادب میں بلند مقام رکھتی ہیں۔

اختر حسین رائے پوری کی کتابیں 'ادب اور انقلاب'، 'سنگ میل'، 'محبت ونفرت' خاص طور پر مقبول ہوئیں۔ ان کے کچھ ترجمے جو انھوں نے اردو میں کیے تھے مثلاً 'شکنتلا'، 'پیامِ شباب'، 'پیاری زمین' کو خاصی شہرت حاصل ہوئی۔

عظیم بیگ چغتائی کا افسانہ انگوٹھی کی مصیبت نیرنگ خیال میں شائع ہوا۔ ان کا شمار اپنے دور کے مشہور مزاح نگاروں میں ہوتا ہے۔

حیات اللہ انصاری نے افسانہ اور صحافت میں نام پیدا کیا۔ ان کے ناول 'لہو کے پھول' کو کافی شہرت حاصل ہوئی۔ 'قومی آواز' نے ہندوستانی صحافت میں اپنا مقام انھیں کی سرکردگی میں حاصل کیا۔

خواجہ احمد عباس کے افسانے 'زعفران کے پھول' میں کون ہوں اور سوانح اندرا گاندھی کافی مقبول ومعروف تصانیف ہیں۔

پروفیسر اسلوب احمد انصاری نے اردو میں پُر مغز تنقیدی مضامین لکھے۔ اقبال پر ان کی کتابیں 'نقش اقبال' اور 'اقبال کی تیرہ نظمیں' انداز بیان اور طرز فکر دونوں اعتبار سے گراں قدر ہیں۔

مندرجہ بالا فہرست ان اہم فن کاروں کی ہے جنھوں نے ادب کو عین زندگی بنا کر پیش کیا۔ ان کی تحریروں میں زندگی کے ایسے حقائق بیان کیے گئے جس سے زندگی اور معاشرے کو فائدہ پہنچا۔ ان فن کاروں نے بھی سرسید کی طرح شعر وادب کے افادی نقطۂ نظر کو اہمیت دی اور اپنی تحریروں میں اجتماعی طور پر محسوس کیے ہوئے جذبات اور سوچے سمجھے افکار کو اوّلیت دی۔ اس طرح ان فن کاروں نے معاشرتی اور تہذیبی اہمیت کو سامنے رکھ کر اردو ادب میں سرسید کے مقصدی شعر وادب کی روایت کو فروغ دیا اور شعر وادب کو حیات وکائنات کے بھرپور مسائل کی ترجمانی کے قابل بنایا۔

علی گڑھ تحریک کے فکری زاویوں اور ادبی اثرات کا سب سے گہرا اثر حالی کی تحریروں میں دکھائی دیتا ہے۔ انھوں نے اپنی نظموں، غزلوں اور نایاب تصانیف کے ذریعہ علی گڑھ تحریک کے بنیادی مقصد اور اساسی پہلوؤں کو تقویت بخشی۔

حالی کا شمار ان مورخوں، نقادوں اور شاعروں میں ہوتا ہے جنھوں نے سرسید کے افادی ادب اور نیچرل شاعری پر خاص توجہ مرکوز کی۔ اردو ادب اور تنقید میں ادب کے سماجی مقصد اور اس کی افادیت پر زور دے کر ادب کو مغربی تصورات سے روشناس کیا۔

مقدمہ شعر و شاعری میں نیچرل شاعری کی تعریف کرتے ہوئے لکھتے ہیں کہ:

''نیچرل شاعری سے مراد وہ شاعری ہے جو لفظاً و معناً دونوں حیثیتوں سے نیچرل یعنی فطرت یا عادت کے موافق ہو۔''

اس کے بعد اس کی مزید تشریح کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

''لفظاً نیچرل کے موافق ہونے سے یہ غرض ہے کہ شعر کے الفاظ اور ان کی ترکیب و بندش تا بہ مقدور اس زبان کی معمولی بول چال کے موافق ہو جس میں وہ شعر کہا گیا ہے۔ کیوں کہ ہر زبان کی معمولی بول چال اور روزمرہ اس ملک والوں کے حق میں جہاں وہ زبان بولی جاتی ہے۔ نیچر یا سکنڈ نیچر کا حکم رکھتے ہیں۔ پس شعر کا بیان جس قدر کہ بے ضرورت معمولی بول چال اور روزمرہ سے بعید ہوگا اسی قدر اَن نیچرل سمجھا جائے گا۔

یعنی نیچر کے معنی موافق ہونے یہ مطلب ہے کہ شعر میں ایسی باتیں بیان کی جائیں جیسی کہ ہمیشہ دنیا میں ہوا کرتی ہیں یا ہونی چاہئیں۔''[۵۲]

''نیچر'' وہ لفظ ہے کہ جس پر سرسید اور حالی دونوں نے بار بار اصرار کیا ہے اور اسی اصرار نے حالی کو مسدس ''مدوجزر اسلام'' لکھنے پر آمادہ کیا۔ ۱۸۷۹ء میں جب یہ شائع ہوئی تو سرسید نے اپنے ایک خط میں اس کی تعریف اس طرح کی:

''جناب مخدوم و مکرم من، عنایت نام جات مع پانچ جلد مسدس پہنچے۔ جس

وقت کتاب ہاتھ میں آئی جب تک ختم نہ ہوئی ہاتھ سے نہ چھوڑی، اور جب ختم ہوئی تو افسوس ہوا کہ کیوں ختم ہوگئی۔ اگر اس مسدس کی بدولت فن شاعری کی تاریخ جدید قرار دی جاوے تو بالکل بجا ہے۔ کسی صفائی اور خوبی اور روانی سے یہ نظم تحریر ہوئی ہے، بیان سے باہر ہے۔ تعجب ہوتا ہے کہ ایسا واقعی مضمون جو مبالغہ، جھوٹ، تشبیہات دور از کار سے جو مایہ ناز شعرا و شاعری ہے بالکل مبرا ہے۔ کیوں کہ ایسی خوبی و خوش بیانی اور موثر طریقے پر ادا ہوا ہے۔ متعدد بند اس میں ایسے ہیں جو بے چشم نم پڑھے نہیں جا سکتے۔ حق ہے جو دل سے نکلتی ہے دل میں بیٹھتی ہے۔ نثر بھی نہایت عمدہ و نئی ڈھنگ کی ہے، پرانی شاعری کا خاکہ نہایت لطف سے اڑایا ہے یا ادا کیا ہے.... جو اشارہ اس نثر میں ہے اس کا شکر کرتا ہوں اور آپ کی محبت کا اثر سمجھتا ہوں۔ اگر پرانی شاعری کی کچھ بو اس میں پائی جاتی ہے تو صرف انہی الفاظ میں ہے جن میں میری طرف اشارہ ہے۔ بے شک میں اس کا محرک ہوں اور اس کو میں ان اعمالِ حسنہ میں سمجھتا ہوں کہ جب خدا پوچھے گا کہ تو کیا لایا؟ میں کہوں گا کہ حالی سے مسدس لکھوالایا ہوں اور کچھ نہیں۔ خدا آپ کو جزائے خیر دے اور قوم کو اس سے فائدہ بخشے۔ مسجدوں کے اماموں کو چاہیے کہ نمازوں میں اور خطبوں میں اس کے بند پڑھا کریں.... آپ کے اس خیال کا کہ حق تصنیف مدرسۃ العلوم کو دیا جاوے اور رجسٹری کروادی جاوے، میں دل سے شکر کرتا ہوں۔ مگر میں نہیں چاہتا کہ اس مسدس کو جو قوم کے حال کا آئینہ اور جوان کی تاریخ کا مرثیہ ہے، کسی قید سے مقید کیا جاوے۔ جس قدر چھپے اور جس قدر وہ مشہور ہو اور لڑکے ڈنڈوں پر گایا

کریں اور رنڈیاں مجلسوں میں سارنگی پر گاویں، قوال درگاہوں میں گاویں،
حال لانے والے سچے حال پر حال لاویں۔ اسی قدر مجھ کو زیادہ خوشی ہوگی۔
میرا تو دل چاہتا ہے کہ دہلی میں ایک مجلس کروں جس میں تمام اشراف ہوں
اور رنڈیاں نچواؤں، مگر وہ رنڈیاں یہی مسدس گاتی ہوں۔ میں اس کل مسدس کو
تہذیب الاخلاق میں چھاپوں گا۔ میرے ان استفسار کا جواب جن پر نشان سرخ
کر دیا ہے بہت جلد مرحمت ہو۔ والسلام آپ کا احسان مند تابع دار۔'' [۵۳]

سرسید کی اس تحریر سے صاف ظاہر ہوتا ہے کہ حالی کا یہ فن پارہ ان کی امیدوں پر کھڑا اُترا۔ کیوں کہ سرسید نے سادگی، بے تکلفی اور مطلب نگاری کو ہی نیچرل قرار دیا تھا۔ یہ ساری خصوصیات حالی کی اس مسدس میں بدرجۂ اتم موجود ہیں۔ مثلاً مسدس کی تمہید نمونۂ کلام کے طور پر ملاحظہ ہو:

کسی نے یہ بقراط سے جا کے پوچھا — مرض تیرے نزدیک مہلک ہیں کیا کیا
کیا دکھ جہاں میں نہیں کوئی ایسا — کہ جس کی دوا حق سے کی ہو پیدا
مگر وہ مرض جس کو آسان سمجھیں — کہے جو طبیب اس کو ہذیان سمجھیں
سبب یا علامت گران کو سجھائیں — تو تشخیص میں سو نکالیں خطائیں
دوا اور پرہیز سے جی چرائیں — یوں ہی رفتہ رفتہ مرض کو بڑھائیں
طبیبوں سے ہرگز نہ مایوس ہو وہ — یہاں تک کہ جینے سے مایوس ہوں وہ
یہی حال دنیا میں اس قوم کا ہے — بھنور میں جہاز آ کے جس کا گرا ہے
کنارہ ہے دور اور طوفاں بپا ہے — گماں ہے یہ ہر دم کہ اب ڈوبتا ہے

نہیں لیتے کروٹ مگر اہلِ کشتی
پڑے سوتے ہیں بے خبر اہلِ کشتی

سرسید کے اثرات ان کے اکثر معاصر ادیبوں، شاعروں اور دانش وروں پر صاف نظر آتے ہیں۔ حالی کے مقدمہ شعروشاعری سے ہی یہ اندازہ ہوتا ہے کہ انھوں نے سرسید کا کتنا اثر قبول کیا۔ کیوں کہ حالی کے خیالات میں سرسید کے خیالات کی بازگشت سنائی دیتی ہے۔ مثلاً سرسید نے نظم کے لیے بول چال کی زبان اور فطری جذبات کو ترجیح دی۔ حالی نے بھی اسے مستحسن خیال کیا:

''نیچرل شاعری سے وہ شاعری مراد ہے جو لفظاً و معناً دونوں حیثیتوں سے نیچرل یعنی فطرت یا عادت کے موافق ہو. ....پس شعر کا بیان جس قدر کہ بے ضرورت معمولی بول چال اور روزمرہ سے بعید ہوگا، اسی قدر اَن نیچرل سمجھا جائے گا۔ معناً نیچر کے موافق ہونے سے یہ مطلب ہے کہ شعر میں ایسی باتیں بیان کی جائیں جیسی کہ ہمیشہ دنیا میں ہوا کرتی ہیں، یا ہونی چاہئیں۔ پس جس شعر کا مضمون اس کے خلاف ہوگا وہ اَن نیچرل سمجھا جائے گا۔''[۵۴]

کہہ سکتے ہیں کہ:

''حالی اپنی تنقید میں مرکزی طور پر اور محکم طور پر صرف اس فکر کے پابند ہیں جو سرسید احمد خاں کی تحریر و تقریر سے انھیں حاصل ہوا۔ ان کے خیالات پر مشرق و مغرب کے بعض دوسرے مصنفوں کے افکار کا پرتو بھی ہے، مگر مرکزی فکر سرسید کا معلوم ہوتا ہے۔''[۵۵]

سرسید نے نظم جدید کی حمایت کرتے ہوئے کہا تھا کہ:

''لفاظی اور ہجر و وصل کی شاعری، مبالغہ اور اَن نیچرل مدح سرائی، صنائع و بدائع جو ایک زمانہ میں حسن تحریر سمجھے جاتے تھے، اب حد سے زیادہ معیوب ہیں۔''[۵۶]

حالی نے بھی اس نقطۂ نظر کی بھرپور حمایت کی۔ ملاحظہ ہو:

''زمانے کا تقاضا یہ ہے کہ جھوٹ، مبالغہ، بہتان، افترا صریح، خوشامد..... تعلّی بے جا، الزام لایعنی، شکوۂ بے محل اور اس قسم کی باتیں جو صدق و راستی کے منافی ہیں اور جو ہماری شاعری کے قوام میں داخل ہوگئی ہیں، ان سے جہاں تک ممکن ہو، احتراز کیا جائے۔''[۵۷]

غرض یہ کہ حالی بھی سرسید کی طرح مسلم قوم کی زبوں حالی کو بیان کر کے اسے ذلت کے گڑھے سے نکالنے کی کوشش کرتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ حالی کی وہ نظمیں جو انھوں نے انجمن پنجاب کے موضوعی مشاعروں میں پڑھی تھیں سرسید کو بہت پسند آئیں۔ ۲۹/اکتوبر ۱۸۸۴ء کے ایک خط میں مولانا محمد حسین آزاد کو لکھتے ہیں کہ:

''میری نہایت قدیم تمنا اس مجلس مشاعرہ سے برآئی ہے۔ میں مدت سے چاہتا تھا کہ ہمارے شعرا نیچر کے حالات کے بیان پر متوجہ ہوں۔ آپ کی مثنوی ''خواب امن' پہنچی، بہت دل خوش ہوا۔ درحقیقت شاعری زور سخن وری کی وادی ہے۔ اب بھی اس میں خیالی باتیں بہت ہیں۔ اپنے کلام کو اور زیادہ نیچر کی طرف مائل کرو۔ جس قدر کلام نیچر کی طرف مائل ہوگا اتنا ہی مزہ دے گا۔ اب لوگوں کے طعنوں سے مت ڈرو۔ ضروری ہے کہ انگریزی شاعروں کے خیالات لے اردو زبان میں ادا کیے جاویں۔''[۵۸]

''حالی کو اسلام کے مدوجزر کے متعلق مسدس لکھنے پر انھوں نے ہی راغب کیا تھا اور یہ مسدس نہ صرف اردو ادب میں ایک گراں بہا اضافہ ثابت ہوئی، بلکہ اس کے ذریعہ قوم کو ماضی کا نقشہ دکھا کر اصلاح حال پر آمادہ کیا گیا۔ اردو شاعری میں

''شہرِ آشوب'' تو لکھے گئے تھے لیکن قوم کی اصلاح و تربیت کا کام اس سے بالکل نہیں لیا گیا تھا۔ مسدس نے شاعری کے ایک نئے استعمال کی راہ دکھائی اور یہ ثابت کر دیا کہ اس سے قوم کو خواب غفلت سے بیدار کرنے کا کام لیا جا سکتا ہے۔ ان کی ''نواہائے جگر سوز'' نے خود شاعری کا مقام بلند کر دیا۔''[۵۹]

مولانا سید سلیمان ندوی کا خیال ہے کہ:

''پچھلے پچاس ساٹھ برس میں ہماری زبان کی نظم و نثر میں جو کتابیں لکھی گئیں ان میں قبول عام اور حیات دوام اگر کسی کو نصیب ہوئی تو وہ مولانا حالی کی مسدس ہے۔''[۶۰]

کیوں کہ حالی نادانستہ طور پر ہی نئی شاعری کی بنیاد اپنی ان نایاب و مشہور نظموں (۱) برکھا رت (۲) نشاطِ امید (۳) حب الوطنی اور (۴) مناظرۂ رحم و انصاف کے ذریعہ ڈال چکے تھے۔ ان نظموں کی اہم خوبی یہ ہے کہ ان میں حقیقت نگاری سے کام لیا گیا ہے اور ان مسائل کو پیش کیا ہے جو انسان کی روزمرہ زندگی میں درپیش آتے ہیں۔ مثلاً برکھا رت کے چند اشعار:

گرمی کی تپش بجھانے والی — سردی کا پیام لانے والی
برسات کا بج رہا ہے ڈنکا — اک شور ہے آسماں پہ برپا
بیزار اک جان و تن سے — بچھڑا ہوا صحبت وطن سے

نشاطِ امید کے چند اشعار ملاحظہ ہوں:

اے میری امید میری جاں نواز — اے میری دل سوز میری کارساز
میری سیر اور میرے دل کی پناہ — درد و مصیبت میں میری تکیہ گاہ
عشق میں اور رنج میں میری شفیق — کوہ میں اور دشت میں میری رفیق

حالی کی اس نظم میں سرسید کی طرح ''امید کی خوشی'' بیان کی گئی ہے۔اس کے علاوہ حالی کی بیش تر نظمیں مثلاً تعصب وانصاف، کلمۃ الحق، مناجاتِ بیوہ، پھوٹ اور ایکے کا مناظرہ، دولت اور وقت کا مناظرہ، مرثیہ غالب، حقوقِ اولاد، معمارِ قوم، حُسنِ قوم، سید احمد کی مخالفت کی وجہ، سرسید حیدر آباد میں، چپ کی داد، ایک پیکرِ انسانیت، یادگارِ سرسید، مدرسۃ العلوم علی گڑھ، مسلمانوں کی تعلیم وعلی گڑھ کالج کیا سکھاتا ہے، ننگِ خدمت اور فلسفۂ ترقی وغیرہ، علی گڑھ تحریک کے ہی بنیادی اصولوں کی تشریح وتفسیر ہیں۔حالی نے اردو ادب کے سرمائے میں اپنی تخلیقات کے ذریعہ کافی اضافہ کیا۔انھوں نے اپنی عربی، فارسی نظموں کو بھی اردو نظموں کے ساتھ شامل کر کے ضمیمہ ''اردو کلیات نظم حالی'' کے نام سے ۱۹۱۴ء میں شائع کیا۔تحفۃ الاخوان، فلسفۂ ترقی وغیرہ بھی ان کی مشہور نظمیں ہیں۔نظموں کے علاوہ انھوں نے رباعیات بھی لکھیں جو ''رباعیاتِ حالی'' کے نام سے شائع ہوئیں۔اس کے علاوہ ان کے منتشر کلام کو مولوی محمد اسمٰعیل پانی پتی نے ''جواہراتِ حالی'' کے نام سے ۱۹۲۲ء میں شائع کیا۔''قطعاتِ حالی'' اور بچوں کے حالی کے نام سے بھی دو مجموعے شائع ہوئے۔

ان کی نظموں کے مطالعہ کے بعد یہ بات بالکل صاف ہو جاتی ہے کہ ان پر علی گڑھ تحریک کے اثرات کافی گہرے اور دائمی ثابت ہوئے۔ان کی نظموں میں حقیقت نگاری اپنی پوری آب وتاب کے ساتھ موجود ہونے کے ساتھ ساتھ زندگی سے تعلق، سماج کی اصلاح اور اخلاق کی قائم مقامی کا جذبہ رواں دواں نظر آتا ہے۔ان کی نظمیں قوتِ عمل، اچھے اخلاق، بلند کرداری، مصائب میں ثابت قدمی، پیکارِ زندگی میں حوصلہ افزائی، حب وطن، قومی شعور کے عناصر، علم حاصل کرنے، آزادی وخودداری سے اپنے اپنے صالح کردار کے ذریعے ایک صالح معاشرہ کی تشکیل کرنے کا حوصلہ بخشنے کے ساتھ ساتھ انسان کو مایوسی کے اندھیرے سے نکال کر امید کی روشن صبح کا نظارہ کراتی ہیں۔

چنانچہ یہ تمام وہ عناصر ہیں جنھیں علی گڑھ تحریک نے پیدا کیا۔اس لیے یہ کہا جا سکتا ہے کہ حالی نے بھی سرسید کی طرح ادب میں کورانہ تقلید کے بجائے جہاد سے کام لیا، اور نظر کی بے نظری کو وسعت نگاہ کی روشنی بخشی۔

حالی نے علی گڑھ تحریک سے متاثر ہوتے ہوئے جدید نظم نگاری کے ساتھ ساتھ جدید نثر کو بھی فروغ بخشا۔ ان کا نثری سرمایہ بھی قابلِ تعریف ہے جس نے اردو ادب کو ایک نیا ذہن عطا کیا۔

حالی کی نثری تصانیف کی شروعات عربی کے رسالہ سے ہوئی ہے جو انھوں نے نواب صدیق حسن خاں کی حمایت میں لکھا تھا۔ اس کے بعد ان کی تصانیف نے اردو دنیا میں تہلکہ مچا دیا۔ مثلاً مولود شریف، اور تریاقِ مسموم۔ یہ انھوں نے اپنے ہم وطن پادری عمادالدین کی کتاب ''ہدایت المسلمین'' کے جواب میں لکھی تھی۔ ''تاریخ محمدی'' بھی پادری عمادالدین کی تصنیف ''تاریخ محمدی پر تبصرہ'' کے جواب کے طور پر لکھی گئی۔ ''شواہد الالہام'' میں انھوں نے عقلی دلائل سے نبوت اور الہام کی اہمیت اور افادیت ثابت کی ہے۔ ''تذکرہ رحمانیہ'' حالی کے استاد عبدالرحمٰن کی سوانح عمری ہے۔ ''طبقاتِ الارض'' کسی مصری فاضل کی عربی کتاب کا ترجمہ ہے۔ یہ فرنچ سے ترجمہ کی گئی۔ ''مجالس النساء'' عورتوں کی اصلاح کے موضوع پر ہے، یہ دو حصوں پر مشتمل ہے۔ اس کے علاوہ ''سوانح عمری حکیم ناصر خسرو''، حیاتِ سعدی (۱۸۸۲ء)، مقدمہ شعر و شاعری (۱۸۹۳ء)، یادگارِ غالب (۱۸۹۷ء)، حیاتِ جاوید (۱۹۰۱ء)، مضامینِ حالی (۱۸۷۵ء)، مقالاتِ حالی (۱۹۳۴ء)، مکتوباتِ حالی (۱۹۲۵ء) اور مکاتیب حالی (۱۹۵۰ء) وغیرہ ان کی نثری تصانیف ہیں جن میں علی گڑھ تحریک کے اثرات صاف طور سے دیکھے جا سکتے ہیں۔

لیکن حالی کی شہرت کی وجہ ان کی سوانح عمریاں اور تنقید ہے۔ حالی کی سوانح عمریاں، حیاتِ سعدی، حیاتِ جاوید اور یادگارِ غالب ایسی ہیں کہ جن میں حقیقت نگاری کو ملحوظ رکھا گیا ہے، لیکن اس کے باوجود ان میں کچھ خامیاں بھی ہیں جنھیں درگزر کرنا بھی لازمی ہو جاتا ہے۔ وہ اس وجہ سے کہ حالی کے ذہن میں علی گڑھ تحریک کے زیر اثر شعر و ادب کی افادیت بلکہ اس کی اخلاقیات ہی ایک نمایاں مطمح نظر تھی۔ اس لیے انھوں نے اپنی سوانح عمریوں کو بھی تحریک کی تبلیغ کا وسیلہ بنایا۔ تاہم ان کی سوانح عمریاں اردو کی اعلیٰ اور مکمل سوانح نگاری کی حیثیت سے معروف ہیں۔

مقدمہ شعر و شاعری حالی کے دیوانِ غزلیات پر مقدمہ ہی نہیں اردو تنقید کا بھی مقدمہ ہے۔ کیوں کہ پہلی بار کسی ادیب نے ادب و شعر کی ماہیت سمجھنے کے ساتھ ساتھ اخلاق اور زندگی کا رشتہ ثابت کیا۔ شعر میں موضوع اور مواد کی اہمیت کو تسلیم کروانے کی کوشش کی، اسلوب زندگی پر فکر و خیال کو اہمیت دی۔ لہٰذا حالی نے مقدمہ شعر و شاعری میں جس فلسفیانہ انداز سے بحث کی ہے اس سے ان کی ادبی بصیرت اور نکتہ شناسی کا پتہ چلتا ہے۔

مقدمہ شعر و شاعری کو انھوں نے دو حصوں میں تقسیم کیا ہے:

(۱) شعر و شاعری کی ماہیت اور افادیت پر بحث

(۲) اردو کی مختلف اصناف کا اصولوں کی روشنی میں تجزیہ

اس کے بعد انھوں نے شعر کو بھی تین اجزا پر مشتمل بتایا ہے:

(۱) سادگی (۲) جوش (۳) اصلیت

حالی کا سب سے بڑا انقلابی قدم یہ ہے کہ انھوں نے شعر کو اخلاق کا قائم مقام اور نائب مناب کہہ کر گویا شعر اور سماج کے رشتے کی اہمیت قائم کر دی اور اس طرح اردو شعر کو علی گڑھ تحریک کے تصورِ افادیت اور شعر و ادب کو سماجی اصلاح کا آلہ کار بنانے کی کوششوں کو زبان عطا کر دی۔ انھوں نے ہالرائیڈ اور آزاد کی نظم نگاری کی تحریک کی بھی معاونت کی۔

حالی نے اپنے تخلیق کردہ ادب کے ذریعہ عصری رجحانات، اجتماعی شعور، شعری افادیت، ادب اور زندگی، ادب اور اخلاق کے اصولوں کے لیے نئی راہ ہموار کی۔

بقول آل احمد سرور:

''پوری اردو شاعری کو ماضی کے خوابوں سے چونکا کر، حال کی تخلیقوں کا احساس دلایا۔ اس میں عظمت اور زندگی پیدا کی اور اسے زمانے کے دوش بدوش لا کھڑا کیا۔''[۶۱]

علی گڑھ تحریک سے متاثر ہونے والی دوسری مشہور و معروف شخصیت مولانا شبلی نعمانی کی ہے۔ انھیں بھی شاعر، انشا پرداز، محقق اور نقاد کی حیثیت حاصل ہے۔ انھوں نے بھی قوم و ملّت کے احساس و درد کو اپنی نظموں میں اُجاگر کیا۔

شبلی نے علی گڑھ تحریک سے متاثر ہونے کے بعد اردو دنیا میں اپنی بیش بہا تصانیف کے ذریعے ایک انقلاب برپا کر دیا۔ ان کی بلند پایہ تصنیف کی فہرست اس طرح ہے:

(۱) المامون (۲) سیرت النعمان (۳) الفاروق

(۴) الغزالی (۵) سوانح مولانا روم

(۶) سیرت النبی کی پہلی جلد اور دوسری جلد کے کچھ حصے (۷) موازنۂ انیس و دبیر

(۸) شعر العجم کے پانچ حصے (۹) سفرنامہ مصر و روم (۱۰) تاریخ اسلام

(۱۱) مضامین عالم گیر (۱۲) مسلمانوں کی گذشتہ تعلیم (۱۳) ندوۃ العلماء

(۱۴) مکاتیب شبلی کے تین حصے (۱۵) مقالاتِ شبلی کے آٹھ حصے

(۱۶) مجموعۂ نظم اردو (اس میں اردو کلام کے علاوہ ان کی مثنوی 'صبح امید اور تماشائے عبرت' شامل ہے)

(۱۷) مجموعۂ نظم فارسی، اس میں دستۂ گل، بوئے گل اور غزلیات شامل ہیں۔

(۱۸) سیرۃ النبی شبلی کی آخری تصنیف ہے۔ اس کو انھوں نے کئی حصوں میں تقسیم کیا ہے لیکن اس کا پہلا حصہ انھوں نے اور باقی ان کے شاگرد سید سلیمان ندوی نے مکمل کیا۔

(۱۹) ایجوکیشنل کانفرنس کی تقریریں وغیرہ۔

اس میں کوئی دو رائے نہیں ہے کہ شبلی علی گڑھ تحریک سے پوری طرح متاثر ہوئے، لیکن ساتھ ساتھ انھوں نے قدیم و جدید کے مسئلے میں توازن سے کام لیا۔ انھوں نے جدید سرمائے کے ساتھ ساتھ اپنے قدیم سرمائے کو بھی فراموش نہیں کیا۔ حالاں کہ وہ سرسید کی عقلیت کے تصور سے پوری طرح متفق

نہ تھے لیکن پھر بھی وہ سرسید کے ہمیشہ مداح رہے اور ان کی خوبیوں کا ذکر اپنی نثر و نظم میں خوب خوب کیا۔ انھوں نے جدید تعلیم کی سطحیت پر بھی نظر رکھی اور قدیم تعلیم کے بعض پہلوؤں کی عدم افادیت کو بھی سامنے رکھا۔ سیرت النعمان میں شبلی نے انھیں واقعات پر زور دیا جو عقل و شعور کے معیار پر پورے اترتے تھے۔ محض خوش اعتمادی کی بنیاد پر بیان کیے گئے واقعات پر زور نہیں دیا۔

تاریخ کے سلسلے میں حقائق کا بے کم و کاست بیان شبلی کی ایک نمایاں خصوصیت ہے۔ ان کی اس خوبی کو سرسید نے بھی کافی سراہا ہے۔ المامون کے دوسرے ایڈیشن کے دیباچے میں سرسید نے شبلی کی تاریخ فہمی کو خراجِ عقیدت پیش کیا ہے۔ چنانچہ لکھتے ہیں:

> ''ہمارے لائق مصنف نے اس بات کا بہت کچھ خیال رکھا ہے اور باوجود تاریخانہ مضمون ہونے کے ایسی خوبی سے ادا کیا ہے کہ عبارت بھی فصیح اور دلچسپ ہے، اور تاریخانہ اصلیت بہ دستور اپنی اصلی صورت پر موجود ہے جو خوب صورت ہے۔ خوب صورت ہے جو بھونڈی ہے۔ بھونڈی ہے، نہ خوب صورتی کو زیادہ خوب صورت بنایا ہے، اور نہ بھونڈی کو زیادہ بھونڈا۔ اور اصل یہی کمال تاریخ نویسی کا ہے۔''[۶۲]

شبلی کی ایک اہم خوبی یہ بھی ہے کہ انھوں نے محاسن کے ساتھ ساتھ کمزوریوں پر بھی روشنی ڈالی ہے۔ حضرت امام صاحب سے عقیدت کے باوجود لکھتے ہیں کہ:

> ''امام صاحب کے مناظر میں کہیں کہیں ہم اس ادعا اور جوش مقابلہ کا اثر پاتے ہیں جو بہ ظاہر ان کی کثیر نفسی و تواضع کے خلاف ہے۔ لیکن یہ انسانی جذبات ہیں جن سے کوئی شخص بری نہیں ہوسکتا۔''[۶۳]

سیرۃ النعمان سوانح نگاری کی بہترین کتاب ہے۔ اس میں شبلی نے محبت وعقیدت کے باوجود امام ابوحنیفہ کی صحیح تصویر کشی اس طرح کی ہے کہ بقول سید عبداللہ:

''ہم یہ عام دعویٰ کر سکتے کہ ان کے سب مسائل یقینی اور صحیح ہیں۔'' [۶۴]

الغزالی کے ذریعہ انھوں نے قوم وملّت کو فلسفہ اور عقلیات کی طرف مائل کیا۔ اس میں انھوں نے جن رجحانات کی ہمت افزائی کی ہے وہ یہ ہیں کہ:

(۱) علماء کی اندرونی خرابیوں کی اصلاح (۲) حکام اور سلاطین کے سامنے آزادی اور حق گوئی کی اہمیت (۳) فلسفہ وعقلیات کے مطالعہ کی اہمیت (۴) تمدن اور سوسائٹی کی تہذیب کی ضرورت (۵) اجتہاد اور آزادیٔ رائے کی اہمیت (۶) یورپ کی علمی خدمات اور علمائے یورپ کا تعصب مسلمانوں کے متعلق۔

ان تمام تصانیف کے مطالعے سے یہ بات عیاں ہوتی ہے کہ شبلی نے علی گڑھ تحریک کے تمام پہلوؤں کو مدنظر رکھا۔ انھوں نے حقیقت نگاری کو کافی اہمیت دی ہے جو کہ علی گڑھ تحریک کا نکتہ خاص ہے۔ حقیقت نگاری کی تصویریں ان کی ہر تحریر میں بدرجۂ اتم موجود ہیں۔ مثلاً:

سوانح مولانا روم میں مولانا کو ایک انسان کی حیثیت سے ہی پیش کیا ہے، کیوں کہ اس میں انھوں نے مولانا کا تعارف ولی اور صوفی کے بجائے ایک حکیم اور ماہر علم کے نقطۂ نظر سے کرایا ہے۔ اس لیے انھوں نے اپنی کتاب میں ان ہی پہلوؤں پر روشنی ڈالی ہے جن سے دوسرے لوگوں کو فائدہ پہنچ سکتا ہو۔

سیرۃ النبی کے ذریعے بھی وہ اخلاق کی اصلاح اور تربیت کا کام لینا چاہتے ہیں۔ ان کا طریقہ یہ ہے کہ نفوسِ قدسیہ کی زندگیوں کو عوام کے سامنے پیش کیا جائے، کیوں کہ دنیا میں آج جو اخلاق کا سرمایہ ہے سب انھیں نفوس قدسیہ کا پرتو ہے۔ لکھتے ہیں:

''اس لحاظ سے آں حضرتؐ کی ذات مبارک یقیناً تمام فضائل اخلاق کا مجموعہ ہے، کیوں کہ آپ کی ہستی کو جامعیت کبریٰ کا درجہ حاصل ہے۔ اس سبب سے آپ کی سیرت تمام انسانی ضرورتوں میں اور تمام تمدنی اور انفرادی مسائل میں نصیحت، عبرت اور تربیت کا ذریعہ بن سکتی ہے۔''[۶۵]

شبلی یہاں پر آں حضرتؐ کو ان کی جامعیت کبریٰ کے باوجود انسان ہی تصور کرتے ہیں۔ اگرچہ آپؐ کی ذات روحانیت کامل اور پاکیزگی کا نمونہ تھی۔ بشریت اور معقولیت کا یہ رجحان دبستانِ سرسید کا مشترکہ رجحان ہے۔ شبلی نے آپؐ کی حیات مبارکہ کی خارجی جزئیات اتنی مفصل پیش کی ہیں کہ سیرۃ النبیؐ کو اردو سوانح ادب کی مکمل اور مفصل ترین کتاب کہا جاسکتا ہے۔ وہ باتیں جن کا اظہار عموماً نہیں کیا جاتا، سیرۃ النبیؐ کے اوراق میں جمع ہوگئی ہیں۔ یہاں تک کہ ازواجِ رسولؐ کی کمزوریوں تک کو چھپانے کی مطلقاً کوشش نہیں کی ہے۔

''شعرالعجم'' فارسی شاعری کی تاریخ ہونے کے ساتھ ساتھ ان کے تنقیدی تصورات کے لیے بھی ایک اہم تصنیف ہے۔ اس میں انھوں نے مشرقی تنقید پر زور دیا ہے۔ ان کی تصنیف موازنۂ انیس و دبیر تقابلی تنقید کا ایک بہترین نمونہ ہے۔ اس میں انھوں نے اردو مرثیہ کی ماہیت سے بحث کی ہے۔

شبلی نے محمڈن ایجوکیشنل کانفرنس کے سالانہ جلسوں میں کئی نظمیں پڑھیں۔ اس طرح کی نظموں میں ان کی مثنوی ''صبح امید'' اور ''تماشائے عبرت'' سب سے زیادہ مشہور ہوئیں۔ اس کے علاوہ ان کی سیاسی نظمیں بھی مقبول ہوئیں۔

اکبر و جہاں گیر کے واقعات پر ان کی چند نظمیں ہیں جن میں ''عدلِ جہاں گیر'' بہت مشہور ہوئی۔ ''شہرآسوب اسلام''، ''رفاہِ عام''، ''مذہب یا سیاست''، ''خطاب بہ حرار''، ''علمائے زندانی''، ''جنگِ یورپ'' اور ''ہندوستانی'' وغیرہ ان کی کافی ہنگامہ خیز نظمیں ہیں۔

ان کے نزدیک اسلامی تہذیب کا عہد ماضی انسانی تمدن کا بہترین دور تھا اور مستقبل میں بھی انسانی تہذیب ترقی کی منزلوں تک پہنچنا چاہے تو تبھی پہنچ سکے گی جب وہ لوٹ کر ماضی کی طرف جائے گی۔ اس طرح شبلی نے ماضی کو اوّلیت دی ہے جب کہ علی گڑھ تحریک حال پر نظر ثانی کی تحریک تھی۔ بس ایک یہی مقام ہے کہ جہاں شبلی کا تصورِ تاریخ سرسید کے نظریے سے مختلف ہو جاتا ہے۔ ورنہ باقی تمام رجحانات و تصورات میں سرسید اور شبلی یکساں معلوم ہوتے ہیں۔

علی گڑھ تحریک سے متاثر ہونے والوں میں ایک اہم شخصیت مولوی نذیر احمد کی بھی ہے۔ حالاں کہ ان پر تحریک کا اثر براہِ راست نہیں تھا، بلکہ بالواسطہ تھا۔ لیکن ان کی تمام تصانیف میں اس کے اثرات اپنی پوری آب و تاب کے ساتھ دکھائی دیتے ہیں۔ کیوں کہ یہ بھی سرسید کی طرح عقل پر زور دیتے ہیں۔ خیر و شر، توکل اور تقدیر کے متعلق ان کا نظریہ وہی تھا جو سرسید کا مخصوص نظریہ تھا۔ حالاں کہ مذہب کی رو سے انھیں سرسید کی چند باتوں سے اختلاف بھی تھا لیکن مکمل طور پر وہ سرسید کے مخالف نہیں تھے۔ کیوں کہ ان کی تصانیف کے موضوعات سرسید کی بازگشت معلوم ہوتے ہیں۔ انھوں نے اپنی تصانیف میں جدید تعلیم کی حمایت کی ہے اور یہ بتانے کی کوشش کی ہے کہ اسلام ترقی کے منافی نہیں، مذہب فطرت کے عین مطابق ہے۔ سائنس اور دین آپس میں متعارض نہیں لیکن ساتھ ہی ساتھ ان کی تصانیف میں مغربی حکمت و استفادہ بہت کم نظر آتا ہے بلکہ طریق بحث اور نقطۂ نظر قدیم ہی معلوم ہوتا ہے۔

علی گڑھ تحریک کے زیر اثر ادب میں حقیقت شناسی دکھائی دیتی ہے۔ اس ادب میں انسانی زندگی چلتی پھرتی نظر آتی ہے جہاں انسان نیک بھی ہے اور بد بھی۔ یہ تمام باتیں ہمیں نذیر احمد کے ناولوں میں دکھائی دیتی ہیں۔ ان کے ناولوں کے نام یہ ہیں:

(۱) مراۃ العروس (۲) بناۃ النعش (۳) توبۃ النصوح

(۴) ابن الوقت (۵) محسنات (۶) ایامیٰ

(۷) رویائے صادقہ۔

مراۃ العروس: انھوں نے یہ کتاب دراصل اپنی بڑی لڑکی کے لیے لکھی تھی اس کا دوسرا نام ''اصغری اکبری'' ہے۔ اس کتاب کے ذریعے نذیر احمد نے طبقۂ نسواں کے سامنے ایک تعلیمی و اخلاقی پروگرام پیش کیا۔ اس طرح ''مراۃ العروس'' نے ''بوستانِ خیال'' اور ''فسانۂ عجائب'' کی طلسمی دنیا کی بجائے اردو دنیا کو حقیقی زندگی کے تجربات سے روشناس کیا۔ نذیر احمد نے ہندوستانی مسلمانوں کی معاشرت کو اپنے ناولوں کا موضوع بنا کر حقیقت نگاری کی زبردست عکاسی کی ہے۔

نذیر احمد شاعر بھی تھے کانفرنس کے جلسوں میں انھوں نے اپنی کئی نظمیں بھی پڑھیں۔ ان کی نظمیں مندرجہ ذیل ہیں:

''قوم کا مسیحا''، ''سید احمد کے احسانات''، ''مرثیہ سید احمد خاں''، ''مرثیہ مبتلا'' یہ ناول محسنات کے آخر میں شامل ہے۔ ''زمانہ اور اسلام اتمام حجت'' یہ ان کے پیغام اور تحریکی مزاج کی ترجمان ہے۔ ان کے مجموعۂ کلام، کلامِ بے نظیر میں شامل زیادہ تر نظمیں قومی جلسوں یا تقریبی اور تہنیتی تقریبات کی ممنون و احسان مند ہیں۔ غرض یہ کہ ان پر بھی علی گڑھ تحریک کے اثرات مرتب ہوئے۔

اگرچہ نذیر احمد سے پہلے بھی اصلاحی جذبہ نظر آتا ہے۔ انگریزوں کی ترغیب پر نئے مدارس کے لیے قصے کہانیاں لکھی جانے لگیں تھیں۔ دھرم سنگھ کا قصہ، سوراج پور کی کہانی اور سودھی کھودی وغیرہ اسی طرح کی کہانیاں تھیں۔ محمد اسمٰعیل کی نیرنگِ نظر، ایم کیپسن کا قصۂ داستان، جمیلہ خاتون بھی اسی سلسلے کی کڑیاں تھیں۔ مولوی کریم الدین کا خط تقدیر، شیخ محمد غوث قریشی کا فسانہ غوث، مولوی وزیر علی کا مراۃ النسا اور منشی عزیز الدین کی جوہرِ عقل بھی دراصل اصلاحی کہانیوں اور شر پر خیر کے غلبے کی داستانیں ہیں۔

لیکن نذیر احمد کے ناولوں میں جو اصلاحی جذبہ کارفرما ہے وہ براہِ راست علی گڑھ تحریک ہی کے زیر اثر تھا۔ ابن الوقت اور رویائے صادقہ میں انھوں نے ہر چند کہ سرسید کے مذہبی نظریات سے اختلاف کیا مگر مجموعی طور پر علی گڑھ تحریک کی جھلک ہر ایک میں دکھائی دیتی ہے۔ نذیر احمد سرسید کے

تصورِ تعلیم اور انگریزی علوم وفنون کے حصول کے زبردست مداح تھے۔ انھوں نے بھی معاشرے کے اہم مسائل کو قصوں کہانیوں کے ذریعے پیش کیا۔ اس طرح انھوں نے ادب کو محض تفریح طبع اور وقت گزاری کے الزام سے بری کیا۔

علی گڑھ تحریک کے ایک اہم محرک نواب محسن الملک بھی ہیں، ان کا سب سے بڑا کارنامہ یہ ہے کہ انھوں نے رسالہ تہذیب الاخلاق میں پے در پے مضامین لکھ کر اردو میں مقالہ نویسی کو مقبول عام بنایا۔ انھوں نے تہذیب الاخلاق میں علی گڑھ تحریک کے مشن کی حمایت اس دل کش اور پُر اثر انداز میں کی کہ اردو ادیبوں کا ایک جمگھٹ اس کا ہم نوا ہو گیا۔

ان کے سبھی مضامین میں وہی عقلیت، نیچر، اجتماعیت، مادّی مقصدیت اور وہی تجدید و ترقی کا رجحان دیکھنے کو ملتا ہے جو سرسید کے فکری نظام میں اساسی اہمیت رکھتا ہے۔ البتہ یہ فرق ضرور ہے کہ سرسید کے بیان میں جو شدت پائی جاتی ہے وہ محسن الملک کے یہاں نہیں ہے۔ اس کے علاوہ یہ پرانی روایات و منقولات سے سرسید کے مقابلے میں کچھ زیادہ استفادہ کرتے ہیں، لیکن پھر بھی اس کے باوجود ان پر علی گڑھ تحریک کے کافی اثرات دکھائی دیتے ہیں۔ ان کے ایک مضمون کا یہ اقتباس دیکھیے:

> ''کوئی خیال اس سے زیادہ غلط نہیں کہ دین کے اصول جو خدا نے پیغمبر صلعم کی معرفت بتلائے وہ مطابق ان اصولوں کے نہیں جو عقل سے ثابت ہوتے ہیں اور کوئی امراض سے زیادہ تر مذہب پر الزام نہیں دیتا جیسا کہ یہ مسئلہ کہ نقل میں عقل کو دخل دینا شرعاً ناجائز ہے۔ جو لوگ یہ خیال کرتے ہیں کہ منقول اور معقول میں مخالفت ہے، وہ حقیقت میں عقل اور امورِ دین کی اصلیت سے بے خبر ہیں۔''[٦٦]

محسن الملک ایک اچھے مقرر اور خطیب بھی تھے۔ ان کی تقریریں کافی دل کش ہوا کرتی تھیں۔ ان کے خطبات اور تقاریر کا مجموعہ بھی شائع ہو چکا ہے۔ اس کے علاوہ انھوں نے اردو ادب میں کافی گراں مایہ اضافے کیے، مثلاً مضامینِ تہذیب الاخلاق، مکمل مجموعہ لکچرز، تقلید عمل رسالہ میلاد شریف بالحدیث، کتاب المحبت والشوق مکاتیب، مسلمانوں کی تہذیب اور آیاتِ بینات، مکاتیب الخلان، فی اصول التفسیر وعلوم القرآن وغیرہ۔

ان کے یہاں بھی سرسید کی طرح تمثیل نگاری کی اچھی مثالیں موجود ہیں۔ مثلاً موجودہ تعلیم و تربیت کی تشبیہ میں اس طرح بیان کرتے ہیں:

> ''ایک روز خیال نے عالمِ مثال تک پہنچایا اور اس طلسم کدہ کو جہاں سب چیزوں کی تشبیہ اور تمام حالتوں کی تصویر مصورِ قدرت نے کھینچ رکھی ہے دکھایا، درحقیقت اسے میں نے ویسا ہی پایا۔ جیسا کہ سنا کرتا تھا۔ بلاشبہ وہ ہماری حالتوں کا آئینہ اور ہمارے خیالوں کی تصویر کا مرقع ہے۔''[۶۷]

عالمِ خیال یا عالمِ مثال کی یہ تصویریں سرسید، حالی اور آزاد سبھی کے یہاں موجود ہیں جو مغرب کے مثالی یا تمثیلی ادب کے اثر کا نتیجہ ہیں۔

ان کے تمام مضامین علی گڑھ تحریک کے اثرات کا ہی نتیجہ معلوم ہوتے ہیں۔ مثلاً ان کا مضمون ہے: (۱) مسلمانوں کی تہذیب انہی کے الفاظ میں، یہ مسلمانوں کی تہذیب پر ہے کہ وہ پہلے کیسی تھی اور اب کیسی ہے اور آئندہ کیسی ہوگی۔ (۲) مسلمانوں کی ترقی اور ان کے تنزل کے اسباب، اس میں مسلمانوں کی ترقی تاریخی حوالوں کے ساتھ بیان کی ہے، پھر ان کی تنزلی کے اسباب بتائے ہیں جن میں سب سے اہم سبب غلط مذہبی خیالات ہیں۔ (۳) تدبیر وامید (۴) عزت (۵) اور تفسیر بالرائے، یہ بھی ان کے اہم مضامین ہیں (۶) مذہب وعلم، اس میں نیچر آف لا کی جاندار وضاحت کی ہے۔

غرض یہ کہ تہذیب الاخلاق میں لکھے گئے مضامین کا مجموعہ ''مضامین محسن الملک'' کے نام سے شائع ہوکر مشہور ہوا۔ اس مجموعہ کے مضامین سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ محسن الملک پر علی گڑھ تحریک کے زبردست اثرات مرتب ہوئے۔

تہذیب الاخلاق کے مضمون نگاروں میں ایک اہم شخصیت مولوی چراغ علی کی ہے۔ انھوں نے اپنے مضامین اور کتابوں میں علی گڑھ تحریک کی فکری بنیادوں کی خوب اشاعت کی۔ عقلیت اور مادیت کے معاملے میں یہ سرسید کے ہم نوا تھے، ان کا نقطۂ نظر بھی عقلی اور تمدنی تھا۔ روایت سے بغاوت، ماضی سے زیادہ حال پر توجہ، اجتہاد کی اہمیت اور جہاد کی نئی تاویل میں ان کی آواز بلند ہے۔

ان کی بیش تر کتابیں انگریزی میں ہیں۔ اس کے علاوہ یہ عربی، فارسی، عبرانی اور سریانی سے بھی واقف تھے۔ ان کی متعدد اردو تصانیف بھی موجود ہیں۔ مثلاً اسلام کی دنیوی برکتیں، قدیم قوموں کی تاریخ، بی بی ہاجرہ، ماریہ، تعلیق نیاز مانہ اور ایام الناس وغیرہ۔ اسلام پر ان کی ضخیم کتابیں مجتہدانہ شان سے لکھی گئی ہیں جن کا اردو میں ترجمہ کیا گیا ہے۔ تحقیق الجہاد، اسلام کے بزورِ شمشیر پھیلنے کی تردید میں ہے۔ ''اعظم الکلام فی ارتقاء الاسلام'' اسلام کی سوشل اصلاحات کے بارے میں ہے۔ ''محمد پیغمبر برحق'' سیرت پاک پر محققانہ کتاب ہے۔ ''تہذیب الکلام فی حقیقت الاسلام'' مذہبی اعتراضات کے جواب میں ہے۔ ''مجموعہ روایات'' میں کتب احادیث سے رسم غلامی کی بیخ کنی ثابت کی ہے۔ ''تدبیر الاسلام فی تحریر الامۃ والعلام'' میں بھی غلامی کے سلسلے کی بحث ہے۔ ''تحقیق مسئلہ تعداد ازدواج'' العلوم الجدیدہ والاسلام اس میں علوم جدید اور اسلام کی مطابقت ثابت کرنا چاہتے تھے۔ صرف اس کی تمہید ہی تہذیب الاخلاق میں چھپی تھی کہ ان کا انتقال ہوگیا۔ اس لحاظ سے یہ ان کی آخری تصنیف تھی۔

یہ تمام تصنیفات اس بات کی شاہد ہیں کہ مولوی چراغ علی پر علی گڑھ تحریک کے کافی گہرے اثرات تھے۔ کیوں کہ ان کے تمام مضامین لسانی تحقیق کے اعتبار سے کافی محققانہ ہیں جن میں تحقیق اور

وسعت نظر کی پوری پوری خوبیاں موجود ہیں اور علی گڑھ تحریک کا اہم مقصد حقیقت کا بیان ہی ہے۔ ان کے اور سرسید کے خیالات میں کافی اتفاق رائے ہے۔ انھوں نے اپنی کتاب ''اعظم الکلام فی ارتقاء الاسلام'' میں ریوانڈ مائیکل کے اس اعتراض کا جواب دیا ہے جو انھوں نے یہ کہا تھا کہ مذہب اسلام ترقی کا مانع ہے۔ لیکن انھوں نے لکھا کہ:

> ''اسلام ہر زمانے کی معاشرت کے مطابق تبدیل ہونے کی صلاحیت رکھتا ہے۔ مولوی صاحب کا خیال ہے کہ حدیث کی عقیدتاً ضروری نہیں۔ اسلامی سول لا کے بعض حصے از سر نو لکھے جانے چاہئیں۔ مذہب اور سیاست الگ الگ چیزیں نہیں۔ اسلام میں رائے کی آزادی ہے، غلامی، جنگ و جدل اور جہاد کا اسلام میں کوئی ذکر نہیں۔ اسلام نے عورت کی حیثیت کو بہت بلند کر دیا ہے وغیرہ وغیرہ۔''[۶۸]

اس طرح ظاہر ہوتا ہے کہ ان کا طرزِ استدلال وہی ہے جو علی گڑھ تحریک کا خاص جزو ہے۔ ان کی تحریرات میں علی گڑھ تحریک کا اثر بدرجۂ اتم موجود ہے۔

مضامین کے علاوہ مقالات میں بھی رفقا سرسید نے نئے نئے شگوفے کھلائے۔ اس میدان کے اہم رکن مولوی ذکاء اللہ ہیں انھوں نے اپنے مقالات میں قومی، معاشی اور تاریخی موضوعات پر خامہ فرسائی کی، تاریخ وسوانح سے متعلق ان کی اہم تصنیف ''تاریخ ہندوستان'' ہے، یہ دس جلدوں میں ہے۔ اس کے علاوہ آئینِ قیصری (ملکہ وکٹوریہ کی لائف) اور ''فرہنگ فرنگ'' (اہلِ یورپ کی ستائشگی اور تہذیب کا حال)۔ انھوں نے مولوی سمیع اللہ کی سوانح عمری بھی لکھی۔ آخری عمر میں ''تاریخ اسلام'' لکھ رہے تھے کہ وفات ہوگئی۔

شبلی کی طرح یہ بھی مغرب کی تاریخ نگاری کے بعض پہلوؤں کے گلہ مند ہیں، لیکن باوجود اس کے ان کے خیالات علی گڑھ تحریک سے متاثر نظر آتے ہیں۔ مثلاً ان کے خیال میں تاریخ کو واقعات کی

فہرست کی بجائے تہذیب انسانی کی تاریخ ہونا چاہیے۔(۲) واقعات کو صحیح رنگ میں پیش کرنے کے لیے ان کے اسباب کا سراغ لگانا چاہیے۔ روایات اور بیانات کو عقل کی کسوٹی پر پرکھنا چاہیے اور تناقص زمانی و مکانی کا خیال رکھنا چاہیے، وغیرہ وغیرہ۔

اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ مولوی ذکاءاللہ نے بھی علی گڑھ تحریک اور سرسید کے خیالات کی تبلیغ کی اور ان خیالات کو اس پُر جوش طریقے سے عام کیا کہ آہستہ آہستہ یہی خیالات سب لوگوں کے عقائد کا جزو بن گئے۔

سرسید کے ان رفقاے خاص نے اردو ادب کے ارتقا میں اپنا جو کردار ادا کیا وہ بہ ذاتِ خود بہت بڑا کارنامہ تھا، لیکن ان کا سب سے بڑا کارنامہ یہ ہے کہ انھوں نے آنے والی نسل کو بھی متاثر کیا، اور اس دوسری نسل نے علی گڑھ تحریک کی روایات کو مختلف اصناف کے ذریعہ آگے بڑھایا۔ ادبِ لطیف کے بیش تر علم بردار اس تحریک سے متاثر ہی نہیں اس کے فکر و فلسفہ کو آگے بڑھانے میں بھی پیش پیش رہے۔ انھوں نے انشائیوں، افسانوں، ناولوں، ترجموں اور شاعری میں ہیئتوں کے تجربوں کے ذریعے اردو کے ادبی افق کو وسیع تر کیا۔ غرضے کہ بعد میں آنے والی قومی شاعری اور قومی رجحان کو بھی اسی تحریک نے پیدا کیا جو علی گڑھ تحریک کے براہِ راست حلقہ بہ گوشوں کے ذریعے مثلاً مولانا حسرت موہانی، محمد علی جوہر، مولانا شوکت علی گوہر، فانی بدایونی، وحیدالدین سلیم، اقبال سہیل وغیرہ نے پروان چڑھایا۔ اس تحریک سے وہ لوگ بھی کافی متاثر معلوم ہوتے ہیں جو کہ اس سے براہِ راست متعلق نہ تھے۔ مثلاً مولانا محمد حسین آزاد، اسماعیل میرٹھی اور عبدالحلیم شرر ان کے علاوہ شوق قدوائی، نظم طباطبائی اور اکبرالہ آبادی جو سرسید کے مخالف ہونے کے باوجود ان سے اور ان کی اس تحریک سے متاثر ہوئے۔ اکبر نے اپنی مشہور نظم ''سرسید اور کالج'' لکھی۔ اس میں انھوں نے مدرسۃ العلوم علی گڑھ کی حمایت کی ہے اور ''سرسید مرحوم اور ہم والے قطعہ میں'' سرسید کی شخصیت کو خراجِ تحسین عطا کیا ہے۔ مثلاً:

ہماری باتیں ہی باتیں ہیں سید کام کرتا تھا
نہ بھولو فرق جو ہے کہنے والے کرنے والے میں
کہے جو چاہے کوئی میں تو یہ کہتا ہوں اے اکبرؔ
خدا بخشے بہت سی خوبیاں تھیں مرنے والے میں

علامہ اقبال پر بھی اس تحریک کے کافی اثرات مرتب ہوئے۔ان کی نظم ''سید کی لوحِ تربت''، ''طلبا علی گڑھ کالج کے نام'' یا مسعود مرحوم جیسی رثائی نظموں میں اس کا گہرا اثر دکھائی دیتا ہے اور اس طرح علی گڑھ تحریک نے شعر و شاعری کی دنیا میں انقلاب برپا کر دیا اور نظم کی صنف کو تقویت بخشی۔لہٰذا انھیں اثرات نے ۱۹۳۶ء میں ترقی پسند تحریک کو پیدا کیا جس نے نظموں کا مرتبہ اور بھی بلند کر دیا۔

پنڈت رتن ناتھ سرشار کے ناولوں میں بھی وہی محرکات ملتے ہیں جو علی گڑھ تحریک کا خاصہ ہیں۔مثلاً انھوں نے فسانۂ آزاد اور دوسرے ناولوں میں مشرقی طرزِ معاشرت کو اجاگر کرنے کے ساتھ ساتھ حکمراں قوم کے اوصاف بھی بیان کیے ہیں۔اسی طرح عبدالحلیم شرر کے ناولوں میں اگرچہ مذہبی جوش اور اسلام کے احیاء کا جذبہ موجزن نظر آتا ہے، لیکن پھر بھی وہ علی گڑھ تحریک کے اصلاحی پروگرام سے متاثر نظر آتے ہیں۔

ان کے اہم ناول یہ ہیں: (۱) فلورا فلورنڈا (۲) فتح اندلس (۳) ملک العزیز (۴) حسن اور (۵) ورجینیا انجلینا منصور موہنا وغیرہ اور ان ناولوں پر بھی علی گڑھ تحریک کے اثرات دیکھے جا سکتے ہیں۔

علی گڑھ تحریک کے اثرات وقتی نہیں بلکہ دائمی ہیں، کیوں کہ سرسید کے ان رفقائے خاص کے علاوہ بھی اس تحریک سے اخذ و استفادہ کرنے والوں کی فہرست کافی طویل ہے۔مثلاً محمد علی طبیب نے اپنے ''فن پارے گورا'' میں بیوہ عورتوں کی پردہ دار زندگی کی عکاسی کی ہے۔''اختر حسینہ'' میں تعلیم نسواں کی اہمیت پر زور دیا۔نواب آزاد نے ''نوابی دربار'' میں نوابوں کی روبہ زوال معاشرت کی طنزیہ عکاسی کی ہے۔

سجاد حسین کسمنڈی نے ''بگلا بھگت''، ''شیخ چلّی'' اور ''کائنات'' وغیرہ میں یہی رنگ اختیار کیا ہے۔ عباس حسین ہوش کے افسانے ''نادر جہاں'' اور ''ربط ضبط'' ہیں۔ جوالا پرشاد برق نے بنگالی ناولوں کے ترجمے کیے۔ عرفی نے طوائفوں کو اپنے ناولوں کا موضوع بنایا۔ ''شاہد رعنا'' ان کا نمائندہ ناول ہے۔ محمد احسان اللہ العباسی کے ناول ''زاہدہ فسانۂ دل پذیر'' اور ''المجاہد'' ہیں۔ مرزا سعید کا ''خواب بیتی'' اور ''یاسمین'' ہیں۔ ان کے علاوہ اردو کے اہم ناول نگار مرزا رُسوا نے اپنے ناولوں میں معاشرے کی اخلاقی کمزوریوں کو نمایاں کیا۔ ''امراؤ جان ادا''، ''افشائے راز''، ''ذاتِ شریف''، ''شریف زادہ'' اور ''اختری بیگم'' میں بھی علی گڑھ تحریک کا ہی اصلاحی جذبہ کارفرما نظر آتا ہے۔ ادھر راشد الخیری نے طبقۂ نسواں کی اصلاح کے ساتھ ساتھ مسلمانوں کی معاشرتی خرابیوں کی اصلاح بھی پیش نظر رکھی۔ ان کے ناول ''زندگی''، ''شامِ زندگی'' اور ''منازل السائرہ'' اسی قبیل کے ہیں۔ سلطان حیدر جوش نے ''نقش ونقاش''، ''خواب فرید'' اور ''ابن مسلم'' وغیرہ میں اسی اصلاحی جذبہ کو پیش پیش رکھا۔ بے خود دہلوی کے ''ننگ وناموس''، کشن پرشاد کول کے ''سادھو'' اور ''بیسوا''، صغریٰ ہمایوں مرزا کے ناول ''زہرہ فاطمہ بیگم کے صبر کا پھل''، ''کرنی کا پھل''، ''لالچ کا شکار''، ''وفائے مغرب'' اور ''غیرت کی پتلی''، محمد بیگم کے ''سگھڑ بیٹی'' اور ''شریف بیٹی''، طیبہ بیگم کے ناول ''انوری بیگم'' اور ''ظفر جہاں بیگم'' کے اختر بیگم میں بھی علی گڑھ تحریک کے اثرات ہیں۔

ان کے علاوہ جدید دور کے ادیب پریم چند بھی ان اثرات سے مبرا نہیں۔ یہ اثرات ان کے ناولوں میں بھی دکھائی پڑتے ہیں جن میں معاشرتی اصلاح، سیاسی امن اور مذہبی عقائد کی درستی کا جذبہ کارفرما ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ علی گڑھ تحریک نے مغرب پرستی یا مغربی علوم وفنون سے اخذ واستفادہ کی جو راہ دکھائی تھی اس نے قریب قریب پورے اردو ادب کو اپنی لپیٹ میں لے لیا۔ یہاں تک کہ رومانوی ادیبوں کی مغرب پرستی اور اس کے زیر اثر افسانہ نگاری اور انشا پردازی علی گڑھ تحریک کے اثرات کا ہی نتیجہ ہے۔ بقول مولانا شبلی:

''ملک میں آج بڑے بڑے انشاپرداز موجود ہیں جو اپنے مخصوص دائرۂ مضمون کے حکمراں ہیں، لیکن ان میں ایک شخص بھی نہیں جو سرسید کے بارِاحسان سے گردن اُٹھا سکتا ہو۔ بعض بالکل ان کے دامنِ تربیت میں پلے ہیں۔ بعض نے دور سے فیض اٹھایا ہے، بعض نے مدعیانہ اپنا الگ رستہ نکالا۔ تاہم سرسید کی فیض پذیری سے بالکل آزاد کیوں کر رہ سکتے تھے۔''[۶۹]

علی گڑھ تحریک کے اثرات نے ہی شاعروں اور ادیبوں کو قومی یک جہتی اور ایک قوم ہونے کے تصور کو تقویت بخشی۔ اس میدان میں چکبست نے نام پیدا کیا۔ ان کی نظمیں ''خاک ہند''، ''فریادِ قوم''، ''پیامِ وفا''، ''وطن کا راگ'' اور ''کزن سے جھپٹ قوم پرستی'' کی روشن مثالیں ہیں۔ سرور جہاں آبادی کی نظمیں ''گلزارِ وطن''، ''عروس حب وطن'' اور ''بدنصیب بنگال'' وطن کی محبت سے سرشار ہیں۔ منشی تلوک چند محروم نے ''خاک ہند''، ''شکوۂ صیاد''، ''مقاومت مجہول'' اور ''سودیشی تحریک'' جیسی نظمیں لکھیں۔ مولوی محمد ظہور علی نے ''تاریخ شاہی انگریز''، دتاتریہ کیفی نے ''مغربی قوموں کا فلسفہ''، ظفر لکھنوی نے ''ہوم رول''، ظفر علی خاں نے ''فریادِ جرس'' اور ''فانوس ہند کا شعلہ''، شاد عظیم آبادی نے ''مادرِ ہند'' اور رواں نے ''ہند مظلوم'' لکھ کر اہلِ ہند کے سینوں کو اتحاد و اتفاق اور جوشِ آزادی سے بھر دیا۔ علامہ اقبال نے اتحاد و یک جہتی آزادی اور محبت کا سبق سکھایا۔ ترانۂ ہندی، ہندوستانی بچوں کا قومی گیت اور ''نیا شوالہ'' جیسی نظمیں لکھیں۔ حسرت موہانی کی نظم ''مانٹگو رفارم''، محمد علی جوہر نے ''شرارِ جوہر''، ''ردّ سحر'' اور ''یہی کچھ ہے'' وغیرہ مشہور نظمیں لکھیں۔

چنانچہ سرسید کے براہِ راست اور بالواسطہ دونوں ہی رفقا نے ملک کے گوشے گوشے میں روایت پرستی کے خلاف اپنی شاعری اور ادب کے ذریعے آواز بلند کر کے جدید نقطۂ نظر اور نئے خیالات کے لیے فضا پیدا کی۔ اس طرح ادب و شاعری میں حقیقت و واقعیت پسندی کا رجحان ترقی پذیر ہوا۔

علی گڑھ تحریک کے زیر اثر عقل پسندی کا ذوق بڑھا اور جذباتیت کی جگہ معقولیت کو اہمیت حاصل ہوئی۔ سرسید نے اپنے مضامین کے ذریعہ ادب کو ایک تعمیری رجحان، صاف ستھری زبان اور استدلالی انداز بیان دیا۔ خود ان کا قول ہے کہ:

''ہم نے اپنے آرٹیکلوں کو اس طرز جدید، صاف وسادہ پر لکھا ہے جو دل میں سے نکلنے والی اور دل میں بیٹھنے والی ہے۔ اس طرز پر لکھنے سے اپنی قوم کو موجودہ علم انشا کی برائی کا بتلانا اور اس میں تبدیلی کی ضرورت کا ہونا سمجھا جاتا ہے اور اگر ہمارا خیال غلط نہیں تو ہم نے اپنی قوم میں اس کا کچھ اثر بھی پایا ہے.....اور اپنی قوم کو دکھایا ہے کہ مضمون لکھنے کا کیا طرز ہے، اور ہماری اردو زبان میں ان خیالات کے ادا کرنے کی کیا کچھ طاقت ہے اور اگر ہماری قوم اس پر متوجہ ہو تو کسی قدر اور زیادہ خوبی اور صفائی اور سادگی اس میں پیدا کر سکتی ہے۔''[۷۰]

محمڈن ایجوکیشنل کانفرنس کے اجلاس میں سرسید نے اپنا یہ خیال پیش کیا کہ:

''لٹریچر ایک ایسا علم ہے جو ہر ایک زبان کے ساتھ مخصوص ہے مگر اس زمانے میں اس میں بھی طریق بیان اور طرز ادائے مضمون نے ایسی ترقی کی ہے کہ ہم اپنی قدیم طرز تحریر اور طریق ادائے مضمون کے چھوڑنے اور اس جدید طرز کے اختیار کرنے پر مجبور ہوتے ہیں۔ لفاظی اور ہجر و وصل کی شاعری، مبالغہ اور اَن نیچرل مدح سرائی، صنائع و بدائع جو ایک زمانہ میں حسن تحریر سمجھے جاتے تھے، اب حد سے زیادہ معیوب ہیں۔''[۷۱]

سرسید نے محمد حسین آزاد کی کتاب ''آب حیات'' پر تبصرہ کرتے ہوئے لکھا کہ:

''جو تبدیلی کہ اس زمانے میں اردو زبان میں ہوئی درحقیقت اردو زبان کے

علم وادب میں واقعہ عظیم ہے۔ میر امن، انشا اللہ خاں انشا، جرأت وغیرہ وغیرہ اردو زبان میں نثریں لکھی ہیں۔ حال کی طرز تحریر اور طریقہ ادائے خیالات کو اس سے کچھ نسبت نہیں ہے، وہ صرف ایک ڈھکوسلے تھے۔ زمانہ حال کی اردو نثر مضامین میں مفید اور دقیق مسائل اور علمی اور اصلی واقعات کے بیان سے مالا مال ہے۔'' [۲]

سرسید اردو زبان میں انگریزی الفاظ استعمال کرنے کے خواہش مند تھے۔ سرسید کہتے ہیں کہ:

''اہلِ زبان غیر زبان کے لفظ کو ایسی عمدگی سے ملا لیتے ہیں جیسے تاج گنج کے روضے میں سنگ مرمر پر عقیق و یاقوت و زمرد کی پچی کاری ہے۔ بے شک وہ دوسرا پتھر ہے مگر ایسا وصل ہوا ہے کہ غور سے دیکھنے پر بھی اوپر سے جڑا ہوا نہیں معلوم ہوتا، اسی میں سے پیدا معلوم ہوتا ہے۔'' [۳]

سرسید اپنے ایک لکچر میں کہتے ہیں کہ:

''اس زمانہ میں کوئی ہفتہ کوئی مہینہ نہیں جاتا کہ علوم میں کوئی نہ کوئی بات پیدا نہ ہو، طلبا کو روز بروز اس کو دیکھنا اور اس سے واقفیت ہونا چاہیے۔ کیا یہ بات کسی طرح ممکن ہے کہ جو دریا روز بروز موج مارتا ہوا بڑھتا آتا ہو اور اس کو ایک کوزہ میں بند کر لیں۔'' [۴]

رفقاے سرسید کا ادب اوّلین ادب تھا۔ ان کے پاس بہترین ادب کی کوئی مثال موجود نہ تھی اس لیے ان کے ادب میں ترقی یافتہ ادب کی تمام خوبیوں کو تلاش کرنا محض حماقت ہے۔ کیوں کہ انھوں نے ادب اور خصوصاً رائج الوقت یا روایتی ادب کے متعلق جس نظریے کا اظہار کیا وہ قابلِ اعتراض معلوم نہ ہو کر قابلِ احترام معلوم ہوتا ہے۔ کیوں کہ ان کے ادب سے یہ بات صاف واضح ہو جاتی ہے کہ وہ اس دور کے

صحیح نمائندہ وترجمان تھے۔انھوں نے صرف قوم کے زنگ آلود ذہن کو بدلنے کے لیے ہی ادب پیدا کیا تھا اوران کا یہ ادب ایسا ادب تھا کہ جس کا تعلق خواص سے زیادہ عوام سے تھا۔

اردو شعر وادب پر علی گڑھ کے دوررس اثرات مرتب ہوئے اوراس کے بعد کی دوسری ادبی تحریکیں بھی کسی نہ کسی حد تک علی گڑھ تحریک کے اثرات کا نتیجہ ہی کہی جاسکتی ہیں۔

○○○

حواشی:

۱۔ مقاصد تہذیب الاخلاق، بحوالہ: سرسید اور اردو زبان وادب، قمرالہدیٰ فریدی، ۱۹۸۹ء، ص: ۶۰۔۶۱

۲۔ سرسید، تقریر اجلاس، محمڈن ایجوکیشنل کانفرنس، ۲۹ر دسمبر ۱۸۹۱، مشمولہ مکمل مجموعہ لکچر رو اسپیچیز، ص: ۴۰۹، بحوالہ: سرسید اور اردو زبان وادب، قمرالہدیٰ فریدی، ۱۹۸۹ء، ص: ۶۱

۳۔ خوش محمد ناظر، نغمۂ فردوس، ص: ۱۱۔ بحوالہ: علی گڑھ کی علمی خدمات، پروفیسر خلیق احمد نظامی، ۱۹۹۴ء، دلّی، ص: ۱۵

۴۔ علی گڑھ کی علمی خدمات، پروفیسر خلیق احمد نظامی، ۱۹۹۴ء، دلّی، ص: ۱۵

۵۔ اردو نظم۔ مشمولہ: مقالات سرسید، حصہ دہم، ص: ۱۲۰۔ بحوالہ سرسید اور اردو زبان وادب، قمرالہدیٰ فریدی، ۱۹۸۹ء، ص: ۲۳

۶۔ مضامین تہذیب الاخلاق، جلد دوم، مرثیہ: ککے زئی، ص: ۴۵۷۔ بحوالہ: سرسید اور اردو زبان و ادب، قمرالہدیٰ فریدی، ۱۹۸۹ء، ص: ۶۹

۷۔ ہمارا علم ادب، علی گڑھ انسٹی ٹیوٹ گزٹ، ۲۰ر نومبر ۱۸۷۷ء۔ بحوالہ: سرسید اور اردو زبان وادب، قمرالہدیٰ فریدی، ۱۹۸۹ء، ص: ۶۸

۸۔ ملا وجہی 'سب رس'۔ مرتبہ ڈاکٹر مولوی عبدالحق صاحب، انجمن ترقی اردو پاکستان، کراچی ۱۹۵۲ء، ص:

۹۔ آثار الصنادید، باب چہارم، ص: ۱۰، لکھنؤ نول کشور ۱۸۷۶ء۔ بحوالہ: سرسید اور اردو زبان وادب، قمرالہدیٰ فریدی، ۱۹۸۹ء، ص: ۶۹

۱۰۔ باغ و بہار، میر امن دہلوی۔ مرتبہ ڈاکٹر مولوی عبدالحق، انجمن ترقی اردو (ہند) دہلی، ۱۹۴۴ء، ص: ۲۱۹

۱۱۔ ترقی علم انشا، مقالات سرسید، حصہ دہم، ص:۱۱۶۔ بحوالہ: سرسید اور اردو زبان و ادب، قمر الہدیٰ فریدی، ۱۹۸۹ء، ص:۷۲

۱۲۔ خطوطِ غالب۔ ص:۶

۱۳۔ سرسید اور علی گڑھ تحریک۔ خلیق احمد نظامی، ایجوکیشنل بک ہاؤس، علی گڑھ، ۱۹۸۲ء، ص:۶۶

۱۴۔ سفرنامہ مسافرانِ لندن، اخبار سین ٹیفک سوسائٹی، علی گڑھ ۳۰/اپریل ۱۸۶۹ء۔ بحوالہ: سرسید اور اردو زبان و ادب، قمر الہدیٰ فریدی، ۱۹۸۹ء، ص:۱۱

۱۵۔ سرسید: تقریر بنارس، مشمولہ مکمل مجموعہ لکچرز و اسپیچز، مرتبہ امام الدین گجراتی، ص:۴۵، ناشر: ملک فضل الدین، لاہور ۱۹۰۰ء۔ بحوالہ: سرسید اور اردو زبان و ادب، قمر الہدیٰ فریدی، ۱۹۸۹ء، ص:۱۱

۱۶۔ سرسید اور اردو زبان و ادب، قمر الہدیٰ فریدی، ۱۹۸۹ء، ص:۱۱۔۱۲

۱۷۔ سفرنامہ مسافرانِ لندن۔ اخبار سین ٹیفک سوسائٹی، علی گڑھ، ۳۰/اپریل ۱۸۶۹ء۔ بحوالہ: سرسید اور اردو زبان و ادب، قمر الہدیٰ فریدی، ۱۹۸۹ء، ص:۱۳

۱۸۔ ایضاً۔

۱۹۔ ایضاً۔ ص:۱۴

۲۰۔ روئداد (نمبر ۶) سائنٹفک سوسائٹی، علی گڑھ، ۱۶/اگست ۱۸۶۴ء، الٰہ آباد گورنمنٹ پریس، ۱۸۶۴ء۔ بحوالہ: سرسید اور اردو زبان و ادب، قمر الہدیٰ فریدی، ۱۹۸۹ء، ص:۱۸

۲۱۔ زور، محی الدین قادری۔ اردو کے اسالیب بیان، ص:۳۶، لاہور مکتبہ معین الادب، ۱۹۶۴ء۔ بحوالہ: سرسید اور اردو زبان و ادب، قمر الہدیٰ فریدی، ۱۹۸۹ء، ص:۲۲

۲۲۔ لکچروں کا مجموعہ، ص:۲۴۱۔ بحوالہ: علی گڑھ کی علمی خدمات۔ پروفیسر خلیق احمد نظامی، ۱۹۹۴ء، نئی دہلی، ص:۱۳۔۱۴

۲۳۔ اختتام سال ۱۹۹۱ء، ترقی علم انشا، تہذیب الاخلاق، جلد ششم، یکم محرم ۱۲۹۲ھ۔ مشمولہ: مقالات سرسید، حصہ دہم، ص ص:۱۱۴۔۱۱۵۔ بحوالہ: سرسید اور اردو زبان و ادب، قمر الہدیٰ فریدی، ۱۹۸۹ء، ص:۲۵

۲۴۔ آثار الصنادید، تیسرا باب، ص:۳۵، پہلا ایڈیشن۔ بحوالہ: سرسید اور اردو زبان و ادب، قمر الہدیٰ فریدی، ۱۹۸۹ء، ص:۳۸

۲۵۔ آثار الصنادید، ص ص:۷۰۔۷۱، کان پور رعد تابی پریس، ۱۹۰۴ء۔ بحوالہ: سرسید اور اردو زبان و ادب، قمر الہدیٰ فریدی، ۱۹۸۹ء، ص:۳۹

۲۶۔ تدبیر ترقی نظم۔ بحوالہ: سرسید اور اردو زبان و ادب، قمر الہدیٰ فریدی، ۱۹۸۹ء، ص:۶۰

۲۷۔ تہذیب الاخلاق۔انور سدید،ص:۲۴۲

۲۸۔ ایضاً۔

۲۹۔ تہذیب الاخلاق یکم ذی الحجہ،۱۲۸۹ھ،مشمولہ مضامین تہذیب الاخلاق دوم،ص:۱۰۱

۳۰۔ حالی:مقدمہ شعروشاعری،ص:۱۴۷۔بحوالہ:سرسیداوراردو زبان وادب،قمرالہدیٰ فریدی،۱۹۸۹ء،ص:۳۰

۳۱۔ آخری پرچہ،تہذیب الاخلاق،۱۲۹۴ھ،مشمولہ:مقالات سرسید،حصہ دہم،ص:۶۱۔بحوالہ:سرسیداوراردو زبان و ادب،قمرالہدیٰ فریدی،۱۹۸۹ء،ص:۲۴

۳۲۔ مقالات شبلی،ج:۲،ص:۶۱۔بحوالہ:علی گڑھ کی علمی خدمات۔پروفیسر خلیق احمد نظامی،۱۹۹۴ء،نئی دہلی،ص:۱۳

۳۳۔ علی گڑھ کی علمی خدمات۔پروفیسر خلیق احمد نظامی،۱۹۹۴ء،نئی دہلی،ص:۱۶

۳۴۔ اردو نظم،مشمولہ:مقالات سرسید،حصہ دہم،ص:۱۲۲

۳۵۔ اردو نظم۔بحوالہ:سرسیداوراردو زبان وادب،قمرالہدیٰ فریدی،۱۹۸۹ء،ص:۶۶

۳۶۔ اردو نظم۔بحوالہ:سرسیداوراردو زبان وادب،قمرالہدیٰ فریدی،۱۹۸۹ء،ص:۶۶۔۶۷

۳۷۔ کانووکیشن ایڈریس،۲۰رفروری ۱۹۴۹ء،ص:۶۔۷۔بحوالہ:علی گڑھ کی علمی خدمات۔پروفیسر خلیق احمد نظامی، ۱۹۹۴ء،نئی دہلی،ص:۱۲

۳۸۔ حیات شبلی،ص:۱۳۶۔بحوالہ:علی گڑھ کی علمی خدمات۔پروفیسر خلیق احمد نظامی،۱۹۹۴ء،نئی دہلی،ص:۲۸

۳۹۔ ایضاً۔ص:۱۷۲

۴۰۔ المامون (قومی پریس،لکھنؤ چوک)،ص:۱۰۴،دیباچہ۔بحوالہ:علی گڑھ کی علمی خدمات۔پروفیسر خلیق احمد نظامی، ۱۹۹۴ء،نئی دہلی،ص:۳۳

۴۱۔ یادرفتگان،ص:۱۳۲۔بحوالہ:علی گڑھ کی علمی خدمات۔پروفیسر خلیق احمد نظامی،۱۹۹۴ء،نئی دہلی،ص:۳۴

۴۲۔ ایضاً۔ص:۱۳۲

۴۳۔ علی گڑھ کی علمی خدمات۔پروفیسر خلیق احمد نظامی،۱۹۹۴ء،نئی دہلی،ص:۳۷۔۳۸

۴۴۔ ایضاً۔ص:۳۸۔۳۹

۴۵۔ چند ہم عصر علی گڑھ،ص:۱۴۸۔بحوالہ:علی گڑھ کی علمی خدمات۔پروفیسر خلیق احمد نظامی،۱۹۹۴ء،نئی دہلی،ص:۴۰

۴۶۔ معارف،مئی ۱۹۴۳ء۔بحوالہ:علی گڑھ کی علمی خدمات۔پروفیسر خلیق احمد نظامی،۱۹۹۴ء،نئی دہلی،ص:۴۱

۴۷۔ الفاظ (دوماہی)،جنوری فروری ۱۹۸۰ء،اقبال کے خطوط کا عکس،ص:۵۔۶۔بحوالہ:علی گڑھ کی علمی خدمات۔ پروفیسر خلیق احمد نظامی،۱۹۹۴ء،نئی دہلی،ص:۴۱

۴۸۔ افادیت مہدی،ص:۶۔بحوالہ:علی گڑھ کی علمی خدمات۔پروفیسر خلیق احمد نظامی،۱۹۹۴ء،نئی دہلی،ص:۴۲

۴۹۔ معارف،دسمبر۱۹۲۱ء۔بحوالہ:علی گڑھ کی علمی خدمات۔پروفیسر خلیق احمد نظامی،۱۹۹۴ء،نئی دہلی،ص:۴۲

۵۰۔ نقوش۔شخصیات نمبر،ص:۳۸۔بحوالہ:علی گڑھ کی علمی خدمات۔پروفیسر خلیق احمد نظامی،۱۹۹۴ء،نئی دہلی،ص:۴۲

۵۱۔ چند ہم عصر،ص:۱۱۳۔بحوالہ:علی گڑھ کی علمی خدمات۔پروفیسر خلیق احمد نظامی،۱۹۹۴ء،نئی دہلی،ص:۴۳

۵۲۔ مقدمہ شعروشاعری۔خواجہ الطاف حسین حالی،ص:۱۵۸۔۱۵۹

۵۳۔ حالی کا ذہنی ارتقا۔از جناب ڈاکٹر غلام مصطفیٰ خاں،ص:۶۶۔۶۷

۵۴۔ مقدمہ شعروشاعری،ص:۱۵۸۔۱۵۹۔بحوالہ:سرسید اور اردو زبان وادب،قمر الہدیٰ فریدی،۱۹۸۹ء،ص:۳۱

۵۵۔ سید عبداللہ،اشارت تنقید۔ص ص:۱۶۱۔۱۶۲۔بحوالہ:سرسید اور اردو زبان وادب،قمر الہدیٰ فریدی،۱۹۸۹ء،ص:۳۱

۵۶۔ تقریر اجلاس محمڈن ایجوکیشنل کانفرنس،۲۷/دسمبر۱۸۹۴ء،مشمولہ مکمل مجموعہ لکچرز واسپیچز،ص:۴۶۱۔بحوالہ:سرسید اور اردو زبان وادب،قمر الہدیٰ فریدی،۱۹۸۹ء،ص:۳۰

۵۷۔ مقدمہ شعروشاعری،ص:۱۵۶۔بحوالہ:سرسید اور اردو زبان وادب،قمر الہدیٰ فریدی،۱۹۸۹ء،ص:۳۰

۵۸۔ خطوط سرسید،ص:۲۲۔بحوالہ:علی گڑھ کی علمی خدمات۔پروفیسر خلیق احمد نظامی،۱۹۹۴ء،نئی دہلی،ص:۱۴

۵۹۔ علی گڑھ کی علمی خدمات۔پروفیسر خلیق احمد نظامی،۱۹۹۴ء،نئی دہلی،ص:۱۴۔۱۵

۶۰۔ مقدمہ مسدس حالی،صدی ایڈیشن ۱۹۳۵ء،دہلی،ص:۲۷۔بحوالہ:علی گڑھ کی علمی خدمات۔پروفیسر خلیق احمد نظامی، ۱۹۹۴ء،نئی دہلی،ص:۱۵

۶۱۔ نئے اور پرانے چراغ ۱۹۵۰ء۔از آل احمد سرور،ص:۲۵۔بحوالہ اردو ادب کے ارتقا میں ادبی تحریکوں اور رجحانوں کا حصہ۔ڈاکٹر منظر اعظمی،ص:۲۶۸

۶۲۔ اردو ادب کے ارتقا میں ادبی تحریکوں اور رجحانوں کا حصہ۔ڈاکٹر منظر اعظمی،ص:۲۷۴

۶۳۔ سرسید اور ان کے نامور رفقا۔سید عبداللہ،ص:۱۴۳

۶۴۔ سرسید اور ان کے نامور رفقا۔سید عبداللہ،ص۱۴۳

۶۵۔ ایضاً۔ص:۱۵۰

۶۶۔ ایضاً۔ص:۳۴۴

۶۷۔ ایضاً۔ص:۳۴۷

۶۸۔ ایضاً۔ص:۸۰

۶۹۔ سرسید مرحوم اور اردو لٹریچر،مشمولہ انتخاب مضامین سرسید۔مرتبہ رشید حسن خاں،ص:۲۸

۷۰۔ ذکر پرچہ تہذیب الاخلاق، تہذیب الاخلاق یکم محرم ۱۲۹۰ھ، مشمولات: مقالات سرسید، حصہ دہم، ص ص: ۸۵۔۸۶۔ بحوالہ: سرسید اور اردو زبان و ادب، قمر الہدیٰ فریدی، ۱۹۸۹ء، ص: ۲۶

۷۱۔ لکچر سرسید، محمڈن ایجوکیشنل کانفرنس ۲۷ر دسمبر ۱۸۹۴ء۔ بحوالہ: سرسید اور اردو زبان و ادب، قمر الہدیٰ فریدی، ۱۹۸۹ء، ص: ۶۷

۷۲۔ علی گڑھ انسٹی ٹیوٹ گزٹ، ۸ر جنوری ۱۸۸۱ء۔ بحوالہ: سرسید اور اردو زبان و ادب، قمر الہدیٰ فریدی، ۱۹۸۹ء، ص: ۷۳

۷۳۔ ترقی علم انشا، مقالات سرسید حصہ دہم، ص: ۱۱۶۔ بحوالہ: سرسید اور اردو زبان و ادب، قمر الہدیٰ فریدی، ۱۹۸۹ء، ص: ۷۲

۷۴۔ لکچروں کا مجموعہ، مرتبہ: منشی سراج الدین، لاہور ۱۸۹۰ء، ص: ۲۳۲۔ بحوالہ: علی گڑھ کی علمی خدمات۔ پروفیسر خلیق احمد نظامی، ۱۹۹۴ء، نئی دہلی، ص: ۱۷

●●●

علی گڑھ تحریک کا ردّعمل

علی گڑھ تحریک جس کا اہم اور بنیادی مقصد یہ تھا کہ حقیقت کی تلاش جذب وتقلید کے ذریعہ نہیں بلکہ عقل وتحقیق کے ذریعے ہی کی جائے۔لہٰذا یہی نظریہ اس کی مخالفت کا اہم سبب بنا۔اس مخالفت کا اہم مقصد عقلیت سے نجات حاصل کرنا اور وجدان کے سہارے براہِ راست جذبات کی آغوش میں پہنچنا تھا تاکہ علی گڑھ تحریک کی مادیت،عقلیت،اجتماعیت اور نیچریت سے روگردانی کر کے انفرادی وجذباتی، خوش ذوق ورنگین اور حسن پرست ادب کو وجود میں لایا جاسکے۔

علی گڑھ تحریک کی مخالفت کی کئی اہم وجوہات ہیں۔مثلاً مذہب میں مداخلت،جدید تعلیم کی حمایت، انگریزوں سے ربط وضبط اور ان کے تہذیبی وتمدنی اثرات کو قبول کرنے کی وکالت۔سرسید احمد خاں سے نجی بغض وحسد۔

مذہب میں مداخلت:

سرسید کی مخالفت کی ایک وجہ مذہب میں مداخلت ہے۔جب کہ یہ مداخلت سرسید نے دانستہ طور پر نہیں کی تھی بلکہ اس وقت اور حالات نے انھیں مجبور کیا اور وہ مذہب کی گہرائی تک پہنچ کر مسلمانوں کو تباہی وبربادی سے نجات دلانے کے لیے اُٹھ کھڑے ہوئے۔

حالاں کہ سرسید خالص جدید تعلیم کے ہی حامی نہ تھے بلکہ انھوں نے لوگوں کی توجہ مذہب کی جانب بھی مرکوز کرائی۔ وہ چاہتے تھے کہ مسلمان دین اور دنیا دونوں کو ساتھ لے کر چلیں، ان میں سے ہر ایک کا پلڑا برابر ہو۔ اگر ایک بھی پلڑا برابر نہ ہوگا تو پھر قوم نہ دین کی رہے گی اور نہ دنیا کی۔ اس بات کو انھوں نے اپنی تحریروں اور تقریروں میں بھی بیان کیا ہے۔ سرسید نے ۱۸۷۶ء کی اپنی ایک اسپیچ میں کہا تھا کہ:

> ''یاد رکھو سب سے سچا کلمہ لا الہ الا اللہ محمد رسول اللہ ہے، اسی پر یقین کرنے سے ہماری قوم ہماری قوم ہے۔ اگر تم نے سب کچھ یاد کیا اور اس پر یقین نہ کیا تو تم ہماری قوم نہ رہے۔ پھر اگر تم آسمان کے تارے ہوگئے تو کیا؟ پس امید ہے کہ تم ان دونوں باتوں (یعنی علم اور اسلام) کے نمونے ہوگے اور جبھی ہماری قوم کو عزت ہوگی۔''[1]

انھوں نے ایک موقع پر کہا کہ:

> ''یہ حکمت و فلسفہ جو اس زمانہ میں سچا مانا جاتا ہے اگر آئندہ غلط ثابت ہو جیسے کہ یونانی حکمت اب ثابت ہوتی ہے اور حکمت و فلسفہ کے بالکل نئے اصول سچے ثابت ہوں تو بھی میں دعویٰ کرتا ہوں کہ قرآن مجید ایسا ہی سچا ثابت ہوگا جیسا کہ اب سچا ہے، اور غور کرنے کے بعد ثابت ہوگا کہ جو کچھ غلطی تھی وہ ہمارے ہی علم کا نقصان تھا۔ مگر قرآن ویسا ہی سچا ہے۔''[2]

سرسید احمد خان نے اپنی ایک اسپیچ میں اس معاملے کے متعلق اپنے تمام خیالات مفصل طور پر بیان کیے ہیں جن میں سے چند فقرے مختلف مقالات سے یہاں نقل کیے جاتے ہیں۔ انھوں نے کہا کہ:

''جو لوگ بلا فلسفی دلیل و حجت کے اسلام پر یقین رکھتے ہیں بلا شک ان کا ایمان اور ان کا یقین بہ نسبت ان لوگوں کے جو دلیل و حجت سے اپنے عقیدے کو مستحکم کرتے ہیں بہت زیادہ مستحکم ہے۔ کیوں کہ ان کے دل میں کسی قسم کے شک وشبہ نے راہ نہیں پائی اور نہ راہ پانے کی اس میں گنجائش ہے۔.....میں تم سے سچ کہتا ہوں کہ ان کے ایمان کو (میں اور کسی سے کیوں کہوں) اپنے ایمان سے تو بہت زیادہ مستحکم جانتا ہوں..... خدا کے ماننے اور رسول پر یقین کرنے کے لیے ان کو کسی منطقی دلیل اور فلسفی برہان کی حاجت نہیں۔ کیسی ہی کوئی بات خارج از عقل و نا قابلِ یقین صحیح یا غلط ان کے سامنے یہ کہہ کر ''خدا اور رسول نے فرمایا ہے'' بیان کی جائے وہ فوراً اس پر یقین کریں گے۔ پس ایسے لوگ ہماری بحث سے بالکل خارج ہیں۔ میں ان کو یقین کا ستارہ اور اسلام پر یقین کرنے کا نمونہ سمجھتا ہوں اور ٹھیک مسلمان جانتا ہوں۔''

''مگر ان کے سوا ایک اور فرقہ بھی ہے جو ہر چیز کی صداقت کے لیے دلیل چاہتا ہے اور اس بات کا خواہش مند ہے کہ اسلام کے عقائد فلسفی دلائل سے اس کو بتائے جائیں اور اس کے دل کے شبہے مٹائے جائیں تا کہ اس کے دل کو تشفی ہو.....وہ یہ نہیں چاہتا کہ دل میں تو دھڑ پکڑ ہو اور وہ زبان سے لوگوں کے ڈر یا سوسائٹی کے دباؤ سے ہاں ہاں کیا کرے، یہی وہ لوگ ہیں جو ہمارے مخاطب ہیں اور جن کو ہم سے بحث ہے۔''

''جس زمانہ میں خلفاے عباسیہ کی سلطنت رونق پر تھی.....اس وقت مسلمانوں میں فلسفۂ یونانی اور علم نے کثرت سے رواج پایا تھا۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ بہت

سے مسائل میں جو اسلام سے متعلق تھے لوگوں کو شبہ پیدا ہوا، کیوں کہ جو لوگ ان مسائل فلسفہ، علم طبیعی کو سچ جانتے تھے اور ان میں اور اسلام کے مسائل میں اختلاف پاتے تھے ان کو اسلام کی نسبت شبہ پیدا ہوتا تھا۔..... وہ زمانہ اسلام پر ایسا سخت تھا کہ اسلام کے سخت سے سخت دشمن کے حملے سے بھی اس سے زیادہ نقصان پہنچنے کا اندیشہ نہ تھا۔ علما کو اس وقت اسلام کی حمایت کی ضرورت پڑی اور انھوں نے اس کی حمایت اور نصرت میں کوشش کی، خدا ان کی کوششوں کو قبول کرے..... پس میرا خیال ہے کہ جس زمانے میں اسلام کی ایسی حالت ہو اور اس پر ایسا ہی حملہ ہو جیسا کہ اس زمانے میں ہوا تھا تو ہم کو بقدر اپنی لیاقت کے ویسی ہی کوشش کرنی چاہیے۔''

''اے دوستو خوب جانتے ہو کہ اس زمانہ میں جدید فلسفہ و حکمت نے شیوع پایا ہے جس کے مسائل ان اگلے مسائل سے بالکل مختلف ہیں اور وہ مروجہ مسائل اسلام کے ایسے ہی برخلاف ہیں جیسے کہ اس زمانے میں تھے۔..... مگر اس زمانے کی تحقیقات اور یونانی حکمت کے مسائل میں ایک بڑا فرق یہ ہے کہ اس زمانہ کے مسائل حکمیہ زیادہ تر عقلی اور قیاسی دلیلوں پر مبنی تھے۔..... ہمارے بزرگوں کو نہایت آسانی تھی کہ قیاسی مسائل کو قیاسی دلائل سے اور عقلی مسائل کو عقلی براہین سے توڑ دیں اور ان کو تسلیم نہ کریں، مگر اس زمانہ میں..... مسائل علم طبیعی تجربہ سے ثابت کیے جاتے ہیں اور وہ دکھلا دیے جاتے ہیں۔ یہ مسائل ایسے نہیں ہیں کہ قیاسی دلائل سے اٹھا دیے جائیں یا ان تقریروں اور اصولوں سے جو اگلے زمانے کے عالموں نے قرار دیے ہیں ہم ان کا مقابلہ کر سکیں۔''

''اس لیے اس زمانے میں.....ایک جدید علم کلام کی حاجت ہے جس سے یا تو ہم علوم جدیدہ کے مسائل کو باطل کر دیں یا مشتبہ ٹھہرا دیں، یا اسلام کے مسائل کو ان سے مطابق کر دکھائیں۔ اس وقت جو بزرگ اس جلسہ میں موجود ہیں، میں ان سب سے واقف نہیں ہوں مگر میں یقین کرتا ہوں کہ یہاں بہت سے ذی علم لوگ بھی موجود ہیں۔ میں سچ کہتا ہوں کہ میرے نزدیک جو لوگ ایسا کرنے کے لائق ہیں اور وہ پوری کوشش حال کے علم طبیعی وفلسفہ کے مسائل کو اسلامی مسائل سے تطبیق دینے یا ان کا بطلان ثابت کرنے میں نہ کریں گے وہ سب گنہ گار ہیں اور یقیناً گنہ گار ہیں۔''

''میں ایک شخص ہوں جس کا یہ یقین ہے کہ کوئی شخص ایسا نہیں ہے جو جدید فلسفہ اور جدید علم طبیعی سے بخوبی واقف ہو اور ان تمام اسلامی مسائل پر جو اس زمانے میں اسلامی مسائل کہلاتے ہیں یقین رکھتا ہوں۔ انگریزی خواں نوجوان مجھے معاف کریں گے۔ میں نے کوئی انگریزی خواں جس کو انگریزی علوم کا مذاق بھی حاصل ہو گیا ہو ایسا نہیں دیکھا جس کو پورا پورا یقین ہمارے زمانے کے مروجہ مسائل اسلام پر ہو۔ میں یقین کرتا ہوں کہ جس قدر یہ علوم پھیلیں گے اور ان کا پھیلنا ضروری ہے اور میں خود بھی ان کے پھیلانے میں معین و مددگار ہوں۔ اسی قدر لوگوں کے دلوں میں مروجہ اسلام کی جانب سے بدظنی، بے پروائی، بلکہ روگردانی ہوتی جائے گی۔ میرا یہ بھی یقین ہے کہ اصلی مذہب کا یہ نقصان نہیں ہے بلکہ یہ ان غلطیوں کا سبب ہے جو اسلام کے نورانی چہرہ پر لگ گئی ہیں یا نادانستہ لگا دی گئی ہیں۔''

''میں ہرگز اس لائق نہیں ہوں کہ اسلام کے نورانی چہرہ پر سے ان غلطیوں کے سیاہ دھبوں کے چھڑانے کا دعویٰ کروں یا جماعتِ اسلام کا کام اپنے ذمہ لوں۔ یہ منصب اور یہ فرض دوسرے مقدس و باعلم لوگوں کا ہے مگر جیسا کہ میں مسلمانوں میں ان علوم کے پھیلانے کا ساعی ہوں جن کی نسبت میں نے ابھی بیان کیا کہ وہ اسلام کے کس قدر مخالف ہیں۔ تو میرا فرض تھا کہ جہاں تک مجھ سے ہو سکے صحیح یا غلط جو کچھ میرے امکان میں ہو اس طرح اسلام کی حمایت کروں اور اس کے اصلی نورانی چہرہ کو لوگوں کو دکھلاؤں۔ میرا کانسنس مجھ سے کہتا تھا کہ اگر میں ایسا نہ کروں گا تو خدا کے سامنے گنہ گار ہوں گا۔''

''اے میرے دوستو میں یہ نہیں کہتا کہ جو کچھ میری تحقیقات ہے وہی صحیح ہے۔ مگر مجھ کو بجز اس کے کہ جو کچھ مجھ سے ہو سکے وہ کروں، اور کچھ چارہ کار نہ تھا مجھ کو ضرور وہی کرنا تھا جو میں نے کیا یا کرتا ہوں۔ میری نیت خالص خدا کے ساتھ ہے، اگر میں نے برا کیا ہے وہ چاہے گا معاف کرے گا چاہے گا نہ کرے گا۔ اگر میں نے اچھا کیا ہے تو میں اس کا صلہ کسی بندہ سے نہیں چاہتا اور یہی وجہ ہے کہ نہ میں لوگوں کے کافر یا نیچری کہنے سے ڈرتا ہوں اور نہ برا مانتا ہوں۔ جو لوگ میری ان کوششوں کے سبب برا کہتے ہیں کافر بتلاتے ہیں، میں ان سے اپنی شفاعت کا خواست گار نہیں ہوں اور نہ ہوں گا۔ جو بھلا یا برا میرا معاملہ ہے وہ خدا کے ساتھ ہے۔ اگر مجھ سے کچھ غلطی ہوئی ہے یا آئندہ ہوگی خدا سے مجھے امید ہے کہ وہ مجھ پر رحم کرے گا۔''[۳]

جدید تعلیم کی حمایت انگریزوں سے ربط وضبط اوران کے تہذیبی وتمدنی اثرات قبول کرنے کی وکالت:

سرسید احمد خاں انگریزوں کی ہر ایک چیز سے متاثر تھے اور جگہ جگہ انھوں نے ان کی تعریف کی ہے اوران کے مقابلے میں ہندوستانیوں کو ادنیٰ درجہ کا بتایا ہے۔ ملاحظہ ہو:

''میں بلا مبالغہ سچے دل سے کہتا ہوں کہ تمام ہندوستانیوں کو اعلیٰ سے لے کر ادنیٰ تک، امیر سے لے کر غریب تک، سوداگر سے لے کر اہلِ حرفہ تک، عالم فاضل سے لے کر جاہل تک، انگریزوں کی تعلیم وتربیت اور شائستگی کے مقابلے میں درحقیقت ایسی ہی نسبت ہے جیسے نہایت لائق اور خوب صورت آدمی کے سامنے نہایت میلے کچیلے وحشی جانور کو۔ پس تم کسی جانور کو قابلِ تعظیم یا لائق ادب کے سمجھتے ہو؟ کچھ اس کے اخلاق اور بداخلاقی کا خیال کرتے ہو؟ ہرگز نہیں کرتے۔ پس ہمارا کچھ حق نہیں ہے (اگرچہ وجہ ہے) کہ انگریز ہم ہندوستانیوں کو ہندوستان میں کیوں نہ وحشی جانور کی طرح سمجھیں..... مادرزاد اندھا آپ کی دانست میں سورج کی روشنی کی کیفیت یا چاندنی کی خوش نمائی کی فرحت سمجھ سکتا ہے یا خیال میں لاسکتا ہے؟ .....تمام خوبیاں دینی اور دنیوی جو انسان میں ہونی چاہئیں وہ خداتعالیٰ نے یوروپ کو اور اس میں بالتخصیص انگلینڈ کو مرحمت فرمائی ہیں۔ دینی خوبیوں سے میرا مطلب یہ ہے کہ جس دین کو وہ لوگ حق سمجھتے ہیں ایسی خوب صورتی اور ایسی عمدگی سے اس کے تمام متعلقات کو پورا کرتے ہیں اور انجام دیتے ہیں کہ کسی ملک میں اور کوئی مذہب والے اس خوبی وخوش اسلوبی وسلیقہ سے نہیں کرتے۔..... فرض کرو کہ ہندوستانی اور انگریز ایک آزاد ملک میں بسوے جائیں اور بالفعل جو عادتیں

اور طرزِ زندگی اور پرائیویٹ لائف ہندوستانیوں کی ہے وہ ایسی ہے رہے اور جو انگریزوں کی ہے وہ ویسی ہی رہے تو ہرگز انگریز ہندوستانیوں کے پاس بھی نہ کھڑے ہوں اور جانور سے زیادہ نہ سمجھیں۔ میں بے شک ہندوستان کے انگریزوں کو کہتا ہوں کہ ہندوستانیوں کے ساتھ نہایت بداخلاق ہیں اور ان کو ایسا ہونا نہیں چاہیے تو اس کی وجہ یہ نہیں ہے کہ باعتبار شائستگی سے میں ہندوستانیوں کو اس کا مستحق ٹھہراتا ہوں بلکہ اس وجہ سے کہتا ہوں کہ انگریزوں کو خود اپنی شائستگی کے لحاظ سے ایسا کرنا خود اپنی تربیت اور شائستگی پر بٹہ لگانا اور حقیقت میں عام شائستگی کے پھیلنے کو سدِّ راہ ہوتا ہے اور لاکھوں باتوں کو کروڑوں منافع عام کو نقصان پہنچاتا ہے۔''[۴]

سرسید انگریز حکومت کی تعریف کرتے ہوئے کہتے ہیں کہ:

''(۱) ہم نے اپنے مللک کی بھلائی کے لیے انگلش حکومت قائم کی۔

(۲) ہندوستان ایک بیوہ ہے جس نے خود انگلش نیشن کو اپنا شوہر بنالیا۔

(۳) پس لازم آتا ہے کہ ہندوستان کی امن کے لیے اور ملک میں ہر چیز کی ترقی کے لیے انگلش گورنمنٹ کا بہت دنوں تک بلکہ ہمیشہ کے لیے رہنا ضروری ہے۔

(۴) انگریزوں نے ہندوستان کے اور اس کے ساتھ ہم کو فتح کرلیا ہے اور جس طرح ہم نے اس ملک کو تابع دار یا غلام بنالیا تھا اسی طرح انھوں نے ہم کو بھی تابع دار یا غلام بنالیا ہے۔

(۵) جب یہ امر طے ہوگیا کہ ہندوستان میں انگلش گورنمنٹ کی حکومت ضروری ہے تو ہندوستان کے لیے یہی مفید ہے کہ اس کی حکومت نہایت

استحکام سے ہندوستان میں قائم رہے اور گورنمنٹ کے لیے بھی یہی مفید ہے کہ وہ اپنے استحکام کے لیے جس قدر مناسب سمجھے فوج رکھے اور اپنے افسر فوج میں مقرر کرے۔

(۶) تم اس قوم کے ساتھ ناانصافی نہ کرو جو تم پر حکومت اور پھر اس کے ساتھ غور کرو، وہ کس ایمان داری سے حکومت کرتی ہے جس خوبی سے انگلش گورنمنٹ نے غیر قوم پر حکومت کی ہے۔ دنیا کی تاریخ میں اس کی نظیر نہیں ملتی۔

(۷) کون شخص اس بات سے انکار کرسکتا ہے کہ اس زمانے میں جس قدر مذہبی آزادی ہندوستان کے مسلمانوں کو حاصل ہے اور جو امن وامان اس ملک کے درمیان پھیلا ہوا ہے وہ خدا کی ایک نعمت ہے جس کا شکر ادا کرنا ہر مسلمان اور اس ملک کے باشندے پر فرض ہے۔''[۵]

سرسید نے کہا کہ:

''اے دوستو آپ یقین کریں کہ جب تک ہم اپنی قوم کے لیے اعلیٰ درجہ کی انسٹی ٹیوشن، خواہ تعلیم کے ہوں یا بچوں کی پرورش کے، قائم نہ کریں اور عمدہ سے عمدہ سامان تعلیم کا جمع نہ کریں گے جو مثل یا قریب قریب یوروپ کے انسٹی ٹیوشنوں کے ہو اور اپنے نوجوانوں کو ویسے ہی اعلیٰ درجے کے اصول پر جیسے کہ یوروپ میں ہیں، تعلیم وتربیت نہ دیں گے اس وقت تک ہماری قومی ترقی ہونی ممکن نہیں ہے۔''[۶]

سرسید زمانے کے مطابق مسلمانوں میں تبدیلی کے خواہاں تھے، لیکن سرسید کے یہی خیالات و افکار ان کے اختلاف کی وجہ ثابت ہوئے۔ چنانچہ ان کے اپنے عزیز دوستوں نے بھی ان کی اس سوچ کو

لے کر اختلاف کیا۔ ڈپٹی نذیر احمد لکھتے ہیں کہ:

''پس جو لوگ انگریزی تمدن، انگریزی تمدن پکار رہے ہیں، اس تہہ کو نہیں پہنچتے کہ مذاقوں کے اختلاف قدرتی باتیں ہیں۔ کسی کا جو طرز ہے وہ اسی کو پسند کرتا ہے اسی میں اس کو راحت ملتی ہے اور آخر تک اس کو اسی طرز پر چلا جانا چاہیے۔ ہم جانتے ہیں کہ انگریز اپنی تمام حالتوں میں نمایاں ترقی کر رہے ہیں اور اپنے طرز تمدن کی اصلاح سے بھی غافل نہیں ہیں، باایں ہمہ یہ فرض کر لینا کہ ان کا تمدن اعلیٰ درجے کی شائستگی کو پہنچ گیا ہے غلط ہے۔ کھانے، کپڑے کی تو چھوٹی چھوٹی باتیں ہیں ہم کو تو ان کی سوسائٹی میں بڑی بڑی باتیں کھٹکتی ہیں۔''[۷]

شبلی نے کہا کہ:

''ارکان کالج سے ایک بڑا نکتہ جو فروگزاشت ہوا اور ہو رہا ہے وہ یہ ہے کہ موجودہ طریقہ سے وہ صرف ان لوگوں کو انگریزی تعلیم کی طرف متوجہ کر سکے اور کر سکتے ہیں جن کو معاش کی ضرورت نے انگریزی تعلیم پر مجبور کر رکھا ہے اور امرا اور رؤسا جن کو معاش کی فکر نہیں، وہ انگریزی کے واسطے آنکھ اٹھا کر بھی نہیں دیکھتے لیکن اگر انگریزی تعلیم کے ساتھ پورے طور سے عربی اور مذہبی تعلیم کا بھی بندوبست ہوتا تو علی گڑھ کالج کے احاطے میں تعلقہ داران اور اہالیانِ ملک کے خاندان کی یادگاریں بھی نظر آتیں..... میری ہرگز یہ رائے نہیں کہ مسلمانوں کو انگریزی تعلیم سے ہٹا کر عربی کی طرف متوجہ کیا جائے۔ ایسا کرنا بے شبہ قوم کے ساتھ دشمنی ہے لیکن اس بحث میں خواہ مخواہ علوم عربیہ

کی تحقیر میں ارکان کالج کا اس قسم کے فقرے استعمال کرنا کہ ہم سے ہرگز یہ توقع نہیں رکھنی چاہیے کہ ہم عربی تعلیم پر ایک حبہ بھی صَرف کریں گے، نہایت ظلم اور ناانصافی ہے اور اس سے ظاہر ہوسکتا ہے کہ ان لوگوں کے دل میں کیا جذبات پوشیدہ ہیں کہ یہ کہنا کہ عربی زبان ہماری مذہبی زبان نہیں ہے اور ہے تو صرف قرآن پڑھ لینا کافی ہے۔ ایک عامیانہ فریب دہی بلکہ بے ہودہ ڈپلومیسی ہے، صاف کہنا چاہیے کہ ہم کو قرآن کی بھی ضرورت نہیں..... عربی کی تحقیر نے ثابت کر دیا کہ قوم واقعی ذلت کے اخیر درجہ پر پہنچ گئی ہے، کیوں کہ کوئی قوم اس وقت تک ذلیل نہیں ہوتی جب تک وہ خود اپنے آپ کو ذلیل نہ سمجھے اور یہ درجہ اب قوم نے حاصل کرلیا۔''[۸]

۱۵ر جولائی ۱۸۸۵ کو حکومت ہند کا روز لیوشن جاری ہوا جس میں یہ بات کہی گئی تھی کہ:

''سرکاری ملازمتوں میں مسلمان اپنا حصہ پانے کے اس وقت مستحق ہوسکتے ہیں جب کہ وہ اعلا تعلیم میں ہندوؤں کے برابر چلیں۔''[۹]

پنڈت جواہر لال نہرو نے لکھا ہے کہ:

''سرسید کا یہ فیصلہ کہ تمام کوششیں مسلمانوں کو جدید تعلیم سے آراستہ کرنے پر صرف کر دینی چاہیے، یقیناً درست اور صحیح تھا۔ بغیر اس تعلیم کے میرا خیال ہے کہ مسلمان جدید طرز کی قومیت کی تعمیر میں کوئی موثر حصہ نہیں لے سکتے تھے، بلکہ یہ اندیشہ تھا کہ وہ ہمیشہ ہمیشہ کے لیے ہندوؤں کے غلام بن جائیں گے جو تعلیم میں بھی ان سے آگے تھے اور معاشی اعتبار سے بھی زیادہ مضبوط تھے۔''[۱۰]

اکبر کی مخالفت جدید تعلیم کی وجہ سے تھی، وہ سمجھتے تھے کہ یہ تعلیم مسلمانوں کو اپنے اسلاف، تاریخ، تہذیب اور دین سے منحرف کردے گی۔ اس لیے انھوں نے پوری پوری کوشش کی کہ مسلم قوم کو اس جدید تعلیم سے روکا جائے۔ لہٰذا وہ کہتے ہیں کہ:

واہ کیا راہ دکھائی ہمیں سرسید نے
گر دیا کعبہ کو گم اور کلیسا نہ ملا

انھیں سرسید سے شکایت تھی کہ ان کا ادارہ مسلم قوم کو تعلیم یافتہ کم انگریزوں کا خدمت گار زیادہ بنا رہا ہے اور انھیں اخلاقی طور پر بھی کمزور کر رہا ہے:

ادھر خیال نہیں مصلحانِ نیشن کا
کہ فرطِ ضعف نہیں وقت آپریشن کا
کیمبرج کی چاہیے ریڈر مجھے
شیخ سعدی کی کریمہ کیا کروں
انکار نہیں نماز روزے سے مجھے
لیکن یہ طریق اب ہے فیشن کے خلاف
اصل سے ہو کے جدا نشو ونما کی امید
مجھ کو حیرت ہے کہ بوڑھوں میں یہ بچپن کیسا

اس سلسلے میں اکبر نے طنز سے بھی کام لیا:

کون کہتا ہے کہ تو علم نہ پڑھ عقل نہ سیکھ
کون کہتا ہے کہ نہ کر حسرت لندن پیدا
پس یہ کہتا ہوں کہ ملت کے معانی کو نہ بھول
راہِ قومی کا تو خود ہی نہ ہو رہزن پیدا

مذہبی شاخ فقط ہے تری قومی ٹہنی
یہ جو ٹوٹی تو نہیں کوئی نشیمن پیدا

آگے اس طرح کہتے ہیں کہ:

کبر و تزئین و تحمل سے تجھے ہے کام
دل میں انکار ہے اور لب پہ ہے نام اسلام
طاعت حق کی تیرے قافلے میں گرد نہیں
نفسِ سرو نہیں ہے دل پر درد نہیں
شیخ جی اپنی سی بکتے ہی رہے
وہ تھیٹر میں تھرکتے ہی رہے
دوستوں نے انھیں کو خضر سمجھا ہے
ان کی چالیں تو لے جاتی ہیں اعداد کی طرف
دیکھ کے اک باضابطہ بھپکی
دنیا آپ کی جانب لپکی

آخر میں اکبر بھی سرسید کے خیالات سے متفق ہو گئے تھے:

واہ اے سید پاکیزہ گہر کیا کہنا
یہ دماغ اور یہ حکیمانہ نظر کیا کہنا
قوم کے عشق میں یہ سوزِ جگر کیا کہنا
ایک ہی دُھن میں ہوئی عمر بسر کیا کہنا

آل احمد سرور نے لکھا ہے کہ:

''سرسید کی تحریک پر اکبر کے طنزیہ نشتر بھی مشرقیت کے ایک جامد اور کھوکھلے تصور کو ظاہر کرتے ہیں۔ اکبر نے جہاں مغربی سامراج کی سیاسی چالوں کا پردہ فاش کیا ہے، جہاں سرکاری عقل اور بازاری تعلیم مغرب کی ذہنی غلامی اور اندھی تقلید کا مذاق اڑایا ہے وہاں انھوں نے ایک مفید خدمت انجام دی ہے۔ اسی طرح جب سرسید نے عقلیت کے تصور کو انیسویں صدی کی سائنسی میکانیت بنا دیا یا لباس، طعام انگریزی کے ذریعہ سے تعلیم اور سیاست میں انگریز دوستی کا پرچار کیا تو انھوں نے وقتی مصلحتوں کو مستقل قدریں سمجھا۔ مگر بحیثیت مجموعی اکبر کا تہذیبی تصور ناقص اور محدود اور سرسید کا تہذیبی تصور وسیع، حیات بخش اور نتیجہ خیز ہے۔ سرسید نے سرمایہ داری کے دور کی برکتوں کو دیکھ لیا تھا اور جاگیردارانہ تمدن کی زوال پذیر اور مٹتی ہوئی تقدیر پڑھ لی تھی.....قوم کی تہذیب کے بلند کرنے کے لیے انھوں نے ایک مضمون میں آزادیٔ رائے، درستی عقائد مذہبی، درستیِ خیالات و افعال، مذہبی تدقیق بعض مسائل مذہبی، تعلیم اطفال، سامانِ تعلیم کی فراہمی، عورتوں کی تعلیم اور تیز فنِ حرفہ کی ترویج پر زور دیا ہے۔

فرد کے لیے انھوں نے خودغرضی سے بچنے، عزت و غیرت کے حقیقی مفہوم کو سمجھنے، ضبط اوقات، اخلاق، صدقِ مقال، دوستوں سے راہ و رسم، طرز گفتگو، عورتوں کی حالت میں رفاہ، کثرت ازدواج کی مذمت، غلامی کے انسداد، رسومات شادی کی اصلاح، ترقی زراعت و ترقی تجارت کا خاص طور سے ذکر

کیا ہے..... تاریخی پس منظر میں یہ خیالات مجموعی طور پر بڑا وزن رکھتے ہیں اوران کے مطالعے کے بعد یہ بات اظہر من الشّمس ہو جاتی ہے کہ سرسید آرائشی یا مصنوعی تہذیب کے بجائے حقیقی اور زندہ تہذیب کا شعور رکھتے تھے۔..... سرسید کی انگریز پرستی کی وجہ سے ان پر بڑی لعن طعن کی گئی ہے۔ حالاں کہ اس زمانے میں ان کے جو مخالفین تھے، ان میں سے کوئی نہ اتنی دور بین اور نہ اتنی گہری نظر رکھتا تھا۔ علما انگریزوں کی مخالفت کو سیاسی ضرورت نہیں بلکہ مذہبی فریضہ سمجھتے تھے۔ جمال الدین افغانی کا نقطۂ نظر یک طرفہ اور حد سے زیادہ سادہ تھا۔ اودھ پنچ اور اکبر کی مخالفت قدامت پرستی اور رجعت پرستی پر مبنی تھی۔''[11]

سیاسی میدان میں بھی ان کو دوطرفہ مخالفت کا سامنا رہا۔ ایک غیر مسلم (ہندو) قوت کی طرف سے اور دوسرے ان مسلم اکابرین کی جانب سے جو ہندو مسلم اتحاد پر غیر متزلزل اعتقاد کی بنا پر یہ سوچنا بھی گوارہ نہ کرتے تھے کہ ہر دو اقوام کے مفادات ایک نہیں ہو سکتے۔ کیوں کہ دونوں کے مذاہب، دونوں کی تہذیب، دونوں کی تعلیمات اور دونوں کی بقا کے تقاضے جداگانہ ہیں۔ سید احمد نے صرف ایک واقعہ (ہندی اردو تنازعہ) سے یہ اندازہ لگا لیا تھا کہ مستقل قریب میں ہی یہ دونوں اقوام اپنے راستے علاحدہ علاحدہ بنانے پر مجبور ہوں گی۔ کیوں کہ اسی کی تہہ سے مذہب، تہذیب، سماجی اخلاقیات اور دیگر مسائل میں اختلافات جنم لیں گے۔ اس دور اندیشی نے انھیں ہمیشہ دوقومی نظریہ پر کاربند رکھا اور جب ۱۸۸۵ء میں انڈین نیشنل کانگریس وجود میں آئی تو سرسید نے مسلمانوں کو اس میں شریک ہونے سے منع کیا۔ کیوں کہ وہ اچھی طرح جانتے تھے کہ اگر مسلم قوم اس میں شرکت کرے گی تو وہ یقیناً تعلیم میں پیچھے رہ جائے گی اور اس وقت اس کو صرف جدید تعلیم پر ہی توجہ کرنی چاہیے۔ اس لیے انھوں نے انڈین نیشنل کانگریس

کے قیام کے دوسرے سال ۱۸۸۶ء میں محمڈن ایجوکیشنل کانگریس قائم کی تا کہ مسلمانوں کی تعلیمی سرگرمیوں کو بڑھایا جائے۔

چنانچہ سرسید کا یہ خیال بھی ان کی مخالفت کی بڑی اہم وجہ ثابت ہوا۔ کیوں کہ اس پر بڑے بڑے لوگوں نے اعتراض کیا۔ لہٰذا صاحب زادہ آفتاب احمد خاں نے انگلستان سے ۲۷ر نومبر ۱۸۹۳ء کے ایک روزنامچہ میں لکھا کہ:

''لندن کے اخبار ٹائمس میں میں نے پڑھا کہ لاہور میں مسلمانوں نے جلسہ کر کے یہ رزولیوشن پاس کیا کہ مسلمان نیشنل کانگریس سے قطعی علاحدہ رہیں۔ کیوں کہ مسلمان خیال کرتے ہیں کہ کانگریس مسلمانوں اور ملک کے مقاصد کے خلاف ہے۔ قیاس اور گمان غالب ہے کہ ایسا جلسہ سرسید احمد خاں کے مقلدین نے کیا ہوگا۔ مجھے افسوس ہے کہ بااثر مسلمانوں نے ایسا رویہ اختیار کیا ہے اور قومی تحریک اور اس کے فوائد کی اصلیت ابھی تک محسوس نہیں کی۔ ایسی تحریک کے متعلق سرسید احمد خاں کی پالیسی واقعی میری سمجھ میں نہیں آتی، جہاں تک میں سمجھتا ہوں کہ کانگریس کے مطمح نظر کی بابت یہ لوگ غلطی پر ہیں.....''[۱۲]

کچھ لوگوں کا خیال ہے کہ سرسید نے انڈین نیشنل کانگریس کی مخالفت کر کے ملک میں قومی یک جہتی کو صدمہ پہنچایا، لیکن واقعہ اس کے برخلاف ہے۔

پنڈت کشن پرشاد کول لکھتے ہیں کہ:

''شروع شروع میں جب سید احمد خاں نے اپنا رسالہ 'اسباب بغاوت ہند' لکھا اور اس کے کچھ اور عرصہ بعد تک کی ان کی تحریروں اور تقریروں سے ظاہر

ہوتا ہے کہ وہ ہندو اور مسلمانوں دونوں کی نیابت اور وکالت کے فرائض ادا کیا کرتے تھے لیکن جب ۱۸۶۷ء میں ہندوؤں کی طرف سے اردو کے خلاف جو شمالی ہند کی زبان تھی، ہندی زبان اور ناگری رسم الخط کے جاری کرنے کا مطالبہ پیش ہوا اور اس کے متعلق ایجی ٹیشن شروع ہوا اور بعد میں ۱۸۷۵ء میں آریہ سماج قائم ہوئی کہ جس میں مسلمانوں کے لیے کوئی جگہ اور گنجائش ہی نہ تھی۔ جس کی غرض پراچین آریہ سبھیتا کا واپس بلانا تھا، تو سید احمد خاں کا ماتھا ٹھنکا اور ہندوؤں کے خلاف ان میں بدظنی پیدا ہوئی۔'' [۱۳]

ایجوکیشنل کانفرنس کے قیام سے متعلق مولانا حالی لکھتے ہیں کہ:

''.....محمڈن کالج کی حالت جب کسی قدر اطمینان کے قابل ہوگئی تو سرسید کو یہ خیال ہوا کہ اگر بالفرض یہ کالج ہر طرح مکمل ہوگیا تو بھی اس سے قومی تعلیم کا مسئلہ حل نہیں ہوسکتا اور ایک کالج چھ کروڑ مسلمانوں کی تعلیم کی کفالت نہیں کرسکتا۔ اس کے سوا مسلمانوں کی قوم جو ہندوستان کے دور دراز حصوں میں پھیلی ہوئی ہے، وہ سب ایک دوسرے کی حالت سے محض بے خبر ہیں اور کوئی ذریعہ ایسا نہیں کہ مختلف صوبوں اور مختلف اضلاع کے لوگ کسی موقع پر آپس میں ایک جگہ جمع ہوں۔ اپنے اپنے خیالات قومی تعلیم اور قومی ترقی کی نسبت ایک دوسرے پر ظاہر کریں، ہر حصہ ملک کے مسلمانوں کی ترقی یا تنزل کا حال تمام قوم کو معلوم ہو اور مسلمان جو باوجود ایک قوم ہونے کے بمنزلہ مختلف قوموں کے ہو رہے ہیں ان میں قومی یگانگت اور ہمدردی پیدا ہو۔ اسی بنا پر جیسا کہ سرسید نے پہلے اجلاس میں بیان کیا تھا یہ کانفرنس قائم کی گئی۔.....'' [۱۴]

''ایجوکیشنل کانفرنس نے مسلمانانِ ہند کی شیرازہ بندی کا کام کیا۔ مسلمانوں کو اپنے اجتماعی مسائل پر ایک ساتھ مل کر غور کرنے اور انھیں حل کرنے کا نیا راستہ دکھایا اور حکومت وقت کو بھی ان مسائل پر متوجہ رکھا۔ غریب طلبا کے لیے وظائف کا انتظام کیا، سرسید کی تعلیمی تحریک کو ملک گیر پیمانے پر پھیلایا، ملک میں متعدد مسلم اسکولوں اور کالجوں کے قیام میں مدد پہنچائی اور خود ایم۔اے۔او کالج کی ترقی کے لیے راہیں ہموار کر کے مسلم یونیورسٹی کی تحریک کو تقویت بخشی۔ اسی طرح تعلیم نسواں کے انتظام میں بھی کوشش کی۔ اس کانفرنس کے ذریعہ مسلمانوں کی معاشرتی اور مذہبی اصلاح کا کام بھی ہوا۔ انجمن ترقی اردو بھی اسی کانفرنس کی ساختہ پرداختہ ہے۔''[۱۵]

مولانا حالی نے مخالفتوں کو خودغرضی اور ذاتی عناد قرار دیتے ہوئے کہا کہ:

''سرسید کی مخالفت اگر محض دین داری اور حمیت اسلام کی بنیاد پر کی جاتی تو کوئی تعجب کی بات نہ تھی، بلکہ اس کا نہ ہونا تعجب تھا۔.....مگر افسوس اور نہایت افسوس کہ زیادہ مخالفتیں محض نفسانیت، خودغرضی یا عناد پر مبنی ہوئی تھیں اور اسی سے بجائے اس کے کہ سرسید کے اقوال جو انھوں نے مذہبی مسائل کے متعلق جمہور کے خلاف لکھے ہیں راہ راست بے کم و کاست بیان کیے جاتے۔ بیسوں باتیں ان کی نسبت غلط مشہور کی گئیں۔ ان کی تفسیر کی نسبت اس بات کو عموماً شہرت دی گئی کہ سید احمد خاں نے قرآن کے تیس پاروں میں سے دس چھانٹ لیے ہیں اور بیس نکال ڈالے ہیں۔''[۱۶]

مخالفت کے حوالے سے حالی لکھتے ہیں کہ:

''اوّل تو مذہبی خیالات ایسی چیز ہیں کہ جس طرح ان کا یقین کسی دلیل سے پیدا نہیں ہوتا، اسی طرح وہ کسی دلیل سے زائل بھی نہیں ہوتا۔ اس کے سوا اسلامی سلطنتوں میں اگرچہ غیر قوموں کے مذہب سے بہت ہی کم تعرض کیا گیا۔ مگر خود مسلمانوں کو مذہبی آزادی جیسی کہ چاہیے کبھی نصیب نہیں ہوئی۔ جس ملک میں جو فرقہ برسرِ حکومت ہوا اس ملک میں ہمیشہ اسی فرقہ کے مذہب نے رواج پایا۔ باقی تمام فرقے مضمحل و متلاشی ہو گئے۔ جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ مسلمانوں میں آزادیٔ رائے بالکل معدوم ہو گئی اور تقلید کی بدترین غلامی تمام قوم کا شعار بن گئی۔ پس ایک ایسی آواز جس سے کبھی کسی کے کان آشنا نہ ہوئے تھے اس کو مسلمان کیوں کر بغیر نفرت اور کراہت کے سُن سکتے تھے.....

ایک اور عام سبب مخالفت کا خاص کر مسلمانوں میں قومی تنزل ہے جس کے سبب سے ہمیشہ گری ہوئی قوموں میں خود غرضی، بغض، حسد، جہالت وغیرہ خود بخود بڑھ جاتے ہیں۔ لوگ عموماً لڑائی جھگڑے مول خریدنے لگتے ہیں اور ذرا ذرا سی بات پر مخالف پارٹیاں قائم ہو جاتی ہیں۔ یہ ایسی مخالفت ہے کہ اگر سرسید ریفارمیشن کا کام اختیار نہ کرتے اور مذہبی امور میں ایک حرف بھی جمہور کے خلاف زبان سے نہ نکالتے بلکہ عام انگریزی اسکولوں کے نمونہ پر ایک مدرسہ قائم کر دیتے تو بھی مخالفت سے ہرگز نہ بچ سکتے تھے۔ جب ندوۃ العلما جو خاص کر دینی تعلیم اور دینی اغراض کے لیے اکثر علما اسلام کے اتفاق سے قائم ہوئی ہے، مخالفت سے نہ بچی تو اور کسی کو اس سے بچنے کی کیا امید ہو سکتی

ہے۔ اگر ہمارا قیاس غلط نہ ہوتو کوئی اسلامی انجمن، کوئی اسلامیہ مدرسہ اور کوئی مسلمانوں کی عام بھلائی کا کام آج کل ایسا نہیں کیا جا سکتا جس کی مخالفت نہ ہوتی ہو۔ پس سرسید کو مخالفت سے کسی طرح مفر نہ تھا۔''[۱۷]

عرض یہ کہ سرسید کے یہی خیالات ان کی مخالفت کی وجہ بنے لیکن اس مخالفت میں سب سے اہم 'ادب میں سادہ و سنجیدہ انداز و اسلوب' ہے۔

ادب میں سادہ و سنجیدہ انداز و اسلوب، مخالفت کا یہ حصہ سب سے اہم ہے۔ کیوں کہ ادب کے خلاف آواز بلند کرنے والوں میں بڑے بڑے ادیب و انشا پردازوں نے حصہ لیا تھا۔ مثلاً سجاد حیدر یلدرم، مہدی الافادی، عبدالرحمٰن بجنوری، سجاد انصاری، اکبرالہ آبادی، حسرت موہانی، ابوالکلام آزاد اور قاضی عبدالغفار وغیرہ۔ انھوں نے علی گڑھ تحریک کی عقلیت، توازن، مقصدیت، تکمیلِ بیان اور اسلوب کی سادگی کے خلاف ردعمل کا اظہار کیا۔ اس گروہ نے قوم یا معاشرے کو مدنظر نہیں رکھا، بلکہ انھوں نے اجتماعیت و معاشرے سے زیادہ فردیت و انانیت، عقل سے زیادہ وجدان، ٹھہراؤ سے زیادہ انتہا پسندی اور توازن سے زیادہ جوش و ولولے پر زور دیا۔

علی گڑھ تحریک کے مخالفوں نے جذبات و احساسات کے ذریعے حقیقت کی تلاش کی۔ ان کے نزدیک عقل صرف چیزوں کی شناخت کرنے اور ترتیب سمجھنے میں معاون و مددگار ہوتی ہے، جب کہ چیزوں کی ماہیت تک پہنچنے میں صرف جذبات کے ذریعے ہی رسائی حاصل ہو سکتی ہے۔ لہٰذا اس گروہ کی فکر کی تبدیلی نے علی گڑھ تحریک کے وجود کردہ ادب کی ہیئت کو بھی یکسر تبدیل کر دیا۔ انھوں نے ادب کے اصولوں کے بجائے نئے معیار متعین کیے۔ ترنم کے نئے اسالیب تراشے، موسیقی میں نئی ترتیب تلاش کی، ناول، کہانی، ڈرامے، افسانے، طنزیہ و مزاحیہ مضامین وغیرہ میں نئے نئے طریقے ایجاد کر کے موضوع و مواد کے ڈھانچے کو بھی تبدیل کر دیا۔ اس طرح کی تبدیلی کے نمونے علامہ اقبال اور ابوالکلام آزاد کے

تخلیق کردہ ادب میں جابہ جا موجود ہیں۔ کیوں کہ اقبال نے جگہ جگہ جذبے اور وجدان کی اہمیت پر زور دیا ہے اور عقل کو جہاں تک ہوسکا کم تر درجہ ہی عطا کیا ہے۔ مثلاً:

بے خطر کود پڑا آتشِ نمرود میں عشق
عقل ہے محو تماشاے لبِ بام ابھی

اچھا ہے دل کے پاس رہے پاسبانِ عقل
لیکن کبھی کبھی اسے تنہا بھی چھوڑ دے

یہ کبھی کبھی کی قید اس مصرعے میں بالکل ہی اٹھ جاتی ہے:

''عقل تمام بولہب''، عشق تمام مصطفیؐ

لیکن اقبال کو خالص جذباتی شاعر کہنا درست نہ ہوگا کیوں کہ انھوں نے جذبے کے ساتھ ساتھ فکر کو نظر انداز نہیں کیا۔

علی گڑھ تحریک کے سنجیدہ وسادہ ادب کے خلاف ابوالکلام آزاد کا ادب فردیت وانانیت کا بہترین نمونہ ہے۔ ان کی تحریروں سے صاف ظاہر ہوتا ہے کہ انھوں نے کس طرح علی گڑھ تحریک کے اخلاقی اور نیچرل ادب کے مقصد واسلوب کے خلاف آواز بلند کر کے تخیل و جذبات کی فراوانی سے کام لیا ہے۔ ان کے انداز واسلوب میں انفرادیت کا ایسا انوکھا انداز موجود ہے جو اس دور کے کسی اور نثر نگار کے لہجے میں نہیں ملتا۔ نمونہ تحریر ملاحظہ ہو:

''اپنی سرگزشت اور روئداد لکھوں تو کیا لکھوں ایک نمودِ حباب اور جلوۂ سراب کی تاریخ قلم بند ہو تو کیوں کر؟ دریا میں حباب تیرتے ہیں، ہوا بھی غبار اڑاتے ہیں۔ طوفان نے درخت گرائے ہیں، سیلاب نے عمارتیں بہادی ہیں۔ عنکبوت نے اپنی پوری زندگی تعمیر میں بسر کردی۔ مرغ آشیانہ پرست

نے کونے کونے سے چن کر تنکے جمع کیے۔ خرمن و برق کا معاملہ، آتش وخس کا
افسانہ، ان سب کی سرگزشتیں لکھی جاسکتی ہیں تو لکھ لیجیے۔ میری سوانح عمری
بھی انھیں میں مل جائے گی، نصف افسانۂ امید اور نفس ماتمِ یاس۔''[۱۸]

اس طرح ابوالکلام آزاد کی نثر نے علی گڑھ تحریک کی نثر کے خلاف ایک نئے انداز واسلوب کو ایجاد کر کے ادب کو نیا حوصلہ و جوش عطا کیا۔ ان کی نثر نے خود سے اور کائنات کے حسن سے محبت کرنا سکھایا۔ انگریزی تعلیم اور تہذیب وتمدن کی چمک دمک سے متاثر ہونے والے نوجوان طبقے کو اشیا کی عظمت اور اپنی شخصیت کی متاع کی طرف متوجہ کراتے ہوئے ان کے ذہنوں میں حسن کا ایک نیا احساس بیدار کیا۔ شخصیت وانفرادیت کا ایک نیا تصور آراستہ کیا اور جلد ہی علی گڑھ تحریک کے سائنسی وحکمتی ادب سے نجات دلانے کی کوشش کی۔

غرض یہ کہ علی گڑھ تحریک کے ردّعمل میں جو ادب وجود میں آیا اس میں زندگی کو وفورِ حسن سے زیادہ اہمیت نہیں دی گئی۔ اس ادب میں ہمارے سماج کی تصویریں، چلتے پھرتے انسان اور گریاں وخنداں نظارے نہیں تھے، بلکہ پورا ادب حسن کے تخیلی وتصوراتی خاکوں سے شرابور اور ہر بلا ومصیبت کو طنزیہ و مزاحیہ مضامین کے ذریعے قہقہوں میں اڑانے والا نظر آتا ہے۔

علی گڑھ تحریک کی مخالفت کے نتیجے میں وہ ادیب وشاعر منظر عام پر آئے جو کہ غیر حقیقی تصورات میں پوری طرح اسیر ہو چکے تھے۔ ان کی غیر حقیقی تصورات کی سب سے واضح تصویریں، خلیقی، حجاب اور نیاز فتح پوری کی تحریرات میں نظر آتی ہیں۔

خلیقی اس طرح لکھتے ہیں کہ:

''اے آقا کیا میں مطمئن ہو جاؤں کہ تو کبھی نہ کبھی ضرور آئے گا، اور میری
سب کچھ سن لے گا۔ کیا میں اپنے دن انہی انشاہائے خوشی میں بسر کر کے اپنی

ذات کو بھی تیری تعریف کے مشغلہ لطیف میں کاٹ دوں اور اپنے دھیان کو
تیری ہی آغوش میں تھکا تھکا کر چھوڑ دوں۔''[۱۹]

''میں ایک مدعائے سمیں کے لیے راتیں سیاہ کر دوں گا۔ میں ایک آرزوئے
رواں کے لیے دشت و کوہ ناپ لوں گا، لیکن وہ سیل سیماب میری جانب بہہ
آنے کا تہیا تو کرے۔ وہ موج نور میری حیات افسردہ کے سکوتِ تاریکی کو
جنبش جمیل سے بدلے تو۔''[۲۰]

علی گڑھ تحریک کے افادی و مقصدی ادب میں کبھی بھی عورت کا کھلم کھلا ذکر نہیں کیا گیا لیکن ردِّعمل نے اس بات کو بھی مدّنظر رکھا کہ ادب میں عورت کو بھی ایک خاص جگہ دی جائے۔ اسی نظریے کے تحت مخالف ادب بھی عورت کے جابہ جا نظر آتی ہے۔ مثلاً:

''کوئی عورت اگر نسائیت سے معمور ہے تو پھر وہ عورت کب ہے، وہ تو دیویت
کا مجسمہ ہے۔ اس سے محبت کا مقصد پرستش اور پوجا ہے۔''[۲۱]

لہٰذا اس طرح کی تحریریں علی گڑھ تحریک کے سادہ و سنجیدہ ادب کے خلاف احتجاج نہیں، کیوں کہ ان تحریروں نے ادیب و شاعر کو ملک و قوم کی اصلاح، خارجی زندگی اور غمِ زمانہ سے ہٹا کر پھر سوز و ساز اور حسن و رومان کی طرف متوجہ کرایا۔ ادب میں پھر سے وہی بناوٹی سجی سجائی زبان، مشکل اندازِ بیان، وقت پسندی، حسن و عشق کے بارے میں فلسفیانہ طرزِ خیال اور وہی بات بات پر وجد کرنے کا آغاز ہوا۔ نیاز فتح پوری کے یہاں اس سجے سجائے اندازِ اسلوب کی بے حد تحریرات نظر آتی ہیں۔ مثلاً:

''میں دیکھتا ہوں کہ میں نے آپ کے سلسلۂ خیالات کو اپنی نامناسب
جسارت سے بہت ناگوار طریقے سے منقطع کیا۔''[۲۲]

اس طرح مخالفت نے علی گڑھ تحریک کے مقصدی ادب کو فراموش کر کے پھر سے اس ادب کو اہمیت دی، جس کی سرسید اور ان کے رفیقِ کار نے اصلاح کر کے اس میں اخلاقی مضامین اور نیچرل شاعری کو داخل کر دیا تھا۔

خواجہ الطاف حسین حالی ایک جگہ لکھتے ہیں کہ:

''شعر سے جس طرح نفسیاتی جذبات کو استفالک ہوتی ہے اسی طرح روحانی خوشیاں بھی زندہ ہوتی ہیں، اور انسان کی روحانی اور پاک خوشیوں کو اس کے اخلاق کے ساتھ ایسا صریح تعلق ہے جس کو بیان کرنے کی چنداں ضرورت نہیں۔ شعر براہِ راست علم اخلاق کی طرح تلقین اور تربیت نہیں کرتا، لیکن ازروئے انصاف اس کو علم اخلاق کا نائب مناب اور قائم مقام کہہ سکتے ہیں۔'' [۲۳]

غرض یہ کہ مخالف گروہ نے اس اخلاقی ادب کو صرف لذت ولطف حاصل کرنے کا ذریعہ بنایا۔ اس نے حال کو اہمیت نہ دے کر تخیلی اور غیر حقیقی زندگی کو زیادہ سے زیادہ اہمیت دی۔ حالاں کہ سرسید کے بعض رفقا کی طرف سے ہی مخالفت نے سر اُٹھایا، لیکن ان کا اختلاف صرف مذہبی عقائد اور عقلی تصور سے تھا۔ کیوں کہ سرسید نے کچھ ایسے مذہبی مسائل کی تشریح کی جو اس سے پہلے کسی عالم وفقیہ نے نہیں کی تھی لیکن سرسید نے بھی یہ مذہبی مداخلت شعوری طور پر نہیں کی تھی، بلکہ ۱۸۵۷ء کی ناکامی وناامیدی سے فرار حاصل کرنے کی غرض سے وہ کوئی ایسی راہ وروش اختیار کرنا چاہتے تھے جو مسلمانوں کی تہذیبی وسماجی برائیوں کو دور کر کے انھیں روشن مستقبل میں کامرانی وترقی کی منزل عطا کر سکے۔ اسی لیے انھوں نے مذہب کے ذریعے اصلاح کی راہ اختیار کی کیوں کہ اس زمانے میں مسلم قوم مذہب کے نام پر تقلید کی سخت بیڑیوں میں جکڑی ہوئی تھی۔ سرسید نے ان کی اس بیڑی کو توڑنے کے لیے ہی اپنی اہم تصنیف

تفسیر القرآن کے ذریعے مذہب پر کچھ ایسے سوالات عائد کر دیے جنھوں نے بڑے بڑے علمائے کرام کو تو بدظن و بدگمان کیا ہی ساتھ ہی ساتھ ان کے اہم رفقا بھی کچھ ظاہراً اور کچھ پوشیدہ ان کے مذہبی خیالات کے خلاف آواز بلند کرنے لگے۔ مثلاً شبلی نعمانی، نذیر احمد، مولوی سمیع اللہ، نواب محمد اسمٰعیل، علی بخش شرر اور سرسید کے سب سے بڑے محسن، نواب محسن الملک نے بھی برملا اختلاف کیا۔ انھوں نے حیدرآباد سے کئی ایسے خط لکھے جن میں نہایت صاف گوئی کے ساتھ سرسید کو ان کے مفروضات پر ٹوکا۔ اپنے پہلے خط ۱۹/اگست ۱۸۹۲ء میں لکھتے ہیں کہ:

> ''آج کل میں آپ کی تفسیر دیکھ رہا ہوں..... غالباً آپ اس بات کے سننے سے تو خوش نہ ہوں گے کہ میں اب تک آپ کی رایوں سے اتفاق نہیں کرتا اور ہر بحث میں اسے قرآن کی وہ تفسیر جس کو کوئی قرآن کے مطالب کی تشریح اور تفصیل اور تفسیر سمجھے، نہیں سمجھتا بلکہ اکثر جگہ افسوس ہے کہ آپ نے ان مسائل کو جو آج کل یورپ کے وہ تعلیم یافتہ لوگ جو مذہب کے پورے پابند اور معتقد نہیں ہیں، صحیح اور یقینی اور غیر قابلِ اعتراض سمجھتے ہیں۔ مان لیا اور قرآن کی آیتوں کو جن میں ان کا ذکر ہے ایسا ماول کر دیا کہ وہ تاویل ایسے درجے پر پہنچ گئی ہے کہ اس پر تاویل کا لفظ بھی صادق نہیں ہوسکتا۔ آپ نے مسلمان مفسروں کو تو خوب گالیاں دیں اور برا بھلا کہا اور یہودیوں کا مقلد بتایا مگر آپ نے خود اس زمانے کے لامذہبوں کی باتوں پر ایسا یقین کر لیا کہ ان کو مسائلِ محققہ صحیحہ یقینیہ قرار دے کر تمام آیتوں کو قرآن کے ماول کر دیا اور لطف یہ ہے کہ اسے تاویل بھی قرار نہیں دیتے (تاویل کو تو آپ کفر سمجھتے ہیں) بلکہ صحیح تفسیر اور اصلی تفسیر قرآن کی سمجھتے ہیں۔''[۲۴]

لیکن سرسید کے رفقا نے مذہبی معاملات میں ہی اختلاف کیا تھا۔ نواب محسن الملک لکھتے ہیں کہ:

''میرے نزدیک اس مسئلہ میں سید احمد خاں صاحب نے بڑی غلطی کی ہے، کیوں کہ جو دعویٰ انھوں نے کیا ہے وہ اس روایت سے ثابت نہیں ہوتا اور کتابی کا ذبیحہ بلاتسمیہ کے جائز ہونے کے سوائے اس قول سے اور کچھ نہیں نکلتا اور چوں کہ منخنقہ کی حرمت صراحتاً ایک دوسری آیت محکم سے ثابت ہے اور اس کی تخصیص یا تنسیخ کسی دوسری آیت سے نہیں ہوتی تو تعجب ہے کہ کیوں کر انھوں نے اس روایت سے یہ خیال کیا کہ اہلِ کتاب کا گردن مروڑ کر مار ڈالنا بھی ذبیحہ میں داخل ہے اور جو قول ابن عربی اور معیار کا انھوں نے نقل کیا ہے وہ ایک عالم کی رائے ہے جو قرآن و حدیث کے ظاہری الفاظ سے مخالف ہے۔ اس لیے ہم کو اس پر کچھ اعتبار نہیں۔''

اور مزید لکھتے ہیں کہ:

''سید صاحب اپنی کتاب کے صفحہ ۲۴ میں لکھتے ہیں کہ طعام اہلِ کتاب میں ہم کو تفتیش اس بات کی کرنی کہ کس نے ذبح کیا اور کیوں کر ذبح ہوا ہے۔ کچھ حاجت نہیں، جواب اس کے مولوی امداد العلی صاحب اپنی کتاب کے صفحہ ۲۷ میں لکھتے ہیں کہ جب نصاریٰ ہمارے ملک کے ذبح نہیں کرتے اور کسی جانور کا گوشت ہو اور کسی کا مارا ہوا ہو، کھا لیتے ہیں تو اہل اسلام کو جب ان کے یہاں کا گوشت پکا یا کچا سامنے آوے، تفتیش اس کی بہت ضروری ہے۔ ہمارے نزدیک اس میں بھی رائے سید احمد خاں صاحب کی خطا پر ہے ان کو سوچنا

چاہیے تھا کہ ذبیحہ مشرکین کا قطعاً حرام ہے اور اکثر مشرکین مثل چمار وغیرہ کے باورچی انگریزوں کے ہوتے ہیں اور پرند جانوروں کو وہی باورچی گردن مروڑ کر مار ڈالتے ہیں تو بغیر تفتیش کے ایسے پرندوں، جانوروں کا گوشت کھالینا گویا چماروں کے ہاتھ سے گردن مروڑے ہوئے جانور کا کھا لینا ہے۔''[۲۵]

۱۹ر ستمبر ۱۸۹۲ء میں محسن الملک اپنے دوسرے خط میں سرسید کو لکھتے ہیں کہ:

''غالباً بہت کم آدمی ایسے ہوں گے جو مجھ سے بڑھ کر اس بات کے خواہش مند ہوں کہ اب مذہب کو علم (علوم جدیدہ) کے حملہ سے بچایا جاوے، اور کم ایسے لوگ ہوں گے جو آپ کی اس مردانہ ہمت کی داد دیتے ہوں گے۔ آپ اس لڑائی میں اسلام کا سفید علم لے کر علم کے سامنے آئے اور ایسے غالب اور قوی شریف سے مصالحت کی کوشش کی، مجھ سے بڑھ کر کوئی نہیں جانتا کہ تفسیر کے لکھنے سے آپ کا مقصود کیا ہے۔ کچھ نہیں سوائے اس کے کہ اسلام اپنی سلطنت پر قائم رہے اور علم اس کا دوست سمجھا جاوے اور آپ کی تفسیر میں اس بات کی بہت سی نشانیاں بھی پائی جاتی ہیں اور وہ غور سے دیکھنے والے کو نہایت اعلیٰ مضامین اور حکیمانہ خیالات اور محققانہ باتوں سے بھری ہوئی نظر آتی ہے۔ لاریب فیہ کنز مدفون من جواہر الفواید بحر مشحون۔ بنفالیس الفرابذہ مگر میں یہ نہیں مانتا کہ آپ ہر جگہ اس مقصود کے حاصل کرنے میں کامیاب ہوئے بلکہ برخلاف اس کے میں یہ کہہ سکتا ہوں کہ آپ بعض جگہ تسامح کے درجہ سے گزر کر مغالطہ میں پڑ گئے اور جس حد پر پہنچ کر آپ کو ٹھہرنا چاہیے تھا اس سے

گزر گئے۔ان باتوں کو جو اس زمانے کے علم وسائنس نے پیدا کی ہیں بغیر کسی شک وشبہ کے صحیح وریقینی مان لیا اور جو باتیں قرآن میں بظاہر اس کی مخالفت معلوم ہوئیں۔اس میں ایسی تاویلیں کرنی شروع کیں کہ قرآن کا مقصود ہی فوت ہوگیا۔اور اس پر ستم ظریفی آپ کی یہ ہے کہ آپ تاویل کو کم تر قرار دیتے ہیں اور اپنی تفسیر کو قرآن کے الفاظ اور سیاق اور محاورے اور مقصود محاورے کے مطابق بتاتے ہیں لیکن اس سے بھی آپ کا اصل مقصود کوسوں دور رہا۔اس لیے کہ نیچر اور لا آف نیچر اگر وہی ہے جو اس زمانے کے یوروپین حکیم بتاتے ہیں تو خدا کی خدائی اور رسولوں کی رسالت اور عذاب وثواب کا اقرار وہی آبائی تقلید اور بچپن کی سنی سنائی باتوں کا اثر سمجھا جاوے گا اور قرآن باوجود انکارِ معجزات اور خرقِ عادات اور دعا اور اجابتِ دعا اور فرشتوں اور جنات کے نیچر اور لا آف نیچر کے مخالف ہی رہے گا۔پس میرے نزدیک آپ دو مصیبتوں میں سے ایک میں سے بھی نہ نکل سکے۔کہیں قرآن کے معنی سمجھنے میں غلطی کی اور کہیں نیچر اور لا آف نیچر کے ثابت کرنے میں۔بعض جگہ تو آپ قرآن کا وہ مطلب سمجھے جو نہ خدا سمجھا نہ جبریلؑ، نہ محمدؐ، نہ صحابہ، نہ اہلِ بیت، نہ عامہ مسلمان اور کہیں نیچر کے دائرے سے نکل گئے اور مذہبی آدمیوں کی طرح پرانے خیالات اور پرانی دلیلوں اور پرانی باتوں کے گیت گانے لگے۔چنانچہ آپ کی تفسیر میں دونوں باتوں کا جلوہ نظر آتا ہے۔جہاں آپ نے دعا اور اجابتِ دعا کے مشہور معنوں سے انکار کیا۔معجزات اور خرقِ عادات کو ناممکن سمجھ کر حضرت عیسیٰ کے لیے باپ پیدا ہونے اور ان کی طفلی کے زمانہ کے

واقعات اور احیائے اموات وغیرہ باتوں کو اہلِ کتاب کی کہانیاں بتلایا۔ وہاں آپ نے دکھادیا کہ آپ کی تفسیر قرآن کے الفاظ اور سباق عبارت اور اس کے عام منشا سے کچھ مناسب اور مطابقت نہیں رکھی اور جہاں آپ نے خدا کی خدائی اور پیغمبر کی پیغمبری اور قرآن کے کلام الٰہی ہونے اور ثواب و عذاب وغیرہ کا اقرار کیا۔ گو اس کی حقیقت میں علمائے ظاہری کی رایوں سے اختلاف کیا ہو، وہاں آپ نے ثابت کر دیا کہ نیچر اور لا آف نیچر کا کچھ بھی اثر آپ پر نہیں ہوا۔''[۲۶]

''سرسید کی تصانیف میں سب سے زیادہ اہم تفسیر القرآن ہے اور یہی وہ تصنیف ہے جس نے سرسید کے مذہبی پہلو کو اس قدر تاریک کر دیا ہے کہ بلا استثنا تمام علمائے اسلام ان کی طرف سے بدظن اور بدگمان ہیں۔ اگرچہ سرسید کا ارادہ نیک اور نیت بالکل پاک تھی اور اس کام کو جس دماغ سوزی اور سخت جاکاہی اور کاوش سے انجام دیا ہے، اس کا وہی اندازہ کر سکتا ہے جس نے اس کو پڑھا اور اس پر غور کیا ہے۔ اس سے کسی کو انکار نہیں ہو سکتا کہ سرسید کی تفسیر کے بعض مقامات ایسے اعلیٰ مضامین اور حقائق و معارف سے بھرے ہیں کہ اگر ان کو مذہب کی جان کہا جائے تو کوئی مبالغہ نہیں۔ مگر جہاں کہیں قرآن مجید کے مفہوم کو اپنی رائے میں علوم جدیدہ کے مطابق کرنا چاہا ہے وہاں بڑے دھوکے کھائے ہیں اور اس تلاش میں خدا کی عظمت اور اس کے کلام کی حکمت و مصلحت کو دل سے محو کر دیا ہے۔..... اگر یہ کہا جائے کہ سرسید کا فلسفہ مذہب حقیقتاً علوم جدیدہ کے مسائل اور نظریات پر مبنی ہے۔ تاہم پھر بھی

نظریات اور حکما کی رائیں ایک دوسرے سے مختلف رہی ہیں اور ہوتی رہتی ہیں اور ان تغیرات کا سلسلہ لامتناہی اسی طرح جاری رہنے والا ہے۔ ایسی حالت میں غالباً کوئی مسلمان اس کو پسند نہ کرے گا کہ قرآن مجید جو ایک مستقل فلسفہ ہے ہمارے ہاتھ میں ایک کھلونے کی طرح ہمیشہ نئے نئے نظریات کی خاطر وقتاً فوقتاً نئی نئی شکلوں میں تبدیل ہوتا رہے۔''[۲۷]

شیخ محمد اکرام صاحب لکھتے ہیں کہ:

''بڑی خلیج اس وقت حائل ہوئی جب انھوں نے 'تہذیب الاخلاق' میں اپنی تفسیر القرآن شائع کرنی شروع کی اور جدید 'علم الکلام' کی بنیاد ڈالی.....اس تفسیر میں سرسید نے قرآن کے تمام اندراج کو عقل اور سائنس کی معلومات اور کلام مجید کے درمیان اختلاف معلوم ہوتا ہے، وہاں معتزلہ طریقہ کے مطابق آیات کی نئی تاویل اور تشریح کر کے اس اختلاف کو دور کیا ہے۔ مثلاً معراج اور شق صدر کو رویا کا فعل مانا ہے۔ حساب، کتاب، روز محشر، میزان، جنت، دوزخ، حور جیسے موضوعات کو مجاز و استعارہ و تمثیل قرار دے کر گزر گئے۔ ابلیس کے خارجی وجود سے انکار کر کے اسے انسان کے اندر کی قوت بہیمیہ ثابت کرنا چاہا۔ ملائکہ کے نظر نہ آنے والے وجود کو نہیں مانا، حضرت عیسیٰ کے متعلق کہا کہ قرآن مجید کی کسی آیت سے یہ ثابت نہیں ہوتا کہ وہ بن باپ کے پیدا ہوئے یا زندہ آسمان پر اٹھا لیے گئے۔ جنات کو پہاڑ اور صحرا میں چھپے ہوئے لوگ قرار دیا نہ کہ وہ مخلوق جو مافوق الفطرت کہی جاتی ہے۔''[۲۸]

نذیر احمد بھی ان کے تمام اصلاحی خیالات سے متفق تھے، سوائے مذہبی خیالات کے۔ انھوں نے ہمیشہ علی گڑھ تحریک کی اہمیت کو سراہا، حالاں کہ یہ بھی مغربی تہذیب سے کبھی مرعوب نہیں تھے مگر انگریزی تعلیم پر زور برابر دیتے رہے۔ لکھتے ہیں:

''سید احمد خاں صاحب کی شان ایسی ارفع و اعلیٰ ہے کہ ماوشما کو ان کی نسبت کی رائے کا ظاہر کرنا داخلِ شوخ وحشمی ہے۔ جس طرح کا برتاؤ میں نے سید احمد کے ساتھ رکھا ہے، تم کو اس سے میری رائے کا مستنبط کر لینا کچھ مشکل نہ تھا۔ میں نے مدرسۃ العلوم علی گڑھ میں، بورڈنگ ہاؤس بنوایا۔ دو کوئے (کنویں) ہیں۔ دونوں میں چندہ دیا، اپنے سارے خاندان کی جالیاں احاطۂ مدرسہ میں نصب کرائیں۔ یعنی مدرسۃ العلوم مسلمانوں کے لیے مفید اور اس کی تائید کو داخل مثنویات سمجھا۔ اس وقت تک سید احمد خاں صاحب کے اخبار یا لکچر یا مواعظ یا تحریرات کا ایک پرچہ کبھی مول نہیں لیا یعنی مجھ کو ان کے معتقدات باسرہا تسلیم نہیں.... میرے نزدیک وہ تفسیر ''دیوانِ حافظ'' کی ان شروح سے زیادہ وقعت نہیں رکھتی جن کے مصنّفین نے چوتڑوں سے کان گانٹھ کر سارے دیوان کو کتابِ تصوف بنانا چاہا۔ جو معانی سید احمد خاں صاحب نے منطوق آیاتِ قرآن سے اپنے پندار میں استنباط کیے (اور میرے نزدیک مڑھے اور چپکائے) قرآن کے منزل من اللہ ہونے سے انکار کرنا سہل ہے اور ان معانی کو ماننا مشکل۔''[۲۹]

اس طرح ظاہر ہوتا ہے کہ سرسید کے رفقا کا زیادہ تر اختلاف مذہب کو لے کر ہی تھا، لیکن رفقائے سرسید نے کبھی بھی تخیلی ادب کو پروان چڑھانے کی کوشش نہیں کی اور نہ ہی کبھی تحریک کو کوئی نقصان پہنچایا۔

نذیر احمد لکھتے ہیں کہ:

''میں سرکاری تعلیم کا ایسا طرف دار نہیں ہوں کہ متعصّبانہ اس کی حمایت کروں لیکن انگریزی کی بدترین تعلیم عربی کی بہترین تعلیم سے بہ استثنائے مذہب یقیناً عمدہ اور نافع ہے۔ عربی میں زبان اور منطق کے خیالی ڈھکوسلوں کے سوائے کچھ بھی نہیں۔ یوروپ کو جو اس وقت معراجِ ترقی حاصل ہے۔ جانتے ہو کیوں ہے ان لوگوں میں صرف یہ بہتر ہے کہ واقعات نفس الامری میں تمام یوروپ کی ہمتیں محصور ہیں۔ ہم لوگوں کے خیالی منصوبوں کے پیچھے پڑے رہتے ہیں اور آخر تک سوائے چکنی چپڑی باتیں بنانے اور جھوٹے پہ اصل منصوبے باندھنے کے کچھ نہیں سیکھتے.... انگریزی علوم کیا ہے کہ موجودات عالم میں سے ہر ہر چیز کسی علم کا موضوع، علم آب، علم ہوا، علم مقناطیس، علم حرارت، علم روشنی وغیرہ۔ افسوس کہ ہمارے یہاں ان علوم کا پتہ نہیں، انگریز لوگ..... موجودات عالم کے حالات کی تفتیش و تلاش میں سرگرم ہیں اور اسی سے اس درجہ کو پہنچے ہیں کوئی انگریزی چیز تو دیکھو، کس خوبی اور صفائی اور عمدگی کے ساتھ ہے۔ یہ سب علم واقعات کے جلوے ہیں..... یہ مسلم ہے کہ عقلِ دنیا جیسی انگریزوں میں ہے۔ کسی قوم میں نہیں اور علوم کے اعتبار سے کچھ شک نہیں کہ کوئی مفید علم نہیں جو انھوں نے نہیں لیا۔....''[۳۰]

شبلی نعمانی بھی باوجود اختلاف کے سید احمد کے اصلاحی مقاصد سے متفق معلوم ہوتے ہیں۔

وہ لکھتے ہیں کہ:

''مسلمان اس وقت کش مکش زندگی کے میدان میں ہیں ان کی ہمسایہ قومیں

مغربی تعلیم ہی کی بدولت ان سے اس میدان میں بڑھ رہی ہیں۔ اگر
خدانخواستہ مسلمان مغربی تعلیم کی کوشش میں ذرا بھی پیچھے رہ جائیں گے تو ان
کی ملکی اور قومی زندگی دفعتاً برباد ہو جائے گی۔''[۳۱]

غرض یہ کہ شبلی کی مخالفت دوسرے رفقا سے مختلف تھی، کیوں کہ شبلی عقل و روایت کی اہمیت کے باوجود وجدان و روایت کی اہمیت سے بھی انکار نہ کر سکے، لیکن باوجود اختلاف کے انھوں نے علی گڑھ تحریک کو ہمیشہ رکھنے کی ہی کوشش کی۔ شبلی کے علاوہ بھی رفقائے سرسید کی مخالفت نے علی گڑھ تحریک کو اپنے زورِ قلم کی زد میں نہیں لیا، کیوں کہ یہ لوگ اچھی طرح جانتے تھے کہ اس وقت کے عہد کے مطابق یہ تحریک بالکل درست ہے اور وہ اس نکتہ کو بھی پہنچ چکے تھے کہ ایسی پژمردہ، تباہ حال، بے آسرا اور مغموم قوم کے لیے ایک ایسی مضبوط، فعال اور حقیقت سے آشنا تحریک کی سخت ضرورت ہے۔ البتہ انھوں نے صرف سرسید کی حد سے زیادہ بڑھی ہوئی عقلیت کے خلاف پُرزور احتجاج کیا۔ اس میں آزاد اور شبلی نے بڑھ چڑھ کر حصہ لیا، ان کی اس مخالفت کو تحریک کہنا تو درست نہ ہوگا۔ ہاں اگر اسے رجحان کہا جائے تو بجا ہے، کیوں کہ اس پر بہت سے ادیب و شاعر متفق تھے۔ اس لیے اس کو رومانیت کے نام سے بھی جانا جاتا ہے جس کی ابتدا شرر اور ناصر علی سے ہوئی اور اس کو عروج تک پہنچانے میں بیدرم، مہدی الافادی، نیاز احمد، سجاد انصاری، ابوالکلام آزاد، ریاض خیرآبادی، قاضی عبدالغفار، میاں بشیر احمد، عبدالعزیز ملک پیا، خلیق دہلوی، جوش ملیح آبادی، اختر شیرانی، یوسف حسین، انعام اللہ ناصر، عنایت اللہ دہلوی، سلطان حیدر جوش، حجاب امتیاز علی تاج اور آصف علی وغیرہ نے بھی اس رجحان کو ترقی بخشی، اور اس طرح اس مخالف گروہ کی شمولیت سے اردو ادب وسیع سے وسیع تر ہو گیا۔ یہی نہیں بلکہ صحافت میں بھی ترقی ہوئی کیوں کہ جب علی گڑھ تحریک کے زیر اثر ۱۸۷۰ء میں تہذیب الاخلاق جاری ہوا جس کا مقصد مسلمانوں کو بیدار کرنا اور معاشرتی اصلاح کر کے انھیں فلاح و بہبود کے راستے پر گامزن کرنا تھا، لیکن اس کی مخالفت میں اور بھی بہت سے اخباروں و

رسائل کا سلسلہ جاری ہوا جنھوں نے پُرزور طریقے سے تہذیب الاخلاق کی مخالفت کی۔ مثلاً نورالانوار کان پور ۱۸۷۱ء ہفت روزہ، نورالآفاق کان پور ۳۰/اگست ۱۸۷۳ء پندرہ روزہ، اودھ پنچ کان پور ۱۸۷۷ء، تیرہویں صدی آگرہ ۱۸۷۶ء کوہِ طور لاہور ۱۸۷۲ء، رفیق ہند لاہور ۱۸۸۴ء، نگارِدل گداز، مخزن، صداے عام، نقاد اور ہمایوں وغیرہ۔ ان اخبارات کے علاوہ کچھ رسائل نے بھی تحریک کے مذہبی امور کے خلاف آواز بلند کی۔ اس سلسلے میں مولوی امدادالعلی صاحب نے اوّلین اقدام کیا۔ انھوں نے ''رسالہ طعام اہلِ الکتاب'' کے رد میں امدادالاحتساب ۱۸۶۸ء میں لکھی۔ شہاب ثاقب، موئید اسلام، مزیل الاوہام، برکات الدعا ان تمام اخبارات و رسائل کا مقصد برسوں کی روایات کو قائم رکھنا تھا۔ انھوں نے تحریک کے تہذیبی، تمدنی، ثقافتی اور بڑی حد تک روایتی اقدار کو مٹانے والا قرار دیا۔ انھوں نے علی گڑھ تحریک کی طرح افادیت و اصلاح کا راستہ اختیار نہیں کیا، بلکہ ادب کو آرائش کے طور پر ہی استعمال کیا۔ اسی لیے اپنے انشائیوں، افسانوں، ناولوں، ترجموں اور شاعری میں پہیوں کی ایک نئی راہ اختیار کی۔ بقول منظر اعظمی:

> ''اودھ پنچ اور اس کے لکھنے والوں نے جو تہذیبی اور معاشرتی محاذ پر سرسید کے شدید مخالف تھے سرکار انگریزی پر نکتہ چینی اور کانگریس کی حمایت پُرشور طریقے سے کی۔ مرزا مچھو بیگ ستم ظریف، منشی سجاد حسین، پنڈت رتن ناتھ سرشار، تربھون ناتھ ہجر، اکبرالہ آبادی اور پنڈت برج نرائن چکبست نے قوم پروری اور حب وطن کے جذبے کو جگائے رکھا خصوصاً چکبست نے قوم پرستی، اتحاد و یک جہتی اور حب وطن کے صور کو سب سے ممتاز اور سب سے بلند آہنگ انداز میں پھونکا۔ اکبرالہ آبادی کی نظموں 'برٹش راج' اور 'جلوۂ دربار دہلی'، 'انقلاب زمانہ' اور 'وہ اور ہم' میں طعن وطنز کی جو ایک زیریں لہر ہے وہ قابلِ ستائش

ہے اور چکبست کی 'خاک وہند'، 'فریادِ قوم'، 'پیامِ وفا'، 'وطن کا راگ' اور 'کزن سے جپٹ' ان کی قوم پروری کی روشن مثالیں ہیں.....:

مٹا جو نام تو دولت کی جستجو کیا ہے
نثار ہو نہ وطن پر تو آبرو کیا ہے
لگا دے آگ نہ دل میں تو آرزو کیا ہے
نہ جوش کھائے جو غیرت سے وہ لہو کیا ہے
فدا وطن پہ جو ہو آدمی دلیر ہے وہ
جو یہ نہیں تو فقط ہڈیوں کا ڈھیر ہے وہ'' [۳۲]

علی گڑھ تحریک کی مخالفت کے نتیجے میں جو ادب وجود میں آیا، اس نے ادب میں انفرادیت، انانیت، مزاج کی رنگینی اور نفاست ولطافت کا آغاز کیا۔ اس ادب میں مغرب پرستی کی پُرزور طریقے سے تبلیغ کی گئی۔ اس میں عشق ومحبت کی آزادی، ازدواجی شادی کے لیے خاندان کے بزرگوں کی متابعت سے انکار اور عورتوں کی تعلیم پر سماجی پابندیوں کے خلاف سخت احتجاج کیا گیا۔

لہٰذا علی گڑھ تحریک کی مخالفت نے اردو ادب میں نئے نئے تجربات کے ذریعے شاعروں اور ادیبوں کا ایک ایسا گروہ تیار کر دیا کہ جنھوں نے اپنی تحریرات کے ذریعے اردو ادب کو وسیع سے وسیع تر کر دیا، لیکن یہ ادیب وشاعر ادبی کارناموں سے صرف لذت ولطف حاصل کرتے ہوئے نظر آتے ہیں۔ کیوں کہ انھوں نے اپنے ادب میں وجدان، غیر مرئی کیفیات اور تخیلی دنیا کو ہی زیادہ سے زیادہ اہمیت دی۔ یہ ادب میں کسی نظریے، مقصد یا اصول کے قائل نہیں۔ ان کا سارا اصول صرف ان کے جذباتِ لطیف ہیں، یہ حسن وعشق اور شعر وادب سبھی کو لطافت کے معیار پر پرکھتے ہیں۔

○○○

حواشی:

۱۔ مقدمہ تفسیر سرسید۔خدا بخش اورینٹل پبلک لائبریری، پٹنہ،ص:۳

۲۔ ایضاً۔

۳۔ ایضاً۔ص:۵تا۸

۴۔ سید احمد خاں۔مسافران لندن،ص:۹۰۔۱۸۳

۵۔ ڈاکٹر صدیقہ ارمان۔سرسید تحریک کا ردعمل،۱۹۹۹ء،خواجہ پرنٹرز اینڈ پبلشرز،ص:۹۵۔۹۶

۶۔ سید احمد خاں۔قومی فلاح تعلیم پر منحصر ہے، دسمبر۱۸۹۶ء، میرٹھ،ص:۳۸۸۔ بحوالہ:ڈاکٹر صدیقہ ارمان۔سرسید تحریک کا ردعمل،۱۹۹۹ء،خواجہ پرنٹرز اینڈ پبلشرز

۷۔ نذیر احمد۔مکتوب نمبر۱۰۶،ص:۲۲۴۔ بحوالہ: ڈاکٹر صدیقہ ارمان۔سرسید تحریک کا ردعمل،۱۹۹۹ء،خواجہ پرنٹرز اینڈ پبلشرز،ص:۱۰۶۔۱۰۷

۸۔ شبلی نعمانی احیا علوم عربیہ اور ایک ریڈیکل دکن ریویو،مئی ۱۹۰۴ء، مقالات شبلی،جلد سوم۔مرتبہ:سید سلیمان ندوی، نیشنل بک فاؤنڈیشن ۱۹۸۹ء،ص:۱۷۰۔۱۷۱

۹۔ سید طفیل احمد منگلوری۔مسلمانوں کا روشن مستقبل، دہلی،۱۹۴۵ء،ص:۱۸۱۔بحوالہ:انجمن ترقی اردو (ہند) کی علمی اور ادبی خدمات۔ڈاکٹر شہاب الدین ثاقب،۱۹۹۰ء،علی گڑھ،ص:۲۳

۱۰۔ میری کہانی،حصہ دوم۔پنڈت جواہر لال نہرو،ص:۳۱۵۔بحوالہ:انجمن ترقی اردو (ہند) کی علمی اور ادبی خدمات۔ ڈاکٹر شہاب الدین ثاقب،۱۹۹۰ء،علی گڑھ،ص:۲۴

۱۱۔ آل احمد سرور۔تہذیب اور ادب میں سرسید کا کارنامہ،نگار، پاکستان،سرسید نمبر حصہ دوم،۱۹۷۱ء،ص:۲۲۲۔۲۲۳

۱۲۔ بحوالہ حبیب اللہ خاں۔حیات آفتاب،الہ آباد،۱۹۴۷ء،ص:۱۹۴۔بحوالہ بحوالہ:انجمن ترقی اردو (ہند) کی علمی اور ادبی خدمات۔ڈاکٹر شہاب الدین ثاقب،۱۹۹۰ء،علی گڑھ،ص:۲۳۔۲۴

۱۳۔ ادبی اور قومی تذکرے۔کشن پرشاد کول،انجمن ترقی اردو (ہند) علی گڑھ،۱۹۵۱ء،ص:۲۷۴۔۲۷۵۔ بحوالہ:انجمن ترقی اردو (ہند) کی علمی اور ادبی خدمات۔ڈاکٹر شہاب الدین ثاقب،۱۹۹۰ء،علی گڑھ،ص:۲۵

۱۴۔ حیات جاوید۔مولانا الطاف حسین حالی،ترقی اردو بورڈ،نئی دہلی، ۱۹۷۹ء،ص:۲۴۲۔ بحوالہ: انجمن ترقی اردو (ہند) کی علمی اور ادبی خدمات۔ڈاکٹر شہاب الدین ثاقب،۱۹۹۰ء،علی گڑھ،ص:۲۷

۱۶۔ حیات جاوید۔الطاف حسین حالی،ص:۶۴۱۔۶۴۲

۱۵۔ انجمن ترقی اردو (ہند) کی علمی اور ادبی خدمات۔ڈاکٹر شہاب الدین ثاقب، ۱۹۹۰ء، علی گڑھ، ص:۳۱

۱۷۔ ایضاً۔ص:۶۱۳۔۶۱۴

۱۸۔ اردو ادب میں رومانوی تحریک۔ڈاکٹر محمد حسن، ص:۳۱

۱۹۔ ایضاً۔ص:۳۹

۲۰۔ ایضاً۔ص:۴۰

۲۱۔ ایضاً۔ص:۴۰

۲۲۔ ایضاً۔ص:۴۳

۲۳۔ ایضاً۔ص:۲۱

۲۴۔ مکاتباتِ الخلاق۔ص:۲۳۰۔۲۳۱

۲۵۔ سید مہدی علی۔طعام اہل کتاب، تہذیب الاخلاق، جلد اوّل، علی گڑھ، طبع دوم، ۱۹۱۵ء، ص:۲۰۱۔بحوالہ: ڈاکٹر صدیقہ ارمان، سرسید تحریک کا ردّعمل، ۱۹۹۹ء، ص:۶۴۔۶۵

۲۶۔ سید مہدی (نواب محسن الملک)۔(مکتوب) دوسرا خط بنام سرسید احمد، حیدرآباد دکن، ۱۹ر ستمبر ۱۸۹۲ء، مکاتبات الخلان، ص:۱۵۔۱۷۔بحوالہ: سرسید تحریک کا ردعمل۔ڈاکٹر صدیقہ ارمان، ۱۹۹۹ء

۲۷۔ محمد عثمان مقبول۔مقدمہ، مکاتبات الاخلاق، مدرسۃ العلوم، علی گڑھ، طبع دوم ۱۹۱۵ء، ص:۷۔بحوالہ: سرسید تحریک کا ردعمل، مئی ۱۹۹۹ء

۲۸۔ شیخ محمد اکرام (ڈاکٹر)۔موج کوثر، ص:۱۵۸۔بحوالہ سرسید تحریک کا ردعمل۔ڈاکٹر صدیقہ ارمان، مئی ۱۹۹۹ء، ص:۷۱۔۷۲

۲۹۔ نذیر احمد (مولوی شمس العلما) موعظہ حسنہ (مکتوب نمبر ۹۹، بنام میاں بشر الدین)، مجلس ترقی ادب، لاہور ۱۹۶۳ء مقدمہ افتخار احمد صدیقی، ص:۱۹۹۔۲۰۰، دیباچہ الموعظہ، سید محمد عبدالغفور شہباز

۳۰۔ نذیر احمد، مکتوب ۵۹۔ص:۱۳۲۔۱۳۳

۳۱۔ شبلی 'ہوا کا رُخ دوسری طرف' مشرقی کانفرنس مقالاتِ شبلی، جلد سوم، ص:۱۴۲

۳۲۔ اردو ادب کے ارتقا میں ادبی تحریکوں اور رجحانوں کا حصہ۔ڈاکٹر منظر اعظمی، اتر پردیش اردو اکادمی، لکھنؤ، ۱۹۹۶ء، ص:۲۹۸۔۲۹۹

●●●

حاصلِ کلام

گذشتہ ابواب کی روشنی میں یہ اندازلگانا مشکل نہ ہوگا کہ علی گڑھ تحریک ۱۸۵۷ء کے ہنگامے کے بعد وجود میں آئی تھی۔ اس ''رستاخیز'' میں ہندوستانیوں کو شکست ہوئی اور ملک میں ایسٹ انڈیا کمپنی کی جگہ ملکہ وکٹوریا کی آمرانہ حکومت قائم ہوئی۔ اس ہنگامے سے ویسے تو ہندوستان کا ہر طبقہ متاثر ہوا لیکن مسلمانوں پر سب سے زیادہ مصیبت آئی۔ اوّل تو یہ کہ نام نہاد مغلیہ سلطنت کا خاتمہ ہوگیا اور مسلمانوں کے اقتدار کی یہ آخری یادگار بھی خاک میں مل گئی۔ دوسرے یہ کہ ۱۸۵۷ء کے ہنگامے میں مسلمانوں کے پیش پیش رہنے کی وجہ سے انگریزی حکومت ان سے اس قدر برہم ہوگئی تھی کہ اس قوم کو نیست و نابود کرنے کے لیے کوئی کسر باقی نہ چھوڑی گئی۔ مسلمان مسلسل انگریزوں کے ظلم و جبر کا شکار ہوتے رہے اور حاکمِ وقت کے عتاب کے زیر اثر ان کی بقا کی آئندہ بھی کوئی امید نہ رہی۔ معاشی اور اقتصادی لحاظ سے تو وہ پہلے سے ہی کمزور چلے آرہے تھے۔ اب انھیں تعلیمی، تہذیبی، سیاسی، مذہبی ہر طرح کے زوال کا منھ دیکھنا پڑا۔

سرسید احمد خاں نے ایسے ہی پُرآشوب دور میں قوم کی مسیحائی کا فریضہ انجام دیا اور علی گڑھ تحریک کا آغاز کیا۔ اس تحریک کا مقصد حاکم و محکوم میں مصالحت اور مفاہمت کی راہ ہموار کرنا، مسلمانوں کا کھویا ہوا اعتماد بحال کرنا، انھیں مایوسی اور احساسِ کمتری کے اندھیرے غار سے نکالنا اور زندگی کے تمام میدانوں میں ترقی کی اعلا منزل تک پہنچانا تھا، لیکن ترقی کی اعلا منزل تک پہنچنے کے لیے ضروری تھا کہ مسلمانوں کی معاشرتی اصلاح ہو، جدید مغربی تعلیم کی طرف ان کا رجحان ہو اور ہر طرح کی سیاسی ہنگامہ آرائی

سے کنارہ کشی اختیار کر کے مسلمان جدید تعلیم کو ہی اپنی فلاح اور بقا کا ذریعہ سمجھتے ہوئے سرگرمی کے ساتھ اس پر مائل ہوں۔

علی گڑھ تحریک کے بانی اور پیشوا سر سید احمد خاں نے مذکورہ مقاصد کے حصول کے سلسلے میں درج ذیل اقدامات کیے:

(۱) رسالہ اسباب بغاوت ہند لکھ کر ہندوستانیوں کی وکالت کی اور ۱۸۵۷ء کے ہنگامے کی ذمہ داری ایسٹ انڈیا کمپنی سرکار پر ڈال دی۔

(۲) لائل محمڈنز آف انڈیا کے نام سے ایک رسالہ جاری کر کے مسلمانوں کو انگریزی سرکار کا خیر خواہ ثابت کرنے کی کوشش کی۔

(۳) ولیم ہنٹر کی کتاب ''ہمارے ہندوستانی مسلمان'' پر ریویو کر کے جہاد کی صحیح تصویر پیش کی اور مسلمانوں پر لگائے گئے الزامات کا مدلل جواب دیا۔

(۴) ۱۸۶۴ء میں سائنٹفک سوسائٹی قائم کی تاکہ سائنسی تعلیم کا رجحان مسلمانوں میں عام ہو۔

(۵) ۱۸۷۰ء میں رسالہ تہذیب الاخلاق جاری کر کے مسلمانوں کی معاشرتی اصلاح کا فریضہ انجام دیا۔

(۶) ۱۸۷۵ء میں علی گڑھ میں مدرستہ العلوم قائم کر کے آکسفورڈ اور کیمبرج کی طرز پر مسلمانوں کے لیے جدید تعلیم کا انتظام کیا۔

(۷) ۱۸۸۶ء میں محمڈن اینگلو اورینٹل کانفرنس قائم کر کے تعلیمی تحریک کو ملک گیر سطح پر پھیلانے کی کوشش کی۔

ہندوستانی مسلمانوں کی زندگی پر علی گڑھ تحریک کے ہمہ جہت اور دور رس اثرات مرتب ہوئے۔ سیاست، معیشت، طرز معاشرت اور تعلیمی نظام سے لے کر مذہبی معاملات تک میں نئی تبدیلی آئی۔

عقلیت، مادیت اور اجتماعیت کا تصور عام ہوا۔ نیا علم کلام وجود میں آیا۔ مذہب کی تفسیر و تعبیر بھی عقلی دلائل کی روشنی میں کی گئی اور فقہی مسائل میں اجتہاد فکر سے کام لیا جانے لگا۔ سائنسی شعور کو جلا ہوئی اور جدید تعلیم کا رواج ہوا۔ اپنی ذات کے خول سے لوگ باہر نکلے۔ قومی اور اجتماعی مسائل پر غور و خوض شروع ہوا۔ وقت کے تقاضوں کو سمجھنے اور حالات کے مطابق اپنے طرز عمل میں تبدیلی کی ضرورت محسوس ہوئی۔ یہ تحریک گویا ایک نئے دور کی بشارت تھی جس نے زندگی کا نظریہ بھی تبدیل کر دیا۔

علی گڑھ تحریک نے اپنی فکری اساس عقلیت، مادیت، اجتماعیت اور سیاست کے ذریعہ قوم کے زنگ آلود ذہن کی اصلاح کر کے اسے جدید دور اور جدید تعلیم سے واقف کرایا۔ اس کی جمودی کیفیت کو متحرک کر کے اس میں وسعت پیدا کی۔ اس کے اندرونی انتشار اور کش مکش کو دور کر کے خارجی حالات کی طرف متوجہ کیا۔ اسلام کی حدود میں رہتے ہوئے دنیوی علوم کو حاصل کرنا سکھایا۔ توہم پرستی اور تقلیدی طور طریق کے خلاف آواز بلند کر کے جدید روش پر چلنے کی دعوت دی۔

علی گڑھ تحریک انفرادی یا شخصی تحریک نہیں تھی بلکہ یہ ایسی تحریک تھی کہ جس نے پہلی بار اجتماعیت کو فروغ دیا۔ اس اجتماعیت کو سرسید نے اپنی فکری و عملی سرگرمیوں میں سیکڑوں مقامات پر ظاہر کیا ہے۔ کیوں کہ سرسید نے اس تحریک کے ذریعہ صرف مسلمانوں کی فلاح و بہبود کے بارے میں نہیں خیال کیا بلکہ انھوں نے پورے ہندوستانیوں کی ہی اصلاح چاہی۔ سرسید کی اکثر تحریروں میں قوم کا لفظ جا بجا ملتا ہے جس سے ظاہر ہوتا ہے کہ وہ انفرادی بھلائی نہیں بلکہ اجتماعی بھلائی چاہتے تھے۔

سرسید کے ایک تبصرہ نگار کی رائے ہے کہ ''سرسید احمد خاں ایک ایسے مسلمان قائد تھے جنھوں نے نہ یہ کہ صرف مسلمانوں کے لیے بلکہ ہر مذہب و مسلک اور رنگ و نسل کے فرق و امتیازات کو کالعدم قرار دیتے ہوئے تمام باشندگان ملک کی فلاح و بہتری کو مطمح نظر بتایا۔ اس متاع بیش بہا کے حصول کی راہ میں سماجی و تہذیبی انحطاط کے خاتمہ میں زبردست رول ادا کیا۔ انھوں نے ہندو مسلم اتحاد و اتفاق کو

ملک وقوم کی ترقی کا اثاثہ قرار دیا۔ وہ محض رسمی یا روایتی مفہوم میں سیاسی راہ نما نہ تھے جو اپنی کرسی واقتدار کے خواہاں ہوتے ہیں بلکہ وہ ہندوستان کے عظیم معمار تھے۔"[1]

سرسید کے اس قومی جذبے کی تعریف میں جالندھر کے گورنمنٹ اسکول کے ایک طالب علم بھگت رام نے اپنے تعارفی کلمات اس طرح پیش کیے:

"جناب سید صاحب صرف ایک قوم یا صرف ایک خاص فرقے کے ہی مددگار نہیں ہیں، بلکہ وہ بابو کیشب چندر سین اور شری سوامی دیانند سرسوتی کے پیروؤں کو بھی اسی نظر عنایت سے دیکھتے ہیں۔ کیوں کہ وہ خاص مسلمانوں کے ہی معاون نہیں ہیں بلکہ وہ کل ملک کے مددگار اور کل ہندوستان کے جاں نثار ہیں۔ آج کا دن جالندھر کے واسطے عموماً اور ہم طلبہ کے واسطے خصوصاً ایک مبارک دن ہے جس میں ہم کو ایک حامیِ قوم اور معاون ملک بزرگ کی زیارت نصیب ہوئی۔"[2]

سرسید قومیت کے آفاقی تصور کے بارے میں خود لکھتے ہیں کہ:

"قوم کا لفظ ایسا لفظ ہے جس کے معنوں پر کسی قدر غور کرنا لازم ہے۔ زمانۂ دراز سے جس کی ابتدا تاریخی زمانہ سے بھی بالاتر ہے قوموں کا شمار کسی بزرگ کی نسل میں ہونے یا کسی ملک کا باشندہ ہونے سے ہوتا تھا۔ محمد رسول اللہ صلعم نے (باجی انت دامی یا رسول اللہ) اس تفرقۂ قومی کو جو صرف دنیاوی اعتبار سے تھا مٹا دیا اور ایک روحانی رشتۂ قومی قائم کیا جو ایک جلا المتین لا الہ الا اللہ محمد رسول اللہ سے مضبوط ہے۔ تمام قومی سلسلے، تمام قومی رشتے سب کے سب اس روحانی رشتے کے سامنے نیست و نابود ہو گئے اور ایک نیا روحانی بلکہ خدائی

قومی رشتہ قائم ہوگیا۔ اسلام کسی سے نہیں پوچھتا کہ وہ ترک ہے یا تاجیک، وہ افریقہ کا رہنے والا ہے یا ہندوستان کا، وہ کالے رنگ کا ہے یا گورے رنگ کا، بلکہ جس نے اس عروۃ الوثقیٰ کلمۂ توحید کو مستحکم پکڑا وہ ایک قوم ہوگیا بلکہ ایک روحانی باپ کا بیٹا۔''[۳]

لہٰذا سرسید کے اسی قومی جذبے نے آگے چل کر اتنے وسیع پیمانے پر قومیت کو بڑھاوا دیا کہ یہی جذبہ آخر کار وطن کو آزاد کرانے کا محرک ثابت ہوا۔

غرض کہ سرسید نے قوم کی زبوں حالی، کاہلی اور ان کی جمودی کیفیت کو توڑنے کے لیے نئے نئے منصوبے اور پالیسی سے کام لیا۔ اس مقصد کے لیے انھوں نے تصنیفات، رسائل، اخبارات اور سوسائٹی وغیرہ کی ایجاد و اشاعت کی۔ انھوں نے اپنی گراں مایہ تصنیفات، انتخاب الاخوین، جامِ جم، جلاء القلوب بذکر المحبوب، تحفۂ حسن، تسہیل فی جر الثقیل، آثار الصنادید، فوائد الافکار فی اعمال الفرجاء، قول متین در ابطال حرکت زمین، کلمۃ الحق، راہ سنت ورد بدعت، نمیقۂ درمیان مسئلہ تصور شیخ، سلسلۃ الملوک، آغاز کیمیائے سعادت، تاریخ ضلع بجنور، آئین اکبری، تاریخ سرکشی بجنور، اسباب بغاوت ہند، تبیین الکلام، تاریخ فیروز شاہی، لغت زبان اردو، رسالہ احکام طعام اہلِ کتاب، سفرنامہ، خطباتِ احمدیہ، رسالہ لائل محمڈنز آف انڈیا، رسالہ تحقیق لفظ نصاریٰ، اشتہار التماس بخدمت ساکنانِ ہندوستان در باب ترقی تعلیم اہلِ ہند سائنٹفک سوسائٹی، مدرسہ وکٹوریہ ہائی اسکول، علی گڑھ برٹش انڈین ایسوسی ایشن، انسٹی ٹیوٹ گزٹ، شفاخانہ، ہومیو پیتھک ڈسپنسری اینڈ ہوسپٹل، لفاسیس مدرسۃ المسلمین، کمیٹی خواست گار ترقی تعلیم مسلمانان، اشتہار التماس بخدمت اہلِ اسلام و حکام ہند در باب ترقی تعلیم مسلمان ہندوستان، پمفلٹ، بہ عنوان ہندوستان کے موجودہ نظامِ تعلیم اور مذہبی اوہام وغیرہ پر اعتراض، تہذیب الاخلاق، کمیٹی خواست گار ترقی مسلمانان کمیٹی، خزینۃ البضاعۃ، ڈاکٹر ہنٹر کی کتاب پر ریویو، اے۔ ایم۔ او کالج،

تفسیر القرآن، چیچک کے ٹیکہ کا قانون، قاضیوں کے تقرر کا قانون، قانون وقف خاندان، ایجوکیشن کمیشن میں شہادت، محمڈن ایسوسی ایشن علی گڑھ، پبلک سروس کمیشن کی ممبری، انڈین نیشنل کانگریس کی مخالفت، پیٹریاٹک ایسوسی ایشن اور اردو شعر و ادب کی اصلاح کی۔

علی گڑھ تحریک کے ذریعہ ان اقدامات کی بدولت قوم کی ترقی کے ساتھ ساتھ اردو زبان و ادب کی ترویج و اشاعت کا کام ملک بھر میں پھیل گیا۔ کیوں کہ سرسید نے قوم کی فلاح و بہبود کے لیے جو بھی ادارے یا کانفرنس قائم کیں تو ان کا دائرہ صرف اسی زمانہ تک ہی محدود نہیں تھا بلکہ اس کی ترقی یافتہ شکل کے طور پر ''انجمن ترقی اردو'' وجود میں آئی جس نے اردو شعر و ادب کی گراں مایہ خدمات انجام دیں۔

اسی طرح تہذیب الاخلاق نے اپنے زمانے میں تو قوم کی خدمت انجام دی ہی لیکن بعد میں بھی اس کی موافقت اور مخالفت دونوں میں ہی اخبارات و مضامین کا بازار گرم رہا۔ جیسے پٹیالہ اخبار، پنجابی اخبار لاہور، اخبار انجمن شاہ جہاں پور، اردو گائیڈ کلکتہ، اخبار سوشل راجپوتاہ، مفید عام آگرہ، اخبار انسٹی ٹیوٹ پٹنہ، اخبار الاخیار مظفر پور، الہلال، ہمدرد، مخزن، وطن لاہور، اتحاد پٹنہ، ہمدرد لکھنؤ، آزاد کان پور، سوراجیہ الہ آباد، زمین دار، اودھ اخبار، وکیل امرتسر، اودھ پنچ، نور الانوار کان پور، ہفت روزہ، نور الآفاق کان پور، تیرہویں صدی آگرہ، کوہِ طور لاہور، رفیق ہند لاہور، نگار، دل گداز، صدائے عام، نقاد اور ہمایوں، مولوی امداد العلی کا رسالہ امداد الاحتساب، شہاب ثاقب موئید الاسلام مزیل الاوہام، برکات الدعا وغیرہ یہ سب تحریک کے عمل اور ردِّ عمل کے طور پر وجود میں آئے۔

علی گڑھ تحریک نے اردو شعر و ادب کو کافی متاثر کیا۔ اس نے اپنی کوششوں سے اردو ادب کو اعلیٰ مقام عطا کیا۔ کیوں کہ:

> ''سرسید سے قبل اردو ادب موضوع اور اسلوب دونوں اعتبار سے کم مایہ تھا۔ بزرگانِ دین کے ملفوظات، تذکرے اور رسائل شاہ رفیع الدین اور شاہ

عبدالقادر کے قرآن مجید کے ترجمے چند ادبی تصانیف، فورٹ ولیم کالج کلکتہ میں لکھی گئی داستانیں اور فورٹ ولیم کالج سے باہر کے بعض ادیبوں کی انفرادی کاوشیں، قدیم دلّی کالج کے تراجم اور غالب کے خطوط، یہ تھا اس وقت تک کا قابلِ ذکر سرمایہ جہاں تک طرز نگارش کا سوال ہے تو اگرچہ فورٹ ولیم کالج کی سلیس اور غالب کی شخصی نثر وجود میں آچکی تھی۔ ماسٹر رام چندر بھی آسان زبان میں مضامین لکھنے کی داغ بیل ڈال چکے تھے، لیکن ان سب کا دائرۂ اثر محدود تھا۔ بالعموم پُرتکلف عبارت آرائی ہی محبوب و مقبول تھی۔ فارسی و عربی کے ثقیل الفاظ و تراکیب، مقفیٰ و مسجع جملوں اور دوراز کار تشبیہات و استعارات کا استعمال عام تھا۔ قصداً پیچیدہ انداز بیان اختیار کرنا فیشن میں داخل تھا۔ اس روش کے خلاف باقاعدہ اور منظّم طور پر آواز بلند کرنے اور ایک ایسی سادہ اور عام فہم زبان کو عوام و خواص میں مقبول بنانے کی اشد ضرورت تھی جس میں ہر قسم کے خیالات اور مضامین آسانی سے ادا کیے جاسکیں، یہ کام سرسید نے کیا اور کئی سطحوں پر کیا۔''[۴]

اردو زبان سے سرسید کو والہانہ محبت تھی، ان کی تحریروں اور تقریروں میں بھی اردو سے ان کے قلبی تعلق کا اظہار بخوبی ہوتا ہے، اس لیے انھوں نے اس کی اصلاح و ترقی کی خاص کوششیں کیں۔ انھوں نے ۲۰ ستمبر ۱۸۶۷ء کو بنارس میں فتح نرائن سنگھ بہادر کے مکان پر خطاب کرتے ہوئے کہا تھا کہ:

''میں نے جو ہر مقام پر اپنی زبان کے لفظ کا استعمال کیا ہے تو اپنی زبان سے میری مراد کیا ہے؟ میں اپنی زبان سے وہ مراد لیتا ہوں جو کسی ملک میں اس طرح پر مستعمل ہو کہ ہر شخص اس کو سمجھتا ہو اور وہ اس میں بات چیت کرتا ہو۔

خواہ وہ اس ملک کی اصلی زبان ہو یا نہ ہو اور اسی زبان پر میں ورنیکلر کے لفظ کا
استعمال کرتا ہوں۔''[۵]

سرسید نے ہمیشہ اردو کی حمایت کی ، اس وقت بھی جب انگریزوں کے دورِحکومت میں ہندوؤں کی جانب سے اس کی جگہ ہندی کو عدالتی زبان بنانے کی مانگ کی گئی تو یہ بات سرسید کو بہت ناگوار گزری اور اسی وقت سے وہ اور بھی زیادہ اردو کی حمایت و ترقی میں مصروف ہو گئے۔ انھوں نے اس کے شعری و ادبی سرمائے کا جائزہ لیا۔ کھرے اور کھوٹے کو پرکھا، زبان کی ترقی کی راہ میں حائل رُکاوٹوں کو محسوس کیا، اس کی خامیوں پر روشنی ڈالی اور ان کا حل تلاش کر کے ان کا مداوا چاہا۔ غرض یہ کہ اردو ادب کی تاریخ میں وہ پہلے شخص ہیں جنھوں نے عصری تقاضوں کی روشنی میں افادی نقطۂ نظر سے ماضی و حال کے شعری سرمائے پر نظر ڈالی اور اس کی اصلاح کی طرف قدم بڑھائے۔

سرسید کو آرائشی و بناوٹی انداز بیان پسند نہیں تھا، وہ نثر کو خالص نثر کی شکل میں دیکھنا چاہتے تھے یعنی وہ نثر کو شعر بنانے کے خلاف تھے۔ لہٰذا اردو کو اردو ادب بنانے میں سرسید نے خود بھی کوشش کی اور اپنے رفقا کی بھی ایک ایسی جماعت تیار کر دی جس نے اردو شعر و ادب کو موضوع اور اسلوب ہر لحاظ سے وسعت دی۔ ان رفقا میں، یعنی خواجہ الطاف حسین حالیؔ، علامہ شبلی نعمانی، مولانا نذیر احمد، مولوی چراغ علی، مولوی ذکاءاللہ، نواب محسن الملک، نواب وقار الملک کے نام آتے ہیں، لیکن اس کا اثر بعد تک کے ادیبوں اور شاعروں پر باقی رہا۔ عبدالحلیم شرر، نواب صدر یار جنگ، ڈاکٹر سر ضیاءالدین، صاحب زادہ آفتاب احمد خاں، مولوی عبدالحق، مولانا طفیل احمد، مولانا ظفر علی خاں، سجاد حیدر یلدرم، مولوی عزیز مرزا، مولوی عنایت اللہ، مولانا حسرت موہانی، رشید احمد صدیقی، عبدالماجد دریابادی، غلام السیدین، ڈاکٹر عابد حسین، سید ہاشمی فرید آبادی، ڈاکٹر ذاکر حسین، پروفیسر محمد مجیب، قاضی تلمذ حسین اور پروفیسر الیاس برنی وغیرہ کی تحریریں سرسید تحریک کے ادبی نظریات سے متاثر نظر آتی ہیں۔

سرسید یا علی گڑھ تحریک سے متاثر شاعروں اور ادیبوں نے اردو ادب میں سرسید کے مقصدی شعر و ادب کی روایت کو فروغ دیا اور شعر و ادب کو حیات و کائنات کے بھرپور مسائل کی ترجمانی کے قابل بنا دیا۔ انھوں نے بھی سرسید کی طرح اپنی تحریروں میں اجتماعی طور پر محسوس کیے ہوئے جذبات اور سوچے سمجھے افکار و خیالات کو ہی اہمیت دی۔ مقفیٰ و مسجع انداز و اسلوب سے جہاں تک ہو سکا گریز کر کے ادب کو عین زندگی بنا کر پیش کیا اور جلد ہی سرسید اور ان کے رفقا کی کوششوں نے پہلی بار نثر اور نظم دونوں کی شمالی ہند میں ایک ساتھ ترقی کرا دی۔

چنانچہ علی گڑھ تحریک نے قوم کی روزمرہ زندگی سے لے کر ادبی زندگی تک کو متاثر کیا۔ علی گڑھ تحریک کے ذریعہ ہی ادب میں مضامین، ناول، افسانے، ڈرامے اور شاعری کی نئی نئی اصناف کا وجود ہوا جس میں سادہ و سلیس انداز و اسلوب ہی اختیار کیا گیا تھا۔ اس لیے آگے چل کر اسی انداز و اسلوب کی مخالفت کی گئی۔

عام طور پر دیکھا گیا ہے کہ پھل دار درخت پر ہی زیادہ پتھر برسائے جاتے ہیں۔ بالکل یہی حال علی گڑھ تحریک کا ہوا، کہ ہر طرف سے اور اس کے ہر عمل پر مخالفت کے پتھر برسائے گئے۔ جب علی گڑھ تحریک اپنی پوری تابناکی کے ساتھ اپنا ایک مقام حاصل کر چکی تو پھر مخالف گروہ نے اس کو ہر طرح سے نیچا دکھانے کی کوشش کی۔ کسی نے مذہب کو لے کر مخالفت کی، کسی نے جدید تعلیم، انگریزوں سے ربط و ضبط کی بنا پر سرسید کی کوششوں کو بے معنی اور فضول ثابت کرنے کی کوشش کی لیکن زیادہ تر مخالفت اس تحریک کے سنجیدہ اور سلیس انداز بیان کو لے کر ہی ہوئی۔

علی گڑھ تحریک ایک ایسی تحریک ہے کہ جس کی موافقت اور مخالفت دونوں نے ہی اردو ادب کو آسمان تک پہنچا دیا، کیوں کہ مخالفت نے اس کی ہیئت کو بھی یکسر تبدیل کر دیا تھا۔ مخالفت نے ادب کے اصولوں کے بجائے نئے نئے معیار متن کیے۔ ترنم کے نئے اسالیب تراشے، ناول، کہانی، ڈرامے،

افسانے اور طنزیہ و مزاحیہ مضامین وغیرہ میں نئے نئے طریقے ایجاد کر کے موضوع اور مواد کے ڈھانچے کو بھی تبدیل کر دیا اور اس طرح علی گڑھ کے افادی و مقصدی ادب کی جگہ حسن پرست، انفرادی و جذباتی، خوش ذوقی و رنگینی اور غیر حقیقی تصوراتی ادب نے لے لی۔ لہٰذا علی گڑھ تحریک کی مخالفت نے اردو ادب میں ایسے ایسے ادیب و انشا پرداز اور شاعر پیدا کیے جنھوں نے اردو ادب میں کچھ اور نئے نئے شگوفے کھلائے۔

علی گڑھ تحریک کی مخالفت کرنے والوں کو دو جماعتوں میں تقسیم کیا جا سکتا ہے۔ اس میں پہلی جماعت ان افراد کی ہے جو سرسید کے مذہبی خیالات سے اختلاف کرتے ہوئے ان کی مخالفت پر آمادہ تھے اور دوسری جماعت ان کے ادبی نظریات اور ادب میں افادیت پسندی کی شدت سے نالاں تھی۔ ادبی مخالفت جن ادیبوں کی جانب سے ہوئی ان میں سجاد حیدر یلدرم، مہدی الافادی، عبدالرحمٰن بجنوری، سجاد القادری، اکبر الٰہ آبادی، حسرت موہانی، علامہ اقبال، ابوالکلام آزاد، قاضی عبدالغفار، خلیق دہلوی، جوش ملیح آبادی، اختر شیرانی، یوسف حسین، انعام اللہ، نیاز احمد، ریاض خیر آبادی، میاں بشیر احمد، عبدالعزیز فلک پیما، ناصر علی، عنایت اللہ دہلوی، سلطان حیدر جوش، حجاب امتیاز علی تاج اور آصف علی وغیرہ کے نام شامل ہیں۔ مذہبی گروہ سرسید کے اہم رفقا کا تھا لیکن انھوں نے صرف سرسید کی حد سے بڑھی ہوئی عقلیت سے ہی اختلاف کیا تھا۔ سرسید کے یہ رفقا درج ذیل ہیں:

شبلی نعمانی، نذیر احمد، مولوی سمیع اللہ، نواب محمد اسماعیل، علی بخش شرر اور نواب محسن الملک وغیرہ۔

لہٰذا ان ادیبوں اور شاعروں نے علی گڑھ تحریک کے ردِّ عمل میں اپنی تصانیف سے اردو ادب کو وسیع سے وسیع تر کر دیا۔ چنانچہ مخالفت کے نتیجے میں جو ادب وجود میں آیا اس میں افادیت اور مقصدیت سے زیادہ ادب کے جمالیاتی پہلوؤں پر توجہ دی گئی۔ اسلوب کی رنگینی، نفاست و لطافت، بیان کی شگفتگی اور تفریحی موضوعات کی شمولیت پر زور دیا گیا لیکن یہ بھی ایک لحاظ سے ادب کی توسیع تھی جو علی گڑھ تحریک

کے ردّعمل کے نتیجے میں سامنے آئی۔ اردو کی دیگر ادبی تحریکات پر بھی علی گڑھ تحریک کا اثر کسی نہ کسی لحاظ سے ضرور پڑا۔ لہٰذا یہ کہا جا سکتا ہے کہ ۱۸۵۷ء کے بعد اردو شعر و ادب کا سارا سرمایہ کسی نہ کسی طور سے علی گڑھ تحریک کا ہی مرہونِ منت ہے۔

☆☆☆

حواشی:

1. G.F.I. Graham, "The life and Work of Sir Syed Ahmad Khan" P.201, Ed. Ist 1985, London. بحوالہ: سرسید کا اصلاحی مشن۔ توقیر عالم فلاحی، ۱۹۹۸ء، دہلی، ص: ۱۶۸۔۱۶۹

۲۔ محمد اسماعیل پانی پتی (مرتب)۔ مقالات سرسید، ص: ۶، طبع اوّل، لاہور۔ بحوالہ: سرسید کا اصلاحی مشن۔ توقیر عالم فلاحی، ۱۹۹۸ء، دہلی، ص: ۱۶۹

3. Bashir Ahmad Dar, "Religious Thoghts of Syed Ahmad Khan", p.81, Ed. Ist 1957. بحوالہ: سرسید کا اصلاحی مشن۔ توقیر عالم فلاحی، ۱۹۹۸ء، دہلی، ص: ۱۰۷

۴۔ سرسید اور اردو زبان و ادب۔ قمر الہدیٰ فریدی، ص: ۱۴

۵۔ سرسید تقریر بنارس۔ مشمولہ مکمل مجموعہ لکچرز و اسپیچیز، مرتبہ: محمد امام الدین گجراتی، ص: ۴۵، ناشر ملک فضل الدین، لاہور، ۱۹۰۰ء۔ بحوالہ: سرسید اور اردو زبان و ادب۔ قمر الہدیٰ فریدی، ص: ۱۱

●●●

کتابیات

آثارالصنادید	سیداحمد خاں	نامی پریس، کان پور	۱۹۰۴ء
آئین اکبری	تصحیح سیداحمد خاں		۱۸۵۶ء
احکام طعام اہل کتاب	سیداحمد خاں	علی گڑھ	
ادھوری جدیدیت	سلیم احمد	ایجوکیشنل پریس، کراچی	۱۹۷۷ء
اردو ادب کی تحریکیں	انور سدید	انجمن ترقی اردو پاکستان، کراچی	۲۰۰۳ء
اردو ادب کے ارتقا میں ادبی تحریکوں اور رجحانوں کا حصہ	منظر اعظمی	اتر پردیش اردو اکادمی، لکھنؤ	
اردو شاعری کا سیاسی اور تاریخی پس منظر	ابوالخیر کشفی	حسن آفسیٹ پریس، کراچی	۱۹۵۷ء
اردو کی ترقی میں سرسید اور ان کے رفقا کا حصہ	ڈاکٹر کوثر نیازی	کراچی یونیورسٹی	۱۹۸۴ء
اردو میں رومانوی تحریک	محمد حسن		
اردو نثر میں ادب لطیف	ڈاکٹر عبدالودود خاں		
ارمغان آزاد	مرتبہ: ابوسلمان شاہجہاں پوری	انجمن پریس، کراچی	۱۹۷۸ء
اسباب بغاوت ہند	سیداحمد خاں	مرادآباد	۱۸۵۸ء
اسباب بغاوت ہند	سیداحمد خاں/مرتبہ: فوق کریمی	انجمن ترقی اردو ہند	۱۹۷۱ء
الخطبات الاحمدیہ	سیداحمد خاں	مطبع فیض عام، علی گڑھ	۱۸۷۰ء

الدعاوالاستجاب	سرسید احمد خاں	فضل الدین تاجر کتب، لاہور	۱۸۹۹ء
امدادالاحتساب	مولوی امدادالعلی	مطبع بہاری لعل، بلند شہر	
امدادالآفاق	مولوی امدادالعلی	نظامی پریس، کان پور	۱۲۹۰ھ
انتخاب الاخوین			
انتخاب مضامین علی گڑھ انسٹی ٹیوٹ گزٹ	مرتبہ: اصغر عباس	یوپی اردو اکادمی، لکھنؤ	۱۹۸۲ء
انجمن ترقی اردو (ہند) کی علمی اورادبی خدمات	ڈاکٹر شہاب الدین ثاقب	لیتھو کلر پرنٹرس، علی گڑھ	۱۹۹۰ء
برعظیم پاک وہند کی ملت اسلامیہ	اشتیاق حسین قریشی	ٹائمس پریس، کراچی	۱۹۶۷ء
برکات الدعا	غلام احمد قادیانی	ریاض ہند پریس، قادیان	
بیان القرآن	مولانا اشرف علی تھانوی		
تاریخ سرکشی بجنور		آگرہ	۱۸۵۸ء
تاریخ ضلع بجنور	سید احمد خاں		
تبیین الکلام فی التفسیر التورۃ والانجیل	سید احمد خاں	پرائیویٹ پریس، علی گڑھ	۱۹۹۵ء
تبیین الکلام فی تفسیر التوراۃ والانجیل علی ملت الاسلام			
تحریر فی اصول التفسیر	سید احمد خاں	خدابخش لائبریری، پٹنہ	۱۹۹۵ء
تحریر فی اصول التفسیر	سید احمد خاں	مطبع مفید عام، آگرہ	۱۸۹۲ء
تحریک آزادی	صلاح الدین ناسک	علمی پرنٹنگ پریس، لاہور	۱۹۷۵ء
تحریک ریشمی رومال	مولانا حسین احمد مدنی		
تحریک علی گڑھ اور حیدرآباد	محمد حسام الدین خاں غوری	شیخ علی اینڈ سنز، کراچی	۱۹۷۹ء
تحفہ حسن			۱۸۴۴ء
تذکرہ وقار	محمد امین زبیری	مطبوعہ عزیزی پریس، آگرہ	۱۹۳۸ء
تسہیل فی جرالثقیل		آگرہ	۱۸۴۴ء
تصفیۃ العقائد	مولانا قاسم نانوتوی	پریس دہلی	

تنقیح البیان	سید نصرت علی	المطابع، دہلی	۱۸۹۷ء
تہذیب الاخلاق کا تحقیقی وتنقیدی مطالعہ	نفیس بانو	ایجوکیشنل بک ہاؤس، علی گڑھ	۱۹۹۳ء
تہذیب الاخلاق	سید احمد خاں/مرتبہ: فضل الدین	نول کشور پریس، لاہور	ب۔ت
جامِ جم	سید احمد خاں		۱۸۴۰ء
جلاء القلوب بذکر المحبوب			۱۸۴۲ء
حالات سرسید	پیارے لال شاکر	کاشانۂ ادب، لکھنؤ	۱۹۳۸ء
حالی فن اور شخصیت		ہریانہ ساہتیہ اکادمی	۱۸۸۶ء
حالی کا ذہنی ارتقا	غلام مصطفیٰ خاں ڈاکٹر	مکتبہ کارواں، لاہور	۱۹۶۶ء
حالی کا سیاسی شعور	معین احسن جذبی	اشرف پریس، کراچی	۱۹۶۳ء
حجۃ اللہ البالغہ	مترجمہ: مولانا عبدالرحیم	اتحاد پریس قومی کتب خانہ، لاہور	۱۹۵۳ء
حیات جاوید پر ایک نظر	محمد عبداللہ سید		۱۹۶۶ء
حیات جاوید	الطاف حسین حالی	انجمن ترقی اردو، دہلی	۱۹۳۹ء
حیات سرسید	نورالرحمٰن	انجمن ترقی اردو، علی گڑھ	
حیات سعدی	الطاف حسین حالی	مجلس ترقی ادب، لاہور	۱۹۶۰ء
حیات مابعد	سید ضامن حسین نقوی	اکیڈمی آف ایجوکیشنل ریسرچ آل پاکستان ایجوکیشنل کانفرنس، کراچی	۱۹۵۸ء
خطوطِ سرسید	مرتبہ: راس مسعود	نظامی پریس، بدایوں	۱۹۲۴ء
دین فطرت	محمد مظہر الدین صدیقی محمد		
راہِ سنت ورد بدعت	سید احمد خاں		۱۸۵۰ء
ردنیچریہ	ناصر الدین محمد	مطبع تائید الاسلام، دکن	۱۸۸۱ء
رسالہ حامی اسلام	محمد عبدالغفار	مطبع انوار محمدی، لکھنؤ	۱۳۰۷ھ
رسالہ خیر خواہ مسلمانان	سید احمد خان	خدا بخش لائبریری، پٹنہ	۱۹۹۸ء

سائنس اور اسلام — قاری محمد طیب مولانا

سرسید احمد خاں اور ان کے نامور رفقا
کی نثر کا فکری و فنی جائزہ — سید عبداللہ — چمن بک ڈپو، دہلی — ب۔ت

سرسید احمد خاں — خلیق احمد نظامی/مترجمہ: اصغر عباس — پبلی کیشنز ڈویژن، دہلی — ۱۹۷۱ء

سرسید احمد خاں — راجہ طارق محمود — اسلم پریس، لاہور — ۱۹۸۸ء

سرسید احمد خاں — زاہد چودھری — ادارہ مطالعۂ تاریخ، لاہور — ۱۹۹۹ء

سرسید اور اردو زبان و ادب — قمر الہدیٰ فریدی — لیتھو آفسیٹ پرنٹرز، علی گڑھ — ۱۹۸۹ء

سرسید اور اصلاح معاشرہ — شاہد حسین رزاقی — دین محمدی پریس، لاہور — ۱۹۶۳ء

سرسید اور حالی کا نظریۂ فطرت — ڈاکٹر ظفر حسن — مکتبہ جدید پریس، لاہور — ۲۰۰۳ء

سرسید اور سائنٹفک سوسائٹی ایک بازیافت — افتخار عالم خاں — مکتبہ جامعہ، نئی دہلی — ۲۰۰۰ء

سرسید اور ہندوستانی مسلمان — نور الحسن نقوی — ایجوکیشنل بک ہاؤس، علی گڑھ — ۱۹۷۹ء

سرسید تحریک کا ردّ عمل — صدیقہ ارمان — سرسید یونیورسٹی پریس، کراچی — ۱۹۹۹ء

سرسید سے اقبال تک — قاضی جاوید — نگارشات، لاہور — ۱۹۸۶ء

سرسید سے اقبال تک — قاضی جاوید — لاہور نگارشات — ۱۹۸۶ء

سرسید کا اسلام — از مولوی مشتاق حسین — نامی پریس، دہلی

سرسید کا اسلام — مولوی مشتاق حسین — نامی پریس، دہلی

سرسید کا اصلاحی مشن — ڈاکٹر توقیر عالم فلاحی — اردو پرنٹنگ پریس، دہلی — ۱۹۹۸ء

سرسید کا آئینہ خانۂ افکار — سید ابوالخیر کشفی — فضلی سنز، کراچی — ۱۹۸۹ء

سرسید کا دینی شعور — توقیر عالم فلاحی — علی گڑھ، مصنف — ۲۰۰۵ء

سرسید کا علمی کارنامہ — قاضی احمد میاں اختر جوناگڑھی — ایجوکیشنل پریس، کراچی — ۱۹۶۴ء

سرسید کا مغربی تعلیم کا تصور اور اس کا
نفاذ علی گڑھ میں — رشید احمد صدیقی — مکتبہ دانیال، کراچی — ۱۹۹۳ء

نشاۃ ثانیہ	قدسیہ خاتون	کتابستان، الٰہ آباد	۱۹۸۱ء
سرسید کی اسلامی بصیرت	جمال خواجہ	نیو علی گڑھ مومنٹ، علی گڑھ	۱۹۸۷ء
سرسید کی تعلیمی تحریک	اختر الواسع	مکتبہ جامعہ، نئی دہلی	۱۹۸۵ء
سرسید کی دینی برکتیں	عبدالحلیم شرر/ حافظ حسین رضوی	سرسید یونیورسٹی، کراچی	۱۹۹۹ء
سرسید کی صحافت	اصغر عباس	انجمن ترقی اردو، دہلی	۱۹۷۵ء
سرسید کے خطوط	مرتبہ: سلیم الدین	حالی پریس، پانی پت	۱۸۶۹ء
سرسید احمد خاں حالات وافکار	مولوی عبدالحق	اردو مرکز، دہلی	۱۹۶۰ء
سرسید احمد خاں: فکر اسلامی کی تعبیر نو	ڈاکٹر سی۔ ڈبلیو، ٹرول/ مترجمہ: قاضی افضال حسین	اے۔این۔اے پرنٹرز، لاہور	۱۹۹۸ء
سرسید تاریخی وسیاسی آئینے میں	شان محمد	انوار بک ڈپو، علی گڑھ	۱۹۶۷ء
سرسید، معاشی افکار اور ترقیاتی منصوبے	شاہ محمد وسیم	علی گڑھ	۲۰۰۱ء
سرکشی ضلع بجنور	سرسید احمد خاں	ندوۃ المصنّفین، دہلی	۱۹۹۴ء
سلسلۃ الملوک	سید احمد خاں	دہلی	۱۸۵۲ء
سلسلۃ الملوک	سید احمد خاں	مطبع خادم التعلیم پنجاب، لاہور	۱۸۹۹ء
سید احمد خاں اور ان کی معنویت موجودہ دور میں	عبداللطیف اعظمی	علمی ادارہ، نئی دہلی	۱۹۷۲ء
سید احمد خاں کا سفرنامہ پنجاب	اسماعیل پانی پتی	ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس، دہلی	۱۹۷۹ء
سیرت فریدیہ	سید احمد خاں/ محمود برکاتی	سندھ ساگر اکاڈمی، لاہور	۱۹۶۴ء
سیرت فریدیہ	سید احمد خاں	آگرہ مفید عام پریس	۱۸۹۲ء
سیرۃ فریدیہ	سید احمد خاں	مطبع مفید عام، آگرہ	۱۸۹۶ء
شبلی ادیبوں کی نظر میں	واصل عثمانی	باب الاسلام پریس، کراچی	۱۹۶۸ء
شبلی کا ذہنی ارتقا	ڈاکٹر سید سخی حسن ہاشمی	المخزن پرنٹرز، کراچی	

شہاب ثاقب	علی بخش شرر	نول کشور پریس، لکھنؤ	۱۲۸۹ھ
علی گڑھ تحریک سماجی اور سیاسی مطالعہ	مظہر حسین	ثمر آفسیٹ پرنٹرز، نئی دہلی	۲۰۰۲ء
علی گڑھ کی علمی خدمات	پروفیسر خلیق احمد نظامی	ثمر آفسیٹ پرنٹرز، نئی دہلی	۱۹۹۴ء
فوائد الافکار فی اعمال الفرجاء (ترجمہ)		دہلی	۱۸۴۶ء
قصہ اصحاب الکہف والرقیم	سرسید احمد خاں	مطبع ریاض ہند، علی گڑھ	۱۹۱۰ء
قواعد صرف ونحو زبان اردو سرسید احمد خاں	مرتبہ: ابوسلمان شاہجہاں پوری	ادارۂ تصنیف وتحقیق، کراچی	۱۹۹۰ء
قول متین در ابطال حرکت زمین	سید احمد خاں		۱۸۴۹ء
کلمۃ الحق در بیان حقیقت پیری ومریدی			۱۸۴۹ء
کلیات نثر حالی مرتبہ شیخ	محمد اسماعیل پانی پتی	مجلس ترقی ادب، لاہور	۱۹۶۸ء

جلد اوّل (مذہبی، اصلاحی، تاریخی، سوانحی اور متفرق مضامین)

جلد دوم (تقریریں اور تقریظیں)

کیمیائے سعادت (ترجمہ)

گزارش در باب تعلیم اہل ہند

محمڈن اینگلو اورینٹل ایجوکیشنل کانفرنس۔

مجموعہ رزولیوشن ہائے وہ سال من

ابتدائے ۱۸۸۶ء لغایت ۱۸۹۵ء	سید احمد خاں	مطبع مفید عام، آگرہ	۱۸۹۶ء
مسدس حالی	الطاف حسین حالی	باب الاسلام پریس، کراچی	۱۹۵۷ء
مسلمانوں کا روشن مستقبل	طفیل احمد منگلوری		
مضامین تہذیب الاخلاق	سید احمد خان	فضل الدین تاجر کتب، لاہور	ب۔ت
مقالات حالی	الطاف حسین حالی	انجمن ترقی اردو، کراچی	۱۹۵۷ء
مقالات سرسید	مرتبہ: شیخ محمد اسماعیل پانی پتی	مجلس ترقی ادب، لاہور	۱۹۶۲ء

حصہ اوّل (مذہبی اور اسلامی مضامین)/ حصہ دوم (تفسیری مضامین)/ حصہ سوم (فلسفیانہ مضامین)/ حصہ چہارم (علمی وتحقیقی مضامین)/ حصہ پنجم (اخلاقی واصلاحی مضامین)/ حصہ ششم (تاریخی مضامین) حصہ ہفتم

(سوانح وسیر، ادبی وتنقیدی مضامین)/ حصہ ہشتم (تعلیمی، تربیتی اور معاشرتی مضامین)/ حصہ نہم (ملکی وسیاسی مضامین)/ حصہ دہم (اخبارات پر تنقیدی مضامین متعلق تہذیب الاخلاق، مدرسۃ العلوم مسلمان)/ حصہ یازدہم (آں حضرت ﷺ کی سیرت طیبہ کے متعلق اور تحقیقی اور تنقیدی مقالات: الخطبات احمدیہ)/ حصہ دوازدہم (تقریری مقالات)/ حصہ سیزدہم (سرسید کے ذاتی عقائد، متعلق بہ استفسارات، ترکوں کے متعلق اور مضامین متعلق واقعات حاضرہ)/ حصہ چہاردہم (مشتمل بہ قرآنی قصص)/ حصہ پانزدہم (متفرق مضامین)/ حصہ شانزدہم (نایاب رسال ومضامین)

مقدمہ شعروشاعری	الطاف حسین حالی	ایجوکیشنل بک ہاؤس، علی گڑھ	۱۹۷۳ء
مکاتیب سرسید احمد خاں	مرتبہ مشتاق حسین	علی گڑھ	۱۹۶۰ء
مکتوبات سرسید	مرتبہ: شیخ محمد اسماعیل پانی پتی	مجلس ترقی ادب، لاہور	۱۹۵۹ء
مکمل مجموعہ لکچرز واسپیچیز از ابتدائے ۱۸۶۳ء لغایت ۱۹۸۹ء	سید احمد خاں/ محمد امام الدین	مصطفائی پریس، لاہور	۱۹۰۰ء
منتخب مضامین سرسید	عتیق احمد صدیقی	سرسید اکادمی، علی گڑھ	۱۹۸۸ء
مولانا آزاد سرسید اور علی گڑھ	محمد ضیاء الدین انصاری	انجمن ترقی اردو ہند، دہلی	۱۹۹۲ء
نمیقہ فی بیان مسئلہ تصور الشیخ (فارسی)			۱۸۵۲ء
یادگار شبلی	شیخ محمد اکرام	دین محمدی پریس، لاہور	۱۹۷۱ء

○○○

رسائل وجرائد:

اردو نامہ	کراچی	اکتوبر و دسمبر ۱۹۶۲ء
ثقافت	لاہور	اگست ۱۹۵۹ء
علی گڑھ میگزین	علی گڑھ نمبر	۱۹۵۳
نگار	کراچی	سرسید نمبر، جنوری فروری ۱۹۷۱ء

●●●